ابوالکلام آزاد

میری لائبریری

غبارِ خاطر

پہلی مرتبہ میری لائبریری ہی میں
تین روپے
یہاں قیمت چھ روپے

چونکہ مولانا کو قلعۂ احمد نگر کی قید کے زمانے میں دوستود
سے خط و کتابت کی اجازت نہ تھی اور مولانا کی کوئی تحریر باہ
نہ جا سکتی تھی اس لئے یہ مکاتیب وقتاً فوقتاً لکھے گئے اور ایک
فائیل میں جمع ہوتے رہے۔ مولانا رہا ہوئے تو مکتوب الیہ
تک پہنچنے کی راہ باز ہوئی ۔ ان خطوط میں مولانا نے نثر میں
شاعری کی ہے اور جس مطلب کو ادا کیا ہے اس طرح کیا ہے
کہ جدت فکر نقش آرائی کر رہی ہے اور وسعت تخیل رنگ و روغن
بھر رہی ہے۔ اجتہاد فکر اور تجدید اسلوب ، میں مولانا کی عام او
ہمہ گیر خصوصیت تھی کہ قلم اور زبان کے ہر گوشے م
طرز عام سے اپنی روش الگ رکھتے تھے ، الفاظ و تراکیب سے
لے کر مطالب اور ادائے مطالب کے طرز تک ہر بات میں تقلید
عام سے گریزاں اور اپنے مجتہدانہ انداز میں بے میل اور بے لچک
ظر آتے تھے ۔ انھوں نے جب سے قلم سنبھالا ہمیشہ پیش ر
ور صاحب اسلوب رہے ۔ کبھی یہ گوارا نہ کیا کہ کسی
وسرے پیش رو کے نقش قدم پر چلیں ۔ چنانچہ ان مکاتیب میں
ھی ان کا مجتہدانہ انداز ہر جگہ نمایاں ہے۔ جیل میں بغیر کسی
ہتمام اور کاوش کے قلم برداشتہ لکھتے گئے لیکن قدرت بیان
ہے کہ بے ساختگی میں بھی ابھری چلی آتی ہے اور کاوش فکر ہے
ہ آمد میں بھی آورد سے زیادہ بنتی اور سنورتی رہتی ہے ۔ ظراف
، تو وہ اپنی بے داغ لطافت رکھتی ہے ، واقعہ نگاری ہے تو
کی نقش آرائی کا جواب نہیں — فکر کا پیمانہ ہر جگہ بلند او
کا معیار ہر جگہ ارجمند ہے۔

ایک عظیم انسان کی ذہنی زندگی کا سب سے روشن عکس۔

غُبارِ خاطر

مَپُرس تا چہ نوشت است کلکِ قاصرِ ما
خطِ غُبارِ من است ایں غُبارِ خاطرِ ما

(سلسلہ میری لائبریری)

١٦

میری لائبریری میں ادب، طنز اور مزاح کی دوسری کتابیں

میرے بھی صنم خانے	قرۃ العین حیدر
کلیاتِ غالب (فارسی غزلیات)	
دیوانِ غالب (اردو کلام)	
لذتِ آوارگی	اے۔ ڈی۔ اظہر
اردو کا بہترین انشائی ادب	مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی
اردو کا بہترین مزاحیہ ادب	〃 〃 〃
شخصیت نگاری	〃 〃 〃
حماقتیں	شفیق الرحمٰن
مزید حماقتیں	〃
پرواز	〃
لہریں	〃
سنگ و خشت	کنہیا لال کپور
شیشہ و تیشہ	〃
گردِ کارواں	〃
چنگ و رباب	〃
نرم گرم	〃
چراغ تلے	مشتاق احمد یوسفی
گرما گرم (لطیفے)	اشفاق احمد خاں
ڈھول کا پول (کارٹون)	شوکت محمود

غبارِ خاطر

قلعۂ احمد نگر کی اسیری
از ۹ اگست ۱۹۴۲ء تا ۱۵ جون ۱۹۴۵ء
کے زمانے کی بعض تحریرات



ابو الکلام آزاد



میری لائبریری، لاہور

میری لائبریری میں دوسری مرتبہ ۱۹۶۲ء
ناشر : بشیر احمد چودھری
طابع : نقوش پریس لاہور

ترتیب

طبعِ ثالث

"غبارِ خاطر" کا پہلا اڈیشن گزشتہ مئی میں شائع ہوا اور تین ماہ میں ختم ہوگیا۔ دُوسرا اڈیشن اگست میں نکلا، وہ بھی اب قریب الاختتام ہے۔ افسوس ہے کہ ان دونوں اڈیشنوں کی چھپائی کا انتظام جس درجہ بہتر ہونا تھا، نہ ہوسکا لیکن اس کوتاہی کے لئے حالی پبلشنگ ہاؤس کو ذمّہ دار نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ طباعت کا اہتمام اُن سے متعلق نہ تھا۔

اب یہ تیسرا اڈیشن اس غرض سے شائع کیا جارہا ہے کہ جو حضرات زیادہ اچھے اڈیشن کے خواہشمند ہوں اُن کے ذوقِ طبع کا بھی سامان ہوجائے۔ مطالب کے لحاظ سے بھی یہ اڈیشن پچھلے اڈیشنوں پر فوقیت رکھتا ہے کیونکہ ایک مکتوب جو اندراج سے رہ گیا تھا اور جو کئی اعتبار سے تمام مکتوبات میں خاص اہمیّت رکھتا ہے، آخر میں بڑھا دیا گیا ہے۔

جون ۱۹۴۷ء

محمد اجمل خاں
سکرٹری، مولانا ابوالکلام آزاد

ایک بات!

"میری لائبریری" نے "غبارِ خاطر" کو پہلے بھی بڑی عمدگی سے شائع کیا تھا۔ اب پھر اس کی کتابت، طباعت اور پروف ریڈنگ کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ نیز اگلے صفحہ پر قارئین اور علمی کام کرنے والوں کی سہولت کے لیے مولانا کے مختصر سوانح اور فہرست تصانیف بھی دی جا رہی ہے۔ یہ فہرست اور حالات ہماری کتاب "اردو کا بہترین انشائی ادب" مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی سے ماخوذ ہیں، کہ اُس کتاب میں مولانا کے ایک مضمون کے ساتھ مولانا کی تصویر، حالات اور فہرست تصانیف بھی شائع ہوئی ہے۔

۲۰ نومبر ۶۲ء

مدیر "میری لائبریری"

مختصر حالات

محی الدین احمد نام، پیدائش ۱۸۸۸ء، مقام پیدائش مکہ معظمہ، حجاز اور مصر میں تعلیم حاصل کی۔ آپ کے والد مولانا خیر الدین بڑے عالم تھے۔ ایک مدت کلکتہ میں رہائش پذیر رہے یہیں اپنا مشہور اخبار "الہلال" نکالا۔ مولانا ہندوستان کے مشہور سیاستدان، مقرر، ادیب اور عالم تھے۔ ۱۹۴۶ء میں جیل سے رہائی کے ایک سال بعد "غبارِ خاطر" کی اشاعت ہوئی۔
تقسیمِ ہند کے بعد بھارت کے وزیرِ تعلیم رہے۔ ۱۹۵۸ء میں دہلی میں وفات پائی۔

تصانیف

(۱) تذکرہ (۲) غبارِ خاطر (۳) ترجمان القرآن ۲ جلدیں (تیسری جلد وفات کے بعد چھپی ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مولانا کی تصنیف نہیں ہے) (۴) شہادت حسین (۵) مقالات آزاد (دو حصے) (۶) عظیم شخصیتیں (۷) ہجر و وصال (۸) نگارشاتِ آزاد (۹) آزاد کی تقریریں۔ (۱۰) اعلانِ حق (۱۱) درسِ وفا (۱۲) مضامین (۱۳) صبحِ اُمید (۱۴) اُمّ الکتاب۔ (۱۵) رسولِ عربی (۱۶) انسانیت موت کے دروازے پر (۱۷) ولادتِ نبوی۔ (۱۸) فلسفہ (۱۹) حضرت یوسف (۲۰) عیدین (۲۱) انتخاب الہلال (۲۲) خطباتِ آزاد (۲۳) الدین والسیاست (۲۴) کاروانِ خیال (اشتراک حبیب الرحمٰن شروانی) (۲۵) نذیر احمد (۲۶) اذکار آزاد (۲۷) مکاتیب ابوالکلام آزاد (۲۸) مکالمات (۲۹) تصریحاتِ آزاد (۳۰) خطباتِ جمعات و عیدین (۳۱) جہاد اور اسلام۔ (۳۲) داستانِ کربلا (۳۳) اصحابِ کہف (۳۴) امر بالمعروف (۳۵) ایلا و تخییر۔ (۳۶) تازہ مضامین (۳۷) دعوتِ عمل (۳۸) صدائے رفعت (۳۹) فرید وجدی (۴۰) حقیقۃ الحج (۴۱) ذکریٰ (۴۲) اسلامی جمہوریہ (۴۳) حقیقت الصیام (۴۴) شہید اعظم (۴۵) آثار ابوالکلام آزاد (مرتبہ عبدالغفار) (۴۶) قولِ فیصل (۴۷) مسلمان اور کانگریس (۴۸) مسئلہ خلافت (۴۹) افکار آزاد (۵۰) میرا عقیدہ۔
(۵۱) India Wins Freedom (۵۲) ترجمان القرآن جلد سوم مرتبہ غلام رسول مہر

مُقدّمہ

تاریخِ واقعاتِ شہاں نانوشتہ ماند
افسانۂ کہ گفتِ نظیریؔ کتاب شُد!

٭

اس مجموعے میں جس قدر مکتوبات ہیں وہ تمام تر نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی رئیس بھیکم پور ضلع علی گڑھ کے نام لکھے گئے تھے۔ چونکہ قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانے میں دوستوں سے خط و کتابت کی اجازت نہ تھی اور حضرت مولانا کی کوئی تحریر باہر نہیں جا سکتی تھی اس لئے یہ مکاتیب وقتاً فوقتاً لکھے گئے اور ایک فائل میں جمع ہوتے رہے ۱۵ ارجون ۱۹۴۵ء کو جب مولانا رہا ہوئے تو ان مکاتیب کے مکتوب الیہ تک پہنچنے کی راہ باز ہوئی۔

نواب صاحب سے حضرت مولانا کا دوستانہ علاقہ بہت قدیم ہے۔ مولانا نے خود ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ پہلے پہل اُن سے ملاقات ۱۹۰۶ء میں ہوئی تھی۔ گویا ایک کم چالیس برس اس رشتۂ اخلاص و محبت پر گزر چکے اور ایک قرن سے بھی زیادہ وقت کا امتداد اس کی تازگی اور شگفتگی کو افسردہ نہ کر سکا۔ دوستی و یگانگت کے ایسے ہی علاقے ہیں۔ جن کی نسبت کہا گیا تھا:

تزول جبال الراسیات و قلبھم
عن الحبّ لا یخلو و لا یتزلزل

البتہ یہ علاقۂ محبت و اخلاص صرف علمی اور ادبی ذوق کے رشتۂ اشتراک میں محدود ہے، سیاسی عقائد و اعمال سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ سیاسی میدان میں مولانا کی راہ دوسری ہے اور نواب صاحب اس سے رسم و راہ نہیں رکھتے۔

حضرت مولانا کی زندگی مختلف اور متضاد حیثیتوں میں بٹی ہوئی ہے۔ وہ ایک ہی زندگی اور ایک ہی وقت میں مصنّف بھی ہیں، مقرّر بھی ہیں، مفکّر بھی ہیں، فلسفی بھی ہیں، ادیب

بھی ہیں، مدبّر بھی ہیں اور ساتھ ہی سیاسی جدوجہد کے میدان کے سپہ سالار بھی ہیں۔ دینی علوم کے تبحّر کے ساتھ عقلیات اور فلسفے کا ذوق بہت کم جمع ہوتا ہے اور علم اور ادب کے ذوق نے ایک ہی دماغ میں بہت کم آشیانہ بنایا ہے۔ پھر علمی اور فکری زندگی کا میدان، عملی سیاست کی جدوجہد سے اتنا دُور واقع ہُوا ہے کہ ایک ہی قدم دونوں میدانوں میں بہت کم اُٹھ سکے ہیں مگر مولانا آزاد کی زندگی ان تمام مختلف اور متضاد حیثیتوں کی جامع ہے، گویا ان کی ایک زندگی میں بہت سی زندگیاں جمع ہوگئی ہیں۔

وہ اپنی ذات سے اِک انجمن ہیں

اِس صورتِ حال کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے علائق کا دائرہ کسی ایک گوشے میں محدود نہیں رہا۔ علوم دینیہ کے حجروں کے زاویہ نشین، ادب و شعر کی محفلوں کے بزم طراز، علم اور فلسفے کی کاوشوں کے دقیقہ سنج، اور میدانِ سیاست کے تدبّر اور معرکہ آرائیوں کے شہ سوار، سب کے لئے ان کی شخصیت یکساں طور پر کشش رکھتی ہے اور سب اس مجمع فضل و کمال کے افادات سے بقدرِ طلب و حوصلہ مستفید ہوتے رہتے ہیں ؎

تو نخلِ خوش ثمر کیستی کہ باغ و چمن

ہمہ ز خویش بریدند و در تو پیوستند!

البتہ ان کے ارادت مندوں کا حلقہ جس قدر وسیع اور بین القومی ہے اتنا ہی دوستوں کا دائرہ تنگ ہے :

کسے کہ زُود گسل نیست، دیر پیوندست

ایسے خوش قسمت اصحاب جنھیں مولانا اپنے 'دوستوں' میں تصور کرتے ہیں، خال خال ہیں اور صرف وہی ہیں جن سے علم و ذوق کے اشتراک اور رجحانِ طبیعت کی مناسبت نے انھیں وابستہ کردیا ہے۔ ایسے ہی خال خال حضرات میں ایک شخصیت نواب صدر یار جنگ کی ہے۔

نواب صاحب مسلمانانِ ہند کے گزشتہ دورِ علم و مجالس کی یادگار ہیں۔ آج سے تیس چالیس برس بیشتر کا زمانہ، مولانا آزاد کی ابتدائی علمی زندگی کا زمانہ تھا۔ وہ اس وقت کے تمام اکابر و

افاضل سے عمر میں بہت چھوٹے تھے یعنی ان کی عمر سترہ اٹھارہ برس سے زیادہ نہ تھی لیکن اپنی غیر معمولی ذہانت اور محیّر العقول علمی قابلیت کی وجہ سے سب کی نظروں میں محترم ہو گئے تھے۔ اور معاصرانہ اور دوستانہ حیثیت سے ملتے تھے۔ نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، خلیفہ محمد حسین (پٹیالہ)، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، ڈاکٹر نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ، حکیم محمد اجمل خاں وغیرہم، سب سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے اور علمی اور ادبی صحبتیں رہا کرتی تھیں۔ اسی عہد کی صحبتوں میں نواب صدر یار جنگ سے بھی ان کی شناسائی ہوئی اور پھر شناسائی نے عمر بھر کی دوستی کی نوعیت پیدا کر لی۔ مولانا اس رشتے کو خصوصیت کے ساتھ عزیز رکھتے ہیں کیونکہ یہ اس عہد کی یادگار ہے جو بہت تیزی کے ساتھ گزر گیا اور ملک کی مجلسیں قدیم صورتوں اور صحبتوں سے یک قلم خالی ہو گئیں۔

مولانا کی سیاسی زندگی کے طوفانی حوادث اُن کی تمام دوسری حیثیتوں پر چھا گئے ہیں۔ لیکن خود مولانا نے اپنی سیاسی زندگی کو اپنے علمی اور ادبی علائق سے بالکل الگ رکھا ہے۔ جن دوستوں سے ان کا علاقہ محض علم و ادب کے ذوق کا علاقہ ہے وہ ان کے علائق کو سیاسی زندگی سے ہمیشہ الگ رکھتے ہیں اور اس طرح الگ رکھتے ہیں کہ سیاسی زندگی کی پرچھائیں بھی اس پر نہیں پڑ سکتی۔ وہ جب کبھی ان دوستوں سے ملیں گے، یا خط و کتابت کریں گے تو اُس میں سیاسی افکار و اعمال کا کوئی ذکر نہ ہو گا۔ ایک بے خبر آدمی اگر اُس وقت کی باتوں کو سُنے تو خیال کرے، اس شخص کو سیاسی دُنیا سے دُور کا بھی علاقہ نہیں اور علم و ادب کے سوا اور کسی ذوق سے آشنا نہیں۔ ایک مرتبہ اس معاملے کا خود مولانا سے ذکر ہوا تو فرمانے لگے، جس شخص سے میرا تعلق جس حیثیت سے ہے میں ہمیشہ اُسے اسی حیثیت میں محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ دوسری حیثیتوں سے اُسے آلودہ کروں۔ چنانچہ نہ تو کبھی وہ ان دوستوں سے اس کی توقع رکھتے ہیں کہ ان کی سیاسی زندگی کے آلام و مصائب میں شریک ہوں نہ کبھی اُس کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ ان کے سیاسی افکار و اعمال سے اتفاق کریں۔ سیاسی معاملے میں وہ ہر شخص کو خود اس کی پسند اور خواہش پر چھوڑ دیتے ہیں آپ اُن سے کسی علمی، مذہبی اور ادبی تعلق سے برسوں ملتے رہیے۔ وہ کبھی بھولے سے بھی سیاسی

معاملات کا آپ سے ذکر نہیں کریں گے۔ ایسا معلوم ہوگا جیسے اُس عالم کی انھیں کوئی خبر ہی نہیں

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ان کی زندگی سیاسی میدانوں کے طوفانی حوادث سے گھری ہوتی ہے۔ کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ ایک دن یا ایک گھنٹے کے بعد کیا حوادث پیش آئیں گے۔ ممکن ہے کہ قید و بند کا مرحلہ پیش آجائے۔ بہت ممکن ہے کہ جلاوطنی، یا اس سے بھی زیادہ کوئی خطرناک صورتِ حال ہو لیکن اچانک، عین اسی عالم میں کسی ہم ذوق دوست کی یاد اُن کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے سارے گرد و پیش سے یک قلم کنارہ کش ہو کر اُس کی جانب ہمہ تن متوجہ ہو جاتے ہیں اور اس استغراق اور انہماک کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں گویا ان کی زندگی پر کسی خطرناک حادثے کا سایہ بھی نہیں پڑا ہے۔ وہ اس وقت اپنی یکساں اور بے کیف سیاسی مشغولیت کا مزہ بدلنے کے لئے کوئی ایسا موضوع چھیڑ دیں گے جو سیاسی زندگی کے میدانوں سے ہزاروں کوس دور ہوگا۔ علم و فن کا کوئی مبحث، فلسفیانہ غور و فکر کی کوئی کاوش، طبیعیات کا کوئی نیا نظریہ، تصوّف و اشراق کا کوئی وارِدہ، یا پھر ادب و انشا کی سخن طرازی اور شعر و سخن کی بزم آرائی، غرض کہ سیاست کے سوا ہر ذوق کی وہاں گنجائش ہوگی، ہر وادی کی وہاں پیمائش کی جا سکے گی۔ اُس وقت کوئی انھیں دیکھے تو صاف دکھائی دے کہ زبانِ حال سے خواجہ حافظ کا یہ شعر دہرا رہے ہیں:

کمندِ صیدِ بہرامی بیفگن، جامِ مے بردار
کہ من پیمودم ایں صحرا، نہ بہرام است نے گورش!

مولانا اس صورتِ حال کو تحمیض سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔ "تحمیض" عربی میں مُنہ کا مزہ بدلنے کے معنی میں بولا جاتا ہے: "حمّضوا مجالسکم" یعنی اپنی مجلسوں کا مزہ بدلتے رہو۔ وہ کہتے ہیں اگر گاہ گاہ میں اس "تحمیض" کا موقع نہ نکالتا رہوں تو میرا دماغ بے کیف اور خشک مشغولیتوں کے بارِ مسلسل سے تھک کر معطل ہو جائے۔ اس طرح کی "تحمیض" میرے لئے ذہنی عیش و نشاط کا سامان بہم کر دیا کرتی ہے اور دماغ ازسرِ نو تازہ دم ہو جاتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عین سیاسی طوفانوں کے موسم میں کوئی ہم ذوق دوست آ نکلتا ہے

اور انھیں موقع مل جاتا ہے کہ قلم و تخیل کی جگہ صحبت و مجالست کے ذریعے اپنی مشغولیت کا ذائقہ بدلیں۔ وہ معاً اپنے گرد و پیش کی دنیا سے باہر نکل آئیں گے اور ایک انقلابی تحول کے ساتھ اپنے آپ کو ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیں گے۔ وہ فوراً اپنے خادمِ خاص عبداللہ کو پکاریں گے کہ چائے لاؤ۔ یہ گویا اس کا اعلان ہوگا کہ ان کے ذوق و کیف کا خاص وقت آگیا۔ پھر شعر و سخن کی صحبت شروع ہو جائے گی، علم و ادب کا مذاکرہ ہونے لگے گا اور اعلیٰ درجے کی چینی چائے 'وہائٹ جیسمین' کے چھوٹے چھوٹے فنجانوں کا دَور چلنے لگے گا کہ :

حاصلِ کارگہِ کون و مکاں ایں ہمہ نیست

بادہ پیش آر کہ اسبابِ جہاں ایں ہمہ نیست

اُنھیں اپنی طبیعت کے انفعالات پر غالب آنے اور اپنے آپ کو اچانک بدل لینے کی جو غیر معمولی قدرت حاصل ہو گئی ہے، وہ فی الحقیقت ایک حیرت انگیز بات ہے۔ اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں خود اپنی آنکھوں سے اس انقلابی تحول کو دیکھنے کا موقع ملا ہو۔ مجھے آٹھ برس سے یہ موقع حاصل ہے۔

نواب صدر یار جنگ ایک خاندانی رئیس ہیں، ملک کے سیاسی معاملات میں ان کا طرزِ عمل وہی رہتا آیا ہے جو عموماً ملک کے طبقۂ روسا کا ہے یعنی سیاسی کش مکش کے میدانوں سے علیحدگی اور اپنے گوشۂ سکون و جمعیت پر قناعت۔ برخلاف اس کے مولانا کی پوری زندگی سیاسی جدّ و جہد کی جنگ آزمائی اور معرکہ آرائی کی زندگی ہے لیکن صورتِ حال کا یہ اختلاف بلکہ تضاد ایک لمحے کے لئے بھی ان کے باہمی علائق کی یگانگت و یک جہتی پر اثر نہیں ڈال سکتا۔ نہ کبھی مولانا سیاسی معاملات کی طرف کوئی اشارہ کریں گے نہ کبھی نواب صاحب کی جانب سے کوئی ایسا تذکرہ درمیان آئے گا۔ دونوں کا علاقہ ذاتی محبت و اخلاص اور ذوقِ علم و ادب کے اشتراک کا علاقہ ہے اور ہمیشہ اسی دائرے میں محدود رہتا ہے۔ چنانچہ قلعہ احمد نگر کے ایک مکتوب مورخہ ۲۹ اگست ۱۹۴۲ء میں وہ سیاسی حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "مجھے یہ قصہ یہاں نہیں چھیڑنا چاہئے۔ میری آپ کی مجلس آرائی اس افسانہ سرائی کے لئے نہیں ہوا کرتی :

ازما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

میری دکانِ سخن میں ایک ہی طرح کی جنس نہیں رہتی لیکن آپ کے لئے کچھ نکالتا ہوں تو احتیاط کی چھلنی میں اچھی طرح چھان لیا کرتا ہوں کہ کسی طرح کی سیاسی ملاوٹ باقی نہ رہے۔"

۱۵ ؍جون ۱۹۴۵ء کو مولانا تین برس کی قید و بند کے بعد رہا ہوئے اور اس حالت میں رہا ہوئے کہ چوالیس پاؤنڈ وزن کم ہو چکا تھا اور تندرستی جواب دے چکی تھی لیکن رہائی کے بعد ہی انھیں فوراً شملہ پہنچنا اور شملہ کانفرنس کی مشغولیتوں میں گم ہو جانا پڑا۔ اب وہ قلعہ احمد نگر اور بانکوڑا کے قید خانے کی جگہ وائسرائے کی لاج شملہ کے مہمان تھے، لیکن یہاں بھی صبح چار بجے کی سحر خیزی اور خود مشغولی کی معمولات برابر جاری رہیں۔ ایک دن صبح اچانک نواب صاحب کی یاد سامنے آجاتی ہے اور وہ ایک شعر لکھ کر تین برس پیشتر کی خط و کتابت کا سلسلہ از سرِ نو تازہ کر دیتے ہیں پھر تبدیل آب و ہوا کے لئے کشمیر جاتے ہیں اور تین ہفتے گلمرگ میں مقیم رہتے ہیں، گلمرگ سے سری نگر آتے ہیں اور ایک ہاؤس بوٹ میں مقیم ہو جاتے ہیں۔ یہ ہاؤس بوٹ نسیم باغ کے کنارے لگا دیا گیا تھا اور مولانا کی صبحیں اسی کے ڈرائنگ روم میں بسر ہونے لگی تھیں یہاں پھر خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہوتا ہے اور ۳ ؍ستمبر ۱۹۴۵ء کو مولانا اپنے ایک مکتوب میں قلعہ احمد نگر کے حالات کی حکایت چھیڑ دیتے ہیں اور ان مکاتیب کے نگارش کے اسباب و محرکات کی تفصیلات لکھتے ہیں جو اس مجموعے میں جمع کئے گئے ہیں۔ چونکہ رہائی کے بعد کے مکاتیب کا یہ حصہ بھی ان مکاتیب سے مربوط ہو گیا ہے اس لئے مولانا سے اجازت لے کر میں نے انھیں بھی اس مجموعے کی ابتدا میں شامل کر دیا ہے۔ رہائی کے بعد کے یہ مکاتیب اس مجموعے کے لئے دیباچے کا کام دیں گے۔

مولانا کو سینکڑوں خطوط لکھنے اور لکھوانے پڑتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کی نقول نہیں رکھی جا سکتیں، لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے اپنے خاص علمی اور ادبی مکاتیب کی نقول رکھنے کی بھی کوشش نہیں کی اور اس طرح سیکڑوں مکاتیب ضائع گئے۔

۱۹۴۰ء میں، میں نے مولانا سے درخواست کی کہ جو خاص مکاتیب ہندوستان خاص کو لکھا کرتے ہیں ان کی نقول رکھنے کی مجھے اجازت ملے، چنانچہ مولانا نے اجازت دے دی

اور اب ایسا ہونے لگا کہ جب کبھی مولانا کوئی مکتوبِ خاص اپنے ذوق و کیف میں لکھتے، میں پہلے اُس کی نقل کر لیتا۔ پھر ڈاک میں ڈالتا۔ نواب صاحب کے نام ۱۹۴۰ء، ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء میں جس قدر خطوط لکھے گئے سب کی نقول میں نے رکھ لی تھیں اور میرے پاس موجود ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر رہائی کے بعد مولانا نے قلعۂ احمد نگر کے مکاتیب میرے حوالے کئے کہ حسبِ معمول ان کی نقول رکھ لوں اور اصل نواب صاحب کی خدمت میں یک دفعہ بھیج دوں لیکن میں نے جب ان کا مطالعہ کیا تو خیال ہوا کہ ان تحریرات کا محض نجی خطوط کی شکل میں رہنا اور شائع نہ ہونا اُردو ادب کی بہت بڑی محرومی اور اربابِ ذوق کی ناقابلِ تلافی حرمانی ہوگی۔ مولانا اُس وقت شملہ میں تھے۔ میں نے بہ اصرار اُن سے درخواست کی کہ ان مکاتیب کو ایک مجموعے کی شکل میں شائع کرنے کی اجازت دے دیں۔ مجھے یقین ہے کہ ملک کے تمام اربابِ ذوق و نظر اس واقعے کے شکر گزار ہوں گے کہ مولانا نے اشاعت کی اجازت دے دی اور اس طرح میں اس قابل ہو گیا کہ یہ مجموعہ دیدہ ورانِ علم و ادب کی ضیافتِ ذوق کے لئے پیش کر دوں۔

۱۹۴۲ء میں گرفتاری سے پہلے مولانا لاہور گئے تھے۔ وہاں انفلوئنزا کی شکایت لاحق ہو گئی۔ اسی حالت میں کلکتہ آئے اور صرف تین دن ٹھہر کر ۲ اگست کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی صدارت کرنے کے لئے بمبئی روانہ ہو گئے۔ بمبئی جاتے ہوئے ریل میں انھوں نے ایک مکتوب نواب صاحب کے نام لکھ کر رکھ لیا تھا کہ بمبئی پہنچ کر مجھے دے دیں گے میں حسبِ معمول اس کی نقل رکھ کر اصل ڈاک میں ڈال دوں گا لیکن بمبئی پہنچنے کے بعد وہ اپنی مصروفیتوں میں غرق ہو گئے اور مکتوبِ سفر اُن کے اٹاچی کیس میں پڑا رہ گیا۔ یہاں تک کہ ۹ اگست کی صبح کو وہ گرفتار ہو گئے چونکہ قلعۂ احمد نگر کے پہلے مکتوب میں اُس خط کا ذکر آیا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اُسے بھی ابتدا میں شامل کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ شامل کر دیا گیا ہے۔

میں نے ارادہ کیا تھا کہ مولانا کے اسلوبِ نگارش (سٹائل) کی نسبت اپنے تاثرات کے اظہار کی جرأت کروں گا لیکن جب اس ارادے کو عمل میں لانے کے لئے تیار ہوا تو معلوم ہوا کہ خاموشی کے سوا چارۂ کار نہیں۔ کیونکہ جتنا کچھ اور جیسا کچھ لکھنا چاہئے اس کی یہاں گنجائش

نہیں، اور جس قدر لکھنے کی گنجائش ہے وہ اظہارِ تاثرات کے لئے کافی نہیں۔ صرف اتنا اشارہ کر دینا چاہتا ہوں کہ فرانسیسی ادبیات میں ادب کی جس نوعیت کو 'ادبِ اعلیٰ' کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگر اردو ادب میں اس کی کوئی مثال ہمیں مل سکتی ہے تو وہ صرف مولانا کی ادبیات ہیں۔

مولانا نے اپنے اسلوبِ نگارش کے مختلف ڈھنگ رکھے ہیں کیونکہ ہر موضوع ایک خاص طرح کا اسلوب چاہتا ہے اور اسی اسلوب میں اس کا رنگ ابھر سکتا ہے۔ دینی مباحث کے لئے جو اسلوبِ تحریر موزوں ہوگا تاریخ کے لئے موزوں نہ ہوگا تاریخی مباحث جس طرزِ کتابت کے متقاضی ہوتے ہیں ضروری نہیں کہ ادبی نگارشات کے لئے بھی وہ موزوں ہو۔ عام حالت یہ ہے کہ ہر شخص ایک خاص طرح کا اسلوبِ تحریر اختیار کر لیتا ہے اور پھر جو کچھ لکھتا ہے اسی رنگ میں لکھتا ہے لیکن مولانا کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے علم و ذوق کے تنوع کی طرح اپنا اسلوبِ تحریر بھی مختلف قسموں کا رکھا ہے۔ عام دینی اور علمی مطالب کو وہ ایک خاص طرح کے اسلوب میں لکھتے ہیں۔ صحافت نگاری کے لئے انھوں نے ایک دوسرا اسلوب اختیار کیا ہے اور خالص ادبی انشاء پردازی کے لئے ان دونوں سے الگ طریقِ نگارش ہے۔

جس زمانے میں 'الہلال' نکلا کرتا تھا تو اس میں کبھی کبھی وہ خالص ادبی قسم کی چیزیں بھی لکھا کرتے تھے۔ ان تحریروں میں انھوں نے ایک ایسا مجتہدانہ اسلوب اختیار کیا تھا جس کی کوئی دوسری مثال لوگوں کے سامنے موجود نہ تھی۔ اس اسلوب کے لئے اگر کوئی تعبیر اختیار کی جا سکتی ہے تو وہ صرف 'شعر منثور' کی ہے یعنی وہ نثر میں شاعری کیا کرتے تھے۔ ان کی تحریر یا از سر تا پا شعر ہوتی تھی۔ صرف ایک چیز اس میں نہیں ہوتی تھی یعنی وزن اور اس لئے اسے نظم کی جگہ نثر کہنا پڑتا تھا۔

اس طرزِ تحریر کا ایک خاص طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی نثر کی شاعری کو شعرا کی نظم کی شاعری سے مخلوط اور مربوط کر کے ترتیب دیتے تھے اور یہ اختلاط اور ارتباط اس طرح وجود میں آتا تھا کہ اشعار صرف مطالب کی مناسبت ہی سے نہیں آتے بلکہ بجائے خود مطالب کا ایک جزء بن جاتے تھے۔ ایسا جزء کہ اگر اسے الگ کر دیجئے تو خود نفسِ مطلب کا ایک ضروری اور لاینفک جزء الگ ہو جائے۔ اکثر حالتوں میں مطالب کا سلسلہ اس طرح پھیلتا تھا کہ پورا مضمون نثر کے چھوٹے چھوٹے پیراگراوں۔

سے مرکب ہوتا اور ہر پیراگراف کسی ایک شعر پر ختم ہوتا۔ یہ شعر نثر کے مطلب سے ٹھیک اسی طرح جڑا اور بندھا ہوا ہوتا جس طرح ایک ترکیب بند کا ہر بند ٹیپ کے کسی شعر سے وابستہ ہوتا ہے اور وہ شعر، بند کا ایک ضروری جُزو بن جاتا ہے۔

لوگ نثر میں اشعار لاتے ہیں تو عموماً اس طرح لاتے ہیں کہ کسی جزئی مناسبت سے کوئی شعر یاد آگیا اور کسی خاص محل میں درج کر دیا گیا لیکن مولانا اس قسم کی تحریرات میں جو شعر درج کریں گے اس کی مناسبت محض جزئی مناسبت نہ ہوگی بلکہ مضمون کا ایک ٹکڑا بن جائے گی، گویا خاص اسی محل کے لئے شاعر نے یہ شعر کہا ہے اور مطالب کا تقاضا پورا کرنے اور ادھوری بات کو مکمل کر دینے کے لئے اس کے بغیر چارہ نہیں۔ اس طرزِ تحریر پر وہی شخص قادر ہو سکتا ہے جو کامل درجے کا شاعرانہ فکر رکھنے کے ساتھ ساتھ، اساتذہ کے بے شمار اشعار بھی اپنے حافظے میں محفوظ رکھتا ہو اور مطالب کی ہر قسم اور ہر نوعیت کے لئے جس طرح کے اشعار کی مطلوب ہوں فوراً حافظہ مہیا کر سکتا ہو۔ پھر ساتھ ہی اس کا ذوق بھی اس درجہ سلیم اور سیلے دانخ ہو کہ صرف اعلیٰ درجے کے اشعار ہی حافظہ قبول کرے اور حُسنِ انتخاب کا معیار کسی حال میں بھی درجے سے نہ گرے۔ اس اعتبار سے مولانا کے حافظے کا جو حال ہے وہ ہم سب کو معلوم ہے۔ قدرت نے انھیں جو نعمتیں بخشی ہیں، شاید ان سب میں حافظے کی نعمتِ لازوال سب سے بڑی نعمت ہے۔ عربی، فارسی اور اُردو کے کتنے اشعار ان کے حافظے میں محفوظ ہوں گے؟ یہ کسی کو معلوم نہیں؛ غالباً خود انھیں بھی معلوم نہیں۔ لیکن جونہی وہ قلم اٹھاتے ہیں اور مطالب کی مناسبتیں اُبھرنے لگتی ہیں، معاً ان کے حافظے کے بند کواڑ کھلنے شروع ہو جاتے ہیں، پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم اور ہر نوعیت کے سیکڑوں شعر پرا باندھے سامنے کھڑے ہیں جس شعر کی جس جگہ ضرورت ہوئی، فوراً اسے نکالا اور انگوٹھی کے نگینے کی طرح مضمون میں جڑ دیا۔

عام علمی اور دینی مباحث کی تحریرات میں مولانا بہت کم اشعار لایا کرتے ہیں۔ صفحوں کے صفحے لکھ جائیں گے اور ایک شعر بھی نہیں آئے گا لیکن اس خاص اسلوبِ تحریر میں وہ اس کثرت کے ساتھ اشعار سے کام لیتے ہیں کہ ہر دوسری تیسری سطر کے بعد ایک شعر ضرور آجاتا ہے اور

مطلب کے حسن و دل آویزی کا ایک نیا پیکر نمایاں کر دیتا ہے۔

قلعہ احمد نگر کے اکثر مکاتیب اسی طرزِ تحریر میں لکھے گئے ہیں۔ انھوں نے نثر میں شاعری کی ہے اور حسنِ مطلب کو ادا کیا ہے اس طرح کیا ہے کہ جدتِ فکر نقش آرائی کر رہی ہے اور وسعتِ تخیل رنگ و روغن بھر رہی ہے۔ اجتہادِ فکر اور تجدیدِ اسلوب مولانا کی عام اور ہمہ گیر خصوصیت ہے۔ قلم اور زبان کے ہر گوشے میں، وہ طرزِ عام سے اپنی روش الگ رکھیں گے اور الفاظ و تراکیب سے لے کر مطالب اور ادائے مطالب کے طرز تک، ہر بات میں تقلیدِ عام سے گریزاں اور اپنے مجتہدانہ انداز میں بے میل اور بے لچک نظر آئیں گے۔ انھوں نے جس وقت سے قلم ہاتھ میں سنبھالا ہے ہمیشہ پیش رو اور صاحبِ اسلوب رہے ہیں۔ کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ کسی دوسرے پیش رو کے نقشِ قدم پر چلیں۔ چنانچہ ان مکاتیب میں بھی ان کا مجتہدانہ انداز ہر جگہ نمایاں ہے۔ بغیر کسی اہتمام اور کاوش کے قلم برداشتہ لکھتے گئے لیکن قدرتِ بیان ہے جو بے ساختگی میں بھی اُبھری چلی آتی ہے اور کاوشِ فکر ہے جو آمد میں بھی آورد سے زیادہ بنتی اور سنورتی رہتی ہے۔

ظرافت ہے تو وہ اپنی بے داغ لطافت رکھتی ہے، واقعہ نگاری ہے تو اس کی نقش آرائی کا جواب نہیں۔ فکر کا پیمانہ ہر جگہ بلند اور نظر کا معیار ہر جگہ ارجمند ہے۔

ان مکاتیب پر نظر ڈالتے ہوئے سب سے زیادہ اہم چیز جو سامنے آتی ہے وہ مولانا کا دماغی پس منظر (بیک گراؤنڈ) ہے۔ اسی پس منظر پر افکار و احساسات کی تمام جلوہ طرازیوں نے اپنی جگہ بنائی ہے۔ ایک شخص ۹ اگست کی صبح کو بستر سے اُٹھا تو اچانک اُسے معلوم ہوا کہ وہ گرفتار کر لیا گیا ہے اور کسی نامعلوم مقام پر لے جایا جا رہا ہے — پھر ایک ایسی فوجی نگرانی کے اندر، جس کی کوئی پچھلی مثال ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کی تاریخ میں موجود نہیں، اُسے قلعۂ احمد نگر کی ایک عمارت میں بند کر دیا جاتا ہے اور دنیا سے تمام علائق یک قلم منقطع ہو جاتے ہیں۔ وہ اس حادثے کے چوبیس گھنٹے کے بعد دوسری صبح کو اُٹھتا ہے اور قلم اٹھا کر خامہ فرسائی شروع کر دیتا ہے۔ پھر اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے دن

حالات کی تحریک خیالات میں جنبش پیدا کرتی رہتی ہے اور جو کچھ دماغ میں اُبھرتا ہے، وہ نوکِ قلم کے حوالے ہوجاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ایسے حوصلہ فرسا حالات میں ان کا داخلی پس منظر کیا تھا اور وقت کے تمام مخالفانہ حالات کو کس نظر اور کس مقام سے دیکھ رہا تھا؟ یہی دماغی پس منظر ہے جس کی نوعیت سے ہر عظیم شخصیت کی عظمت کا اصل مقام دنیا کے آگے نمایاں ہوتا ہے۔ یہی کسوٹی ہے جس پر ہر انسانی عظمت کسی جا سکتی ہے اور یہی معیار ہے جو ہر انسان کی عظمت و پستی کا فیصلہ کر دیتا ہے۔

ان مکاتیب میں مولانا نے خود کوشش کی ہے کہ اپنا دماغی پس منظر دنیا کے آگے رکھ دیں اور اسی لیے یہ غیر ضروری ہو گیا ہے کہ اس بارے میں بحث و نظر سے کام لیا جائے۔ میں صرف معاملے کے اس پہلو پر اہلِ نظر کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، خود کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

گزشتہ جولائی میں جونہی ان مکاتیب کی اشاعت کا اعلان ہوا ملک کے ہر گوشے سے تقاضے ہونے لگے کہ ان کے ترجمے کا بھی سر و سامان ہونا چاہیے۔ کلکتہ، بمبئی، دہلی، الٰہ آباد، کانپور اور پٹنہ کے پبلشروں کا تقاضا تھا کہ انگریزی، ہندی، گجراتی، بنگالی، تامل وغیرہ زبانوں میں ان کے ترجمے کی اجازت دے دی جائے۔ میں نے یہ تمام درخواستیں مولانا کی خدمت میں پیش کر دیں۔ لیکن انھوں نے ترجمے کی اجازت نہیں دی۔ انھوں نے فرمایا کہ چند مکاتیب کے سوا یہ تمام مکاتیب ایک ایسے اسلوب میں لکھے گئے ہیں کہ ان کا کسی دوسری زبان میں صحتِ ذوق و معیار کے ساتھ ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کیا جائے گا تو اصل کی ساری خصوصیات مٹ جائیں گی۔ چنانچہ اس وقت تک ترجمے کی اجازت کسی فرم کو نہیں دی گئی ہے۔ مولانا نے جس خیال سے ترجمے کو روکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے ہر صاحبِ نظر اتفاق کرے گا۔ یہ نثر میں شاعری ہے اور شاعری ترجمے کی چیز نہیں ہوتی۔ البتہ دو چار مکتوب جو فلسفیانہ اور تاریخی مباحث پر لکھے گئے ہیں، ترجمہ کیے جا سکتے ہیں انھیں مستثنیٰ کر دینا چاہیے۔

یہ تمام مکاتیب 'صدیق مکرم' کے خطاب سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ 'صدیق' تشدید کے ساتھ 'صدّیق' نہیں ہے جیسا کہ بعض اشخاص پڑھنا چاہیں گے بلکہ بغیر تشدید کے ہے

'صداقہ' عربی میں دوستی کو کہتے ہیں۔ 'صدیق' یعنی دوست۔

۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء کے مکتوب کے آخر میں متمم بن نویرہ کے مرثیے کے اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ یہ مرثیہ اُس نے اپنے بھائی مالک کی یاد میں لکھا تھا:

لقد لامنی عند القبور علی البکا　　رفیقی لتذراف الدموع السوافکٖ

فقال اتبکی کل قبر رأیته　　لقبر ثوی بین اللوی فالدکادکٖ

فقلت لہ ان الشجا یبعث الشجا　　فدعنی فہذا کلہ قبر مالکٖ

اِن اشعار کے مطلب کا خلاصہ یہ ہے:-

"میرے رفیق نے جب دیکھا کہ قبروں کو دیکھ کر میرے آنسو بہنے لگتے ہیں تو اس نے مجھے ملامت کی۔ اُس نے کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ اُس ایک قبر کی وجہ سے، جو ایک خاص مقام پر واقع ہے، تُو ہر قبر کو دیکھ کر رونے لگتا ہے؟ میں نے کہا بات یہ ہے کہ ایک غم کا منظر دوسرے غم کی یاد تازہ کر دیا کرتا ہے۔ لہٰذا مجھے رونے دے۔ میرے لئے تو یہ تمام قبریں مالک کی قبریں بن گئی ہیں!"

حکایت بے ستون و کوہ کنی: ایران کے قدیم آثار میں ایک اثر 'بے ستون' کے نام سے مشہور ہے اور داستان سراؤں نے اسے فرہاد کوہ کن کی طرف منسوب کر دیا ہے مگر دراصل یہ 'بے ستون' نہیں ہے، 'بہ ستون' (بھستان یا باغستان) ہے۔ فارسی قدیم میں 'باغ' خدا یا دیوتا کو کہتے ہیں، یعنی یہ مقام 'خداؤں کی جگہ' ہے۔

محمد اجمل خاں

(سیکرٹری مولانا ابوالکلام آزاد)

دیباچہ

میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی مولوی غلام علی آزاد بلگرامی کے معاصر اور ہم وطن تھے اور جدی رشتے سے قرابت بھی رکھتے تھے۔ آزاد بلگرامی نے اپنے تذکروں میں جا بجا ان کا ترجمہ لکھا ہے اور سراج الدین علی خاں آرزو اور آنند رام مخلص کی تحریرات میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے۔ انھوں نے ایک مختصر سا رسالہ 'غبارِ خاطر' کے نام سے لکھا تھا۔ میں یہ نام ان سے مستعار لیتا ہوں:

مپرس تا چہ نوشت است کلکِ قاصرِ ما
خطِ غبارِ من است ایں غبارِ خاطرِ ما!

یہ تمام مکاتیب نجی کے خطوط تھے اور اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ شائع کئے جائیں گے لیکن رہائی کے بعد جب مولوی محمد اجمل خاں صاحب کو ان کا علم ہوا تو مُصر ہوئے کہ انھیں ایک مجموعے کی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ چونکہ ان کی طرح ان کی خاطر بھی مجھے عزیز ہے اس لئے ان مکاتیب کی اشاعت کا سر و سامان کر رہا ہوں۔ جس حالت میں یہ قلم برداشتہ لکھے ہوئے موجود تھے اُسی حالت میں طباعت کے لئے دے دیئے گئے ہیں۔ نظرِ ثانی کا موقع نہیں ملا:

نسخۂ شوق بہ شیرازہ نہ گنجد زنہار
بگذارید کہ ایں نسخۂ مجزا ماند!

ابوالکلام

نیشنل ائرلائنز
مابین کراچی، جودھ پور
۲رفروری ۱۹۴۶ء

رہائی کے بعد کے بعض مکاتیب
نواب صدر یار جنگ کے نام

مکتوب

شملہ

۲۷ جون ۱۹۴۵ء

اے غائب از نظر کہ شُدی ہمنشینِ دل
می بینمت عیان و دُعا می فرستمت

دل حکایتوں سے لبریز ہے مگر زبانِ درماندۂ فرصت کو یارائے سخن نہیں۔ مہلت کا منتظر ہوں۔

ابوالکلام

نواب صدر یار جنگ کا مکتوب

حبیب گنج (علی گڑھ)
ار جولائی ۱۹۴۵ء

صدیقِ حبیب!

جس دن بدرِ کامل گہن سے نکلا تھا، دل نے محسوس کیا تھا کہ نورِ عظمت جہاں تاب ہوگا۔ ہوا اور کس شان سے ہوا۔ ۲۷ر جون کو پہاڑ کی چوٹیوں کا ایک ہنگامہ ایک گروپ کی شکل میں سامنے آیا۔ اس میں ایک بیکرِ محبوب بھی تھی قینچی لی، مجمع اغیار سے اسے جدا کیا۔ دیکھا، شیراز کی طرف سے صدا آئی:

دوش بر از پرتو رویت نظرے نیست کہ نیست
منتِ خاک درت بر بصرے نیست کہ نیست

اس غزل کا ایک اور شعر شاید بے موقع نہ ہو:

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ درِ محفلِ رنداں خبرے نیست کہ نیست!

خیر یہ تو ترانہ شیراز تھا۔ کان لگاتا ہوں تو شملہ کی چوٹیوں سے دوسرا ترانہ سمعت سامعہ نواز ہو رہا ہے:

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشینِ دل
می بینمت عیاں و دعا می فرستمت

جو کان نے سنا، تیسرے دن نقوش دل افروز کے پردے پر آنکھوں نے دیکھ لیا۔ اجازت ہو تو دوسرا مصرعہ میں بھی دہرا دوں:

می بینمت عیاں و دعا می فرستمت

نیاز کیش : حبیب الرحمٰن

نواب صدر یار جنگ کا نامۂ منظوم

مولانا اگست ۱۹۴۵ء کے اواخر میں کشمیر گئے تھے اور گلمرگ میں قیام فرمایا تھا۔ اُس زمانے میں یہ نامۂ منظوم پہنچا۔

حبیب گنج (علی گڑھ)
۶ رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ

محو نظارۂ گلمرغ[1] نگارے دارم — کز خیالش بہ دلِ زار بہارے دارم
اے نسیم سحری گر بحضورش گذری — عرضۂ شوق کہ در جان فگارے دارم
در بپرسد کہ مگر شوق پیامم دارد؟ — سر فرود آرو زمی گوشۂ کہ آسے دارم

دوستاں را بہ نعمت یاد کردن ہمت است
ورنہ ہر نخلے بہ پائے خود ثمر مے افگند

اسیر آزاد
حبیب

---

[1] کشمیر کی پہاڑی سطح مرتفع گلمرگ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اصل میں گل مرغ ہوگا۔ مرغ وہی لفظ ہے جو مرغزار میں ہے۔

مولانا کا مکتوبِ سرینگر

ہاؤس بوٹ۔ سری نگر
۲۴ر اگست ۱۹۴۵ء

گمے از دست، گلہے از دل وگاہے زپا مانم
بہ سرعت می روی اے عمر! می ترسم کہ وا مانم

صدیقِ مکرم!

زندگی کے بازار میں جنسِ مقاصد کی بہت سی جستجوئیں کی تھیں۔ لیکن اب ایک نئی متاع کی جستجو میں مبتلا ہو گیا ہوں، یعنی اپنی کھوئی ہوئی تندرستی ڈھونڈھ رہا ہوں معالجوں نے وادیٔ کشمیر میں گل گشتوں میں سراغ رسانی کا مشورہ دیا تھا۔ چنانچہ گزشتہ ماہ کے اواخر میں گلمرگ پہنچا اور تین ہفتے تک مقیم رہا۔ خیال تھا کہ یہاں کوئی سراغ پا سکوں گا مگر ہر چند جستجو کی، متاعِ گم گشتہ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

نکل گئی ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے!

آپ کو معلوم ہے کہ یہاں فیضی نے کبھی بارِ عیش کھولا تھا:

ہزار قافلہ شوق می کشد شبگیر
کہ بارِ عیش کشاید بخطۂ کشمیر

لیکن میرے حصے میں ناخوشی و ملالت کا بار آیا۔ یہ بوجھ جس طرح کاندھوں پر اٹھائے آیا تھا اسی طرح اٹھائے واپس جا رہا ہوں۔ خود زندگی بھی سرتاسر ایک بوجھ ہی ہے۔ خوشی سے اٹھائیں یا ناخوشی سے۔ مگر جب تک بوجھ سر پر پڑا ہے اٹھانا ہی پڑتا ہے:

ما زندہ از آنیم کہ آرام نہ گیریم!

گلمرگ سے سرینگر آگیا ہوں اور ایک ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں۔ گل گلمرگ سے روانہ ہو رہا تھا کہ ڈاک آئی اور اجمل خاں صاحب نے آپ کا مکتوبِ منظوم حوالے کیا کہ نہیں

سکتا کہ اس پیامِ محبت کو دلِ دردمند نے کن آنکھوں سے پڑھا اور کن کانوں سے سُنا۔ میرا اور آپ کا معاملہ تو وہ ہوگیا ہے جو غالب نے کہا تھا :

باچوں توئی معاملہ، برخویش منّت است
از شکوہ تو شکر گزارِ خودیم ما !

آپ نے اپنے تین شعروں کا پیامِ دل نواز نہیں بھیجا ہے لطف و عنایت کا ایک پورا دفتر کھول دیا ہے :

قلیلٌ منک یکفینی، ولاکن
قلیلک لایقال لہٗ قلیل!

اِن سطور کو آئندہ خامہ فرسائیوں کی تمہید تصور کیجیے۔ رہائی کے بعد جو کہانی سنانی تھی وہ ابھی تک نوکِ قلم سے آشنا نہ ہو سکی۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ابوالکلام

مکتوبِ نسیم باغ

نسیم باغ۔ سری نگر
۴ر ستمبر ۱۹۴۵ء

از ما مپرس دردِ دلِ ما، کہ یک زماں
خود را بحیلۂ پیشِ تو خاموش کردہ ایم

صدیقِ مکرم!

وہی صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہے۔ ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں، سامنے طرف جھیل کی وسعت شالامار اور نشاط باغ تک پھیلی ہوئی ہے۔ بائیں طرف نسیم باغ کے چناروں کی قطاریں دُور تک چلی گئی ہیں۔ چائے پی رہا ہوں اور آپ کی یاد تازہ کر رہا ہوں:

گرچہ دُوریم، بیادِ تو قدح می نوشیم
بُعدِ منزل نہ بود در سفرِ روحانی!

گرفتاری سے پہلے آخری خط جو آپ کے نام لکھ سکا تھا وہ ۳ر اگست ۱۹۴۲ء کی صبح کا تھا۔ کلکتہ سے بمبئی جا رہا تھا۔ ریل میں خط لکھ کر رکھ لیا کہ بمبئی پہنچ کر اجمل خاں صاحب کے حوالے کروں گا۔ سودہ نقل رکھ کر آپ کو بھیج دیں گے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اُنھوں نے خطوط کی نقول رکھنے پر اصرار کیا تھا اور میں نے یہ طریقہ منظور کر لیا تھا۔ لیکن بمبئی پہنچتے ہی کاموں کے ہجوم میں اس طرح کھو یا گیا کہ اجمل خاں صاحب کو خط دینا بھول گیا۔ ۹ر اگست کی صبح کو جب مجھے گرفتار کر کے احمد نگر لے جا رہے تھے تو بعض کاغذات رکھنے کے لئے راہ میں اٹاچی کیس کھولا اور یکایک وہ خط سامنے آگیا۔ اب دُنیا سے تمام علاقے منقطع ہو چکے تھے۔ ممکن نہ تھا کہ کوئی خط ڈاک میں ڈالا جا سکے۔ میں نے اُسے اٹاچی کیس سے نکال کر مسودات کی فائل میں رکھ دیا اور فائل کو صندوق میں بند کر دیا۔

دو بجے ہم احمد نگر پہنچے اور پندرہ منٹ کے بعد قلعے کے اندر محبوس تھے۔ اب اس

دنیا میں جو قلعے سے باہر تھی اور اس دنیا میں جو قلعے کے اندر تھی، برسوں کی مسافت حائل ہو گئی:

کیف الوصول الی سعاد، ودونھا
قلل الجبال وبینھن حتوف!

دوسرے دن یعنی ۱۰ اگست کو حسبِ معمول صبح تین بجے اٹھا۔ چائے کا سامان جو سفر میں ساتھ رہتا ہے وہاں بھی سامان کے ساتھ آگیا تھا۔ میں نے چائے دم دی، فنجان سامنے رکھا اور اپنے خیالات میں ڈوب گیا۔ خیالات مختلف میدانوں میں بھٹکنے لگے تھے اچانک وہ خط جو ۸ اگست کو ریل میں لکھا تھا اور کاغذات میں پڑا تھا یاد آگیا۔ بے اختیار جی چاہا کہ کچھ دیر آپ کی مخاطبت میں بسر کروں اور آپ سن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں، مگر روئے سخن آپ ہی کی طرف رہے۔ چنانچہ اس عالم میں ایک مکتوب قلم بند ہو گیا اور اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے دن مکتوبات قلم بند ہوتے رہے۔ گو کبھی کبھی بعض دیگر احباب و اعزہ کی یاد بھی سامنے آئی اور ان کی مخاطبت میں بھی گاہ گاہ طبع واماندہ نے دل آزادی نفسی کرتی رہی۔ قید خانے سے باہر کی دنیا سے اب سارے رشتے کٹ چکے تھے اور مستقبل پردۂ غیب میں مستور تھا۔ کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ مکتوبات کبھی مکتوب الیہم تک پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں۔ تاہم ذوقِ مخاطبت کی طلب گاریاں کچھ اس طرح دل مستمند پر چھا گئی تھیں کہ قلم اٹھا لیتا تھا تو پھر رکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ لوگوں نے نامہ بری کا کام کبھی قاصد سے لیا کبھی بالِ کبوتر سے۔ میرے حصے میں عنقا آیا:

ایں رسم و راہِ تازہ زحرمانِ عہدِ ماست
عنقا بروزگار کسے نامہ بر نہ بود!

۱۰ اگست ۴۲ء سے مئی ۱۹۴۳ء تک ان مکتوبات کی نگارش کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس کے بعد رک گیا کیونکہ ۹ اپریل ۱۹۴۳ء کے حادثے کے بعد طبع واماندہ حالی بھی رک گئی تھی اور اپنی درماندگیوں میں گم تھی۔ اگرچہ اس کے بعد بھی بعض مصنفات کی تسوید و ترتیب کا کام

بدستور جاری رہا اور قلعۂ احمد نگر کی اور تمام معمولات بھی بغیر کسی تغیر کے جاری رہیں۔ تاہم یہ حقیقتِ حال چھپانی نہیں چاہتا کہ قرار و سکون کی یہ جو کچھ نمائش تھی، جسم و صورت کی تھی قلب و باطن کی نہ تھی۔ جسم کو میں نے ہلنے سے بچا لیا تھا مگر دل نہیں بچا سکا تھا:

دلِ دیوانۂ دارم کہ در صحراست پنداری!

اس کے بعد بھی گاہ گاہ حالات کی تحریک کام کرتی رہی اور رشتۂ فکر کی گرہیں کھلتی رہیں مگر اب سلسلۂ کتابت کی وہ تیز رفتاری مفقود ہو چکی تھی جس نے اوائل حال میں طبیعت کا ساتھ دیا تھا۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں جب احمد نگر سے بانکوڑا میں قید تبدیل کر دی گئی تو طبیعت کی آمادگیوں نے آخری جواب دے دیا۔ اب صرف بعض مصنفات کی تکمیل کا کام جاری رکھا جا سکا اور کسی تحریر و تسوید کے لیے طبیعت مستعد نہ ہوئی۔ آخری مکتوب جو بعض سیاسی مسائل کی نسبت ایک عزیز کے نام قلمبند ہوا ہے، ۳؍ مارچ ۱۹۴۳ء کا ہے۔ اس مکتوب پر یہ داستانِ بے ستون و کوہکن ختم ہو جاتی ہے۔ اگرچہ زندگی کی داستان ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہے:

شمۂ از داستانِ عشقِ شور انگیزِ ماست
ایں حکایت ہا کہ از فرہاد و شیریں کردہ اند!

غور کیجئے تو انسان کی زندگی اور اس کے احساسات کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ تین برس کی مدت ہو یا تین دن کی مگر جب گزرنے پر آتی ہے تو گزر ہی جاتی ہے۔ گزرنے سے پہلے سوچیے تو حیرانی ہوتی ہے کہ یہ پہاڑ سی مدت کیونکر کٹے گی؟ گزرنے کے بعد سوچیے تو تعجب ہوتا ہے کہ جو کچھ گزر چکا وہ چند لمحوں سے زیادہ نہ تھا!

رہائی کے بعد جب کانگرس ورکنگ کمیٹی کی صدارت کے لئے ۱۲؍ جون کو کلکتہ سے بمبئی آیا اور اسی مکان اور اسی کمرے میں ٹھہرا جہاں تین برس پہلے اگست ۱۹۴۲ء میں ٹھہرا تھا تو یقین کیجئے، ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے ۹؍ اگست اور اس کے بعد کا سارا ماجرا کل کی بات ہے اور یہ پورا زمانہ ایک صبح شام سے زیادہ نہ تھا۔ حیران تھا کہ جو کچھ گزر چکا

وہ خواب تھا کیا جو کچھ گزر رہا ہے یہ خواب ہے:

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں!

۱۵ رجون کو جب بانکوڑا میں رہا ہوا تو تمام مکتوبات نکالے اور ایک فائل میں بہ ترتیب تاریخ جمع کر دیئے۔ خیال تھا کہ انھیں حسبِ معمول نقل کرنے کے لیے دے دوں گا اور پھر اصل آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا، لیکن جب مولوی اجمل خاں صاحب کو ان کی موجودگی کا علم ہوا تو وہ بہت مُصر ہوئے کہ انھیں بلا تاخیر اشاعت کے لئے دے دینا چاہیئے چنانچہ ایک خوشنویس کو شملہ میں بلا لیا گیا اور پورا مجموعہ کتابت کے لئے دے دیا گیا۔ اب کتابت ہو رہی ہے اور اُمید ہے کہ عنقریب طباعت کے لیئے پریس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اب میں اُن مکتوبات کو قلمی مکتوبات کی صورت میں نہیں بھیجوں گا۔ مطبوعہ مجموعے کی صورت میں پیش کروں گا۔

شملہ میں اخبار "مدینہ" بجنور کے ایڈیٹر صاحب آئے تھے؛ انھوں نے مولوی اجمل خاں صاحب سے اس سلسلے کے پہلے مکتوب کی نقل لے لی تھی۔ وہ اخبارات میں شائع ہو گیا ہے شاید آپ کی نظر سے گزرا ہو "صدیقِ مکرم" کے تخاطب سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ روئے سخن آپ ہی کی طرف تھا:

چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود!

مکتوبات کے دو حصے کر دیئے ہیں؛ غیر سیاسی اور سیاسی۔ یہ مجموعہ صرف غیر سیاسی مکاتیب پر مشتمل ہے۔ اس کے تمام مکاتیب بلا استثناء آپ کے نام لکھے گئے ہیں۔

پرسوں دہلی کا قصد ہے چونکہ امریکن فوج کے جنرل مقیم دہلی نے ازراہِ عنایت اپنے خاص ہوائی جہاز کے یہاں بھیجنے کا انتظام کر دیا ہے۔ اس لئے موٹر کار کے تکلیف دہ سفر سے بچ جاؤں گا اور ڈھائی گھنٹے میں دہلی پہنچ جاؤں گا۔ وہاں عید کی نماز پڑھ کر بمبئی کے لئے روانہ ہونا ہے۔ ۱۰ سے ۲۴ تک بمبئی میں قیام رہے گا۔

ابوالکلام

رہائی سے پہلے کے مکاتیب

۲ر اگست ۱۹۴۲ء کا مکتوبِ سفر

(جو ۹ر اگست کی گرفتاری کی وجہ سے بھیجا نہ جا سکا اور جس کی طرف احمد نگر کے پہلے مکتوب میں اشارہ کیا گیا ہے)

بمبئی میل (براہِ ناگپور)

۲ر اگست ۱۹۴۲ء

صدیقِ مکرم!

دہلی اور لاہور میں انفلوئنزا کی شدت نے بہت خستہ کر دیا تھا۔ ابھی تک اس کا اثر باقی ہے۔ سفر کی ناتوانی [illegible] سر وبالِ دوش ہے، کیونکر سبکدوش ہوں؟ دیکھیے وبالِ دوش کی ترکیب نے غالب کی یاد تازہ کر دی:

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

۲۹ر جولائی کو اسی وبال کے ساتھ کلکتہ واپس ہوا تھا۔ چار دن بھی نہیں گزرے کہ کل ۲ر اگست کو بمبئی کے لئے نکلنا پڑا۔ جو وبال ساتھ لایا تھا، اب پھر اپنے ساتھ واپس لیے جا رہا ہوں:

رو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں!

مگر دیکھیے، صبح چار بجے کے وقتِ گرانمایہ کی کرشمہ سازیوں کا بھی کیا حال ہے؟ قیام کی حالت ہو یا سفر کی، ناخوشی کی کلفتیں ہوں یا دل آشوبی کی کاہشیں، جسم کی ناتوانیاں ہوں یا دل و دماغ کی افسردگیاں، کوئی حالت ہو، لیکن اس وقت کی مسیحائیاں افتادگانِ بستر سے کبھی تغافل نہیں کر سکتیں:

فیضے بعجبے یافتم از صبح بنیید
این جادۂ روشن رہِ میخانہ نہ باشد

میں ایک کُوپے میں سفر کر رہا ہوں۔ اس میں چار کھڑکیاں ہیں۔ دو بند تھیں، دو کُھلی تھیں میں نے صبح اُٹھتے ہی دو بند بھی کھول دیں۔ اب ریل کی رفتار جتنی گرم ہوتی جاتی ہے، اُتنی ہی ہوا کے جھونکوں کی خنکی بھی بڑھتی جاتی ہے جس بسترِ کرب پر ناخوشی[1] کی کلفتوں نے گرایا تھا، اُسی پر نسیمِ صبح گاہی کی چارہ فرمائیوں نے اب اٹھا کر بٹھا دیا ہے۔ شاید کسی ایسی ہی رات کی صبح ہو گی۔ جب خواجۂ شیراز کی زبان سے بے اختیار نکل گیا تھا:

خوشش باد آں نسیمِ صبح گاہی
کہ دردِ شب نشیناں را دوا کرد!

ٹرین آج کل کے معمول کے مطابق بے وقت جا رہی ہے۔ جس منزل سے اس وقت تک گزر جانا تھا، ابھی تک اس کا کوئی سراغ دکھائی نہیں دیتا۔ سوچتا ہوں تو اس معاملۂ خاص ہی وقت کے معاملۂ تام کی پوری تصویر نمایاں ہو رہی ہے:

کس نمی گویدم از منزلِ آخر خبرے
صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش است

رات ایک ایسی حالت میں کٹی جسے نہ تو اضطراب سے تعبیر کر سکتا ہوں نہ سکون سے۔ آنکھ لگ جاتی تھی تو سکون تھا، کُھل جاتی تھی تو اضطراب تھا۔ گویا ساری رات دو متضاد خوابوں کے دیکھنے میں بسر ہو گئی۔ ایک تعمیر کی نقش آرائی کرتا تھا، دوسرا تخریب کی برہم زنی:

بیداری میانِ نہ و خواب ست زندگی — گردِ تخیّل دو سراب ست زندگی!
از لطمۂ دو موج حبابے دمیدہ است — یعنی طلسمِ نقش بر آب ست زندگی!

---

[1] یہاں ناخوشی سے محض خوشی کی نفی مقصود نہیں ہے بلکہ فارسی کا 'ناخوشی' مقصود ہے۔ فارسی میں بیماری کو ناخوشی کہتے ہیں۔

تین بج کر چند منٹ گزرے تھے کہ آنکھ کھل گئی۔ صبح کی چائے کے لئے سفر میں یہ معمول رہتا ہے کہ رات کو عبداللہ اسپرٹ کا چولھا اور پانی کی کیتلی، پانی بمقدار مطلوب سے بھری ہوئی ٹیبل پر رکھ دیتا ہے۔ چائے دانی اس کے پہلو میں جگہ پاتی ہے کہ بحکم "وضع الشئی فی محلہ" یہی اس کا محل صحیح ہونا چاہیئے۔ مگر فنجان اور شکر دانی کے لیے اس کا قرب ضروری نہ ہوا کہ "وضع الشئی فی غیر محلہ" میں داخل ہو جاتا ہے۔ اگر صبح تین بجے سے چار بجے کے اندر کوئی اسٹیشن آجاتا ہے تو اکثر حالتوں میں عبداللہ آکر چائے دم دے دیتا ہے۔ نہیں آتا تو پھر خود بندہ ہی اپنے دستِ شوق کی کامجویانہ سرگرمیاں کام میں لانی پڑتی ہیں۔ اکثر حالتوں کی قید اس لیے لگانی پڑی کہ تمام کلیوں کی طرح یہ کلیہ بھی مستثنیات سے خالی نہیں رہے۔ بعض حالتوں میں گاڑی اسٹیشن پر رک بھی جاتی ہے مگر عبداللہ کی صورت نظر نہیں آتی۔ پھر جب نظر آتی ہے تو اس کی معذرتیں میری فکر کاوش آشنا کے لئے ایک دوسرا ہی مسئلہ پیدا کر دیتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نسیم صبح گاہی کا ایک ہی عمل دو مختلف طبیعتوں کے لیے دو متضاد نتیجوں کا باعث ہو جاتا ہے۔ اس کی آمد مجھے بیدار کر دیتی ہے۔ عبداللہ کو اور زیادہ سلا دیتی ہے۔ آلارم کی ٹائم پیس بھی اس کے سرہانے رہنے لگی۔ پھر بھی نتائج کا اوسط تقریباً یکساں ہی رہا۔ معلوم نہیں، آپ اس اشکال کا حل کیا تجویز کریں گے مگر مجھے شیخ شیراز کا بتلایا ہوا حل مل گیا ہے اور اس پر مطمئن ہو چکا ہوں:

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست

در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس!

بہرحال چائے کا سامان حسبِ معمول مرتب اور آمادہ تھا۔ نہیں معلوم آج اسٹیشن کب آئے، اور آئے بھی تو اس کا اطمینان کیسے ہو کہ عبداللہ کی آمد کا قاعدہ کلیہ آج ہی بحالتِ استثنا نمودار نہ ہوگا؟ میں نے دیا سلائی اٹھائی اور چولھا روشن کر دیا۔ اب چائے پی رہا ہوں اور آپ کی یاد تازہ کر رہا ہوں۔ مقصود اس تمام دراز نفسی سے اس کے سوا کچھ نہیں کہ مخاطبت کے لیے تقریبِ سخن ہاتھ آئے:

نفسے بیادِ تو می زنم، چہ عبارت و چہ معانیم

چائے بہت لطیف ہے۔ چین کی بہترین قسموں میں سے ہے۔ رنگ اس قدر ہلکا کہ واہمہ پر اُس کی ہستی مشتبہ ہو جائے۔ گویا ابو نواس والی بات ہوئی کہ:

رقّ الزجاج و رقّت الخمر

فتشابھا، فتشاکل الامر!

کیف اس قدر تند کہ بلا مبالغہ اُس کا ہر فنجان تاآنی کے رطلِ گراں کی یاد تازہ کرے:

ساقی بدہ رطلِ گراں زاں می کہ دہقاں پرورد!

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ چائے کے باب میں میرے بعض اختیارات ہیں۔ میں نے چائے کی لطافت و شیرینی کو تمباکو کی تندی و تلخی سے ترکیب دے کر ایک کیف مرکب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی فوراً ایک سگریٹ بھی سلگا لیا کرتا ہوں۔ پھر اس ترکیبِ خاص کا نقشِ عمل یوں جماتا ہوں کہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چائے کا ایک گھونٹ لوں گا اور متصلاً سگریٹ کا بھی ایک کش لیتا رہوں گا۔ علمی اصطلاح میں اس صورتِ حال کو "علی سبیل التوالی والتعاقب" کہیے۔ اس طرح اس سلسلۂ عمل کی ہر کڑی چائے کے ایک گھونٹ اور سگریٹ کے ایک کش کے باہمی امتزاج سے بتدریج ڈھلتی جاتی ہے اور سلسلہ کار دراز ہوتا رہتا ہے۔ مقدار کے حسنِ تناسب کا انضباط ملاحظہ ہو کہ ادھر فنجان آخری جرعے سے خالی ہوا ادھر تمباکوئے آتش زدہ نے سگریٹ کے آخری خطِ کشیدہ تک پہنچ کر دم لیا۔ کیا کہوں، ان دو اجزائے تند و لطیف کی آمیزش سے کیف و سرور کا کیسا معتدل مزاج ترکیب پذیر ہو گیا ہے۔ جی چاہتا ہے، فیضی کے الفاظ مستعار لوں:

اعتدالِ معانی از من پرس   کہ مزاجِ سخن شناختہ ام!

آپ کہیں گے، چائے کی عادت بجائے خود ایک علت تھی، اس پر مزید علت ہائے ناخرجام کا اضافہ کیوں کیا جائے؟ اس طرح کے معاملات میں امتزاج و ترکیب کا طریقہ

کام میں لانا، علتوں پر علتیں بڑھانا، گویا حکایتِ بادہ و تریاک کو تازہ کرنا ہے۔ میں تسلیم کروں گا کہ یہ تمام خود ساختہ عادتیں بلا شبہہ زندگی کی غلطیوں میں داخل ہیں لیکن کیا کہوں جب کبھی معاملے کے اس پہلو پر غور کیا، طبیعت اس پر مطمئن نہ ہو سکی کہ زندگی کو غلطیوں سے یکسر معصوم بنا دیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روزگارِ خراب میں زندگی کو زندگی بنائے رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ غلطیاں بھی ضرور کرنی چاہئیں:

پیرِ ما گفت خطا در قلمِ صنع نہ رفت
آفریں بر نظرِ پاکِ خطا پوشش باد!

غور کیجئے وہ زندگی ہی کیا ہوئی جس کے دامنِ خشک کو کوئی غلطی تر نہ کر سکے؟ وہ چال ہی کیا جو لڑکھڑاہٹ سے یکسر معصوم ہو؟

تو و قطعِ منازلہا، من و یک لغزشِ پائے!

اور پھر اگر غور و فکر کا ایک قدم اور آگے بڑھایئے تو سارا معاملہ بالآخر وہیں جا کر ختم ہو جائے گا جہاں کبھی عارفِ شیراز نے اسے دیکھا تھا:

بیا کہ رونقِ ایں کارخانہ کم نہ شود
ز زُہدِ ہمچو توئی یا بفسقِ ہمچو منی!

اور اگر پوچھئے کہ پھر کامرانیِ عمل کا معیار کیا ہوا؟ اگر یہ آلودگیاں راہ میں مخل نہ سمجھی گئیں؟ تو اس کا جواب وہی ہے جو عرفاءِ طریقت نے ہمیشہ دیا ہے:

ترکِ ہمہ گیر و آشنائے ہمہ باش

یعنی ترک و اختیار، دونوں کا نقشِ عمل اس طرح ایک ساتھ بٹھایئے کہ آلودگیاں ہی اُن تر کریں مگر دامن پکڑ نہ سکیں۔ اس راہ میں کانٹوں کا دامن سے اُلجھنا مخل نہیں ہوتا، دامن گیر ہونا مخل ہوتا ہے۔ کچھ ضروری نہیں کہ آپ اس ڈر سے ہمیشہ اپنا دامن بھینچے رہیں کہ کہیں بھیگ نہ جائے۔ بھیگتا ہے تو بھیگنے دیجیے لیکن آپ کے دست و بازو میں یہ طاقت ضرور ہونی چاہیے کہ جب چاہا، اس طرح نچوڑ کے رکھ دیا کہ آلودگی کی ایک بوند بھی باقی نہ رہی۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

یہاں کامرانی سود و زیاں کی کاوش میں نہیں ہے بلکہ سود و زیاں سے آسودہ حال رہنے میں ہے۔ نہ تو تر دامنی کی گرانی محسوس کیجیے نہ خشک دامنی کی سبک سری۔ نہ آلودہ دامنی پر پریشان حالی ہو، نہ پاک دامنی پر سر گرانی:

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در اقلیم عشق
روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست!

آپ کو ایک واقعہ سناؤں۔ شاید رشتۂ سخن کی ایک گرہ اس سے کھل جائے۔ ۱۹۲۱ء میں جب مجھے گرفتار کیا گیا تو مجھے معلوم تھا کہ قید خانے میں تمباکو کے استعمال کی اجازت نہیں۔ مکان سے جب چلنے لگا تو ٹیبل پر سگرٹ کیس دھرا تھا۔ عادت کے زیر اثر پہلے ہاتھ بڑھا کہ اسے جیب میں رکھ لوں، پھر صورتِ حال کا احساس ہوا تو ترک کیا لیکن پولیس کمشنر نے جو گرفتاری کا وارنٹ لے کر آیا تھا، بہ اصرار کہا ضرور جیب میں رکھ لو۔ میں نے رکھ لیا۔ اس میں دس سگرٹ تھے۔ ایک کمشنر پولیس کے آفس میں پیا۔ دوسرا راستے میں سلگایا۔ دو ساتھیوں کو پیش کیے۔ چھ باقی رہ گئے تھے کہ پریسیڈنسی جیل علی پور پہنچا۔ جیل کے دفتر سے جب اندر جانے لگا تو خیال ہوا۔ اس جیب کے وبال سے سبک جیب ہو کر اندر قدم رکھوں تو بہتر ہے۔ میں نے کیس نکالا اور مع سگرٹوں کے جیلر کی نذر کر دیا۔ پھر اس دن سے لے کر دو برس تک سگرٹ کے ذائقے سے کام و دہن آشنا نہیں ہوا۔ ساتھیوں میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جن کے پاس سگرٹ کے ذخیرے موجود رہتے تھے اور قید خانے کا احتساب عمداً چشم پوشی کرتا۔ بعض شربُ الیہود[1] کا طریقہ کام میں لاتے تھے:

شربُ الیہود کرتے ہیں نصرانیوں میں ہم!

بعضوں کی جراتِ رندانہ اس قید و بند کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ

[1] اسلامی حکومت میں یہودی پوشیدہ شراب بناتے تھے اور بیچتے تھے۔ اس لیے پوشیدہ شراب پینے کے معنی میں شربُ الیہود کی اصطلاح رائج ہو گئی۔

ولا تسقنی سراً، فقد امکن الجہر[1]!

پر عمل کرتے تھے۔ مجھے یہ حال معلوم تھا مگر اپنے توبۂ اضطرار پر کبھی پشیمان نہیں ہوا۔ کئی مرتبہ گھر سے سگرٹ کے ڈبے آئے اور میں نے دوسروں کے حوالے کر دیئے:

خوشم کہ توبۂ من نرخِ بادہ ارزاں کرد!

سرگزشت کا اصلی واقعہ سنئے۔ جس دن علی الصباح مجھے رہا کیا گیا تو قید خانے کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ نے اپنا سگرٹ کیس نکالا اور ازراہِ تواضع مجھے بھی پیش کیا۔ یقین کیجئے جس درجے کے عزم کے ساتھ دو سال پہلے سگرٹ ترک کیا تھا۔ اتنے ہی درجے کی آمادگی کے ساتھ یہ پیش کش قبول بھی کر لی۔ نہ ترک میں دیر لگی تھی نہ اب اختیار میں جھجک ہوئی نہ محرومی پر ماتم ہوا، نہ حصول پر نشاط ہوا۔ ترک کی تلخ کامی نے جو مزہ دیا تھا وہی اب اختیار کی حلاوت میں محسوس ہونے لگا تھا:

حریفِ ساقی و دُردی نہ، خطا ایں جاست
تمیزِ ناخوش و خوش می کنی، بلا ایں جاست

۱۹۲۱ء کے بعد پھر تین مرتبہ قید و بند کا مرحلہ پیش آیا لیکن ترک کی ضرورت پیش نہ آئی کیونکہ سگرٹ کے ڈبے میرے سامان میں ساتھ گئے۔ وہ دیکھے گئے مگر روکے نہیں گئے۔ اگر روکے جاتے تو پھر ترک کر دیتا۔

اب قلم کی سیاہی جواب دینے لگی ہے اس لئے رک جاتا ہوں۔

قلم ایں جا رسید و سر بشکست

ابوالکلام

---

[1] پورا شعر یہ ہے:

الا فاسقنی خمراً، وقل لی ھی الخمر ولا تسقنی سراً فقد امکن الجہر

"مجھے شراب پلا، اور یہ کہہ کر پلا کہ یہ شراب ہے۔ مجھے چھپا کر نہ پلا کیونکہ اب کھل کر پینا ممکن ہو گیا ہے۔"

داستانِ بے ستون و کوہ کن

قلعۂ احمد نگر

۱۰ اگست ۱۹۴۲ء

از ساز و برگِ قافلۂ بے خوداں مپرس
بے نالہ می رود جرسِ کاروانِ ما

صدیق مکرّم!

کل صبح تک وسعت آبادِ بمبئی میں فرصتِ تنگ، حوصلہ کی بے مائگی کا یہ حال تھا کہ ۳ اگست کا لکھا ہوا مکتوب بھی اجمل خاں صاحب کے حوالے نہ کر سکا کہ آپ کو بھیج دیں لیکن آج قلعۂ احمد نگر کے حصارِ تنگ میں اس کے حوصلۂ فراخ کی آسودگیاں دیکھیے کہ جی چاہتا ہے، دفتر کے دفتر سیاہ کر دوں:

وسعتے پیدا کن اے صحرا کہ امشب در غمش
لشکرِ آہِ من از دل خیمہ بیروں می زند

۹ مہینے ہوئے، ۴ دسمبر ۱۹۴۱ء کو نینی کے مرکزی قید خانے کا دروازہ میرے لیے کھولا گیا تھا۔ کل ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو ساڑھے نو بجے قلعۂ احمد نگر کے حصارِ کہنہ کا نیا پھاٹک میرے پیچھے بند کر دیا گیا۔ اس کارخانۂ ہزار شیوہ و رنگ میں کتنے ہی دروازے کھولے جاتے ہیں تاکہ بند ہوں، اور کتنے ہی بند کیے جاتے ہیں تاکہ کھلیں۔ نو ماہ کی مدت بظاہر کوئی بڑی مدت نہیں معلوم ہوتی:

دو کروٹیں ہیں عالمِ غفلت میں خواب کی

لیکن سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تاریخ کی ایک پوری داستان گزر چکی:

چوں صفحہ تمام شد، ورق برگردد

نئی داستان جو شروع ہو رہی ہے، معلوم نہیں مستقبل اسے کب اور کس طرح ختم کرے گا:

فریبِ جہاں قصۂ روشن است

ببین تا چہ زاید، شب آبستن است

۴ راگست کو بمبئی پہنچا تو انفلوئنزا کی حرارت اور سرگرانی کا اضمحلال بھی میرے ساتھ تھا۔ تاہم پہنچتے ہی کاموں میں مشغول ہو جانا پڑا۔ طبیعت کتنی ہی بے کیف ہو لیکن گوارا نہیں کرتی کہ اوقات کے مقررہ نظام میں خلل پڑے۔ ۵ سے ۷ راگست تک ورکنگ کمیٹی کے اجلاس ہوتے رہے۔ ۷ کی دوپہر سے آل انڈیا کمیٹی شروع ہوئی۔ معاملات کی رفتار ایسی تھی کہ کارروائی تین دن تک پھیل سکتی تھی اور مقامی کمیٹی نے تین ہی دن کا انتظام بھی کیا تھا۔ لیکن میں نے کوشش کی کہ دو دن سے زیادہ پھیلنے نہ پائے۔ ۸ کو دو بجے سے رات کے گیارہ بجے تک بیٹھنا پڑا، لیکن کارروائی ختم کر کے اٹھا:

کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ

ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

تھکا ماندہ قیام گاہ پر پہنچا تو صاحبِ مکان کو منتظر اور کسی قدر متفکر پایا۔ یہ صاحب کچھ عرصے سے بیمار ہیں اور ایک طرح کی دماغی الجھن میں مبتلا رہتے ہیں۔ میں اُن سے وقت کے معاملات کا تذکرہ بچایا کرتا تھا تاکہ اُن کی دماغی الجھن اور زیادہ نہ بڑھ جائے۔ وہ ورکنگ کمیٹی کی ممبری سے بھی مستعفی ہو چکے تھے اور اگرچہ میں نے ابھی تک اُن کا استعفا منظور نہیں کیا ہے لیکن اُنھیں کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کے لئے کہا بھی نہیں۔ وہ کہنے لگے۔ فلاں شخص شام کو آیا تھا۔ کئی گھنٹے منتظر رہ کر ابھی ابھی گیا ہے اور یہ پیام دے گیا ہے کہ "گرفتاری کی افواہیں غلط نہ تھیں۔ باوثوق ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ تمام انتظامات کر لئے گئے ہیں۔ آج رات کسی وقت یہ معاملہ ضرور پیش آئے گا۔" دو ہفتے سے گرفتاری کی افواہیں دہلی سے کلکتہ تک ہر شخص کی زبان پر تھیں۔ میں سنتے سنتے تھک گیا تھا۔

یا وفا، یا خبرِ وصل تو، یا مرگِ رقیب
بازیِ چرخ ازیں یک دو سہ کارے بکند

اور کچھ اس بات کا بھی خیال تھا کہ ان کی ماؤف طبیعت کو اس طرح کی فکروں سے پریشان نہ ہونے دوں۔ میں نے جھنجھلا کر کہا جس طرح کے حالات درپیش ہیں ان میں اس طرح کی افواہیں ہمیشہ اڑا ہی کرتی ہیں۔ ایسی خبروں کا اعتبار کیا؟ اور پھر اگر واقعی ایسا ہونے والا ہے تو اِن باتوں میں وقت خراب کیوں کریں؟ مجھے جلد کچھ کھا کر سو جانے دیجیے کہ آدھی رات جو اب باقی رہ گئی ہے، ہاتھ سے نہ جائے اور چند گھنٹے آرام کر لوں:

گر غم خورم خوشش نہ بُوَد، بہ کہ مے خورم!

حسبِ معمول چار بجے اٹھا لیکن طبیعت تھکی ہوئی اور سر میں سخت گرانی تھی۔ میں نے جن اسپرین (Genespirine) کی دو گولیاں مُنہ میں ڈال کر چائے پی اور قلم اُٹھایا کہ بعض ضروری خطوں کا مسودہ لکھ لوں جو رات کی تجویز کے ساتھ پریذیڈنٹ روزویلٹ وغیرہ کو بھیجنا طے پایا تھا۔ سامنے سمندر میں بھاٹا ختم ہو چکا تھا اور اس کے ختم ہوتے ہی رات کی اُمس بھی ختم ہو گئی تھی۔ اب جوار کی لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں اور ہوا کے ٹھنڈے اور نم آلود جھونکے بہنے لگی تھیں۔ کچھ تو جن اسپرین نے کام کیا ہوگا۔ کچھ نسیمِ صبحگاہی کے ان شفا بخش جھونکوں نے چارہ فرمائی کی۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے سر کی گرانی کم ہو رہی ہے۔ پھر افاقے کے اس احساس نے اچانک غنودگی کی سی حالت طاری کر دی:

نسیمِ صبح، تیری مہربانی

بے اختیار ہو کر قلم رکھ دیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ پھر اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے سڑک پر سے موٹر کاریں گزر رہی ہوں۔ پھر کیا دیکھتا ہوں کہ کئی کاریں مکان کے احاطے میں داخل ہو گئی ہیں اور اُس بنگلے کی طرف جا رہی ہیں جو مکان کے پچھواڑے میں واقع ہے اور جس میں صاحبِ مکان کا لڑکا دھیرو رہتا ہے۔ پھر خیال ہوا، میں خواب

دیکھ رہا ہوں اور اس کے بعد گہری نیند میں ڈوب گیا:

زہے مراتب خوابے کہ بہ ز بیداری ست!

شاید اس حالت میں دس بارہ منٹ گزرے ہوں گے کہ کسی نے میرا پیر دبایا۔ آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں، دھیرو ایک کاغذ ہاتھ میں لیے کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے دو فوجی افسر ڈپٹی کمشنر پولیس کے ساتھ آئے ہیں اور یہ کاغذ لائے ہیں۔ گو اتنی ہی خبر کہنے کے لئے کافی تھی مگر میں نے کاغذ لے لیا کہ دیکھوں:

کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

میں نے دھیرو سے کہا کہ مجھے ڈیڑھ گھنٹہ تیاری میں لگے گا۔ ان سے کہہ دو کہ انتظار کریں۔ پھر غسل کیا۔ کپڑے پہنے، چند ضروری خطوط لکھے اور باہر نکلا تو پانچ بجکر پینتالیس منٹ ہوئے تھے:

کار مشکل بود، ما بر خویشتن آساں کردہ ایم!

کار باہر نکلی تو صبح مسکرا رہی تھی۔ سامنے دیکھا تو سمندر اُچھل اُچھل کر ناچ رہا تھا۔ نسیمِ صبح کے جھونکے احاطے کی روشوں میں پھرتے ہوئے ملے۔ یہ پھولوں کی خوشبو چُن چُن کر جمع کر رہے تھے اور سمندر کو بھیج رہے تھے کہ اپنی ٹھوکروں سے فضا میں پھیلاتا رہے۔ ایک جھونکا کار میں سے ہو کر گزرا تو بے اختیار حافظ کی غزل یاد آگئی:

صبا بوقتِ سحر بوئے ز زلفِ یار می آورد

دلِ شوریدۂ ما را ز نو در کار می آورد!

کار وکٹوریہ ٹرمینس اسٹیشن پر پہنچی تو اس کا پچھلا حصہ ہر طرف سے فوجی پہرے کے حصار میں تھا اور اگرچہ لوکل ٹرینوں کی روانگی کا وقت گزر رہا تھا لیکن مسافروں کا داخلہ بند کر دیا گیا تھا۔ صرف ایک پلیٹ فارم پر کچھ چل پہل دکھائی دیتی تھی۔ کیونکہ ایک انجن ریسٹورنٹ کار کو دھکیل دھکیل کر ایک ٹرین سے جوڑ رہا تھا۔ معلوم ہوا یہی کاروان خاص ہے جو ہم زندانیوں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ گاڑیاں کوریڈور کیریج Corridor-Carriage قسم کی لگائی گئی تھیں جو

آپس میں جڑ جاتی ہیں اور آدمی ایک سرے سے دوسرے سرے تک اندر ہی اندر چلا جا سکتا ہے۔ ٹرین کے اندر گیا تو معلوم ہوا گرفتاریوں کا معاملہ پوری وسعت کے ساتھ عمل میں لایا گیا ہے۔ بہت سے آچکے ہیں جو نہیں آئے۔ وہ آتے جاتے ہیں،

بہت آگے گئے باقی جو ہیں طیار بیٹھے ہیں!

بعض احباب جو مجھ سے پہلے پہنچائے جا چکے ہیں۔ ان کے چہروں پر بے خوابی اور ناوقت کی بیداری بول رہی تھی۔ کوئی کہتا تھا، رات دو بجے سویا اور چار بجے اٹھا دیا گیا۔ کوئی کہتا تھا، بہ مشکل ایک گھنٹہ نیند کا ملا ہو گا۔ میں نے کہا، معلوم نہیں، سوئی ہوئی قسمت کا کیا حال ہے؟ اسے بھی کوئی جگانے کے لیے پہنچا یا نہیں؟

درازیٔ شب و بیداریٔ من ایں ہمہ نیست

ز بختِ من خبر آرید تا کجا خفتست!

بہرحال وقت کی گرمجوشیوں میں یہ شکایتیں مخل نہیں ہو سکتی تھیں چونکہ ریسٹورنٹ کار لگ چکی تھی اور چائے کے لیے پوچھا گیا تھا اس لیے کوئی جگا تھا لیکن پھر منگوائی اور ان نیند کے متوالوں کو دعوت دی کہ اس جامِ صبح گاہی سے بادۂ دوشینہ کا خمار اتاریں:

بہوش سے بچہ سبک ردی اے حریفِ مدام

علی الخصوص دریں دم کہ سر گراں داری!

یہاں 'بادۂ دوشینہ' کی ترکیب محض جامِ صبح گاہی کی مناسبت سے زبانِ قلم پر طاری ہو گئی۔ مگر غور کیجیے، کتنی مطابقِ حال واقع ہوئی ہے؟ صرف ایک شام اور صبح کے اندر صورتِ حال کیسی منقلب ہو گئی؟ کل شام جو بزمِ کیف و سرور آراستہ ہوئی تھی اُس کی بادہ گساریوں اور سیہ مستیوں نے دوپہر رات تک طول کھینچا تھا لیکن اب صبح کے وقت دیکھیے تو:

نے وہ سرور و سوز، نہ جوش و خروش ہے

رات کی تر دماغیوں کی جگہ صبح کی سرگرانیوں نے لے لی اور مجلس دوشیں کی دست افشانیوں اور

پا کو بیوں کے بعد جب آنکھ کھلی تو اب صبحِ خمار کی افسردہ جمائیوں کے سوا باقی نہیں رہا تھا:

خمیازہ سنجِ تہمتِ عیشِ رمیدہ ایم
مے آں قدر نہ بود کہ رنجِ خمار بُرد!

رات کی کیفیتیں جتنی تند و تیز ہوتی ہیں، صبح کا خمار بھی اتنا ہی سخت ہوتا ہے۔ اگر رات کی سیہ مستیوں کے بعد اب صبحِ خمار کی تلخ کامیوں سے سابقہ پڑا تھا تو ایسا ہونا ناگزیر تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم شکوہ سنج ہوتے۔ البتہ حسرت اُس کی رہ گئی کہ جب ہونا یہی تھا، تو کاش! جی کی ہوس تو پوری نکال لی ہوتی اور پئے تلے پیمانوں کی جگہ شیشوں کے شیشے لنڈھا دیئے ہوتے۔ خواجہ میر دردؔ کیا خوب کہہ گئے ہیں:

کبھی خوش بھی کیا ہے جی کسی رندِ شرابی کا
بھڑ اٹھے مُنہ سے مُنہ ساقی ہمارا اور گلابی کا

ساڑھے سات بج چکے تھے کہ ٹرین نے کوچ کی سیٹی بجائی۔ حافظ کی مشہور غزل کا یہ شعر کم از کم سینکڑوں مرتبہ تو پڑھا اور سُنا ہوگا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کا اصلی لطف اسی وقت آیا:

کس نہ دانست کہ منزل گہِ مقصود کجا ست
ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے مے آید!

بمبئی میں جو افواہیں گرفتاری سے پہلے پھیلی ہوئی تھیں اُن میں احمد نگر کے قلعہ اور پُونا کے آغا خاں پیلس کا نام تعین کے ساتھ لیا جا رہا تھا جب کلیان اسٹیشن سے ٹرین آگے بڑھی اور پُونا کی راہ اختیار کی تو سب کو خیال ہوا، غالباً منزلِ مقصود پُونا ہی ہے لیکن جب پونا قریب آیا تو ایک غیر آباد اسٹیشن پر صرف بعض رفقا اتار لئے گئے۔ اور بمبئی کے مقامی قافلے کو بھی اُترنے کے لئے کہا گیا، مگر ہم سے کچھ نہیں کہا گیا اور صدائے جرس نے پھر کوچ کا اعلان کر دیا:

جرس فریاد می دارد کہ بربندید محمل ہا

اب احمد نگر ہر شخص کی زبان پر تھا کیونکہ اگر پونا میں ہم نہیں اتارے گئے تو پھر اس رُخ پر احمد نگر کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ ایک صاحب نے جو انہی اطراف کے رہنے والے ہیں بتلایا کہ پونا اور احمد نگر کا باہمی فاصلہ ستر اور اسّی میل سے زیادہ نہیں اس لئے زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی گھنٹے کا سفر اور سمجھنا چاہیئے مگر میرا خیال دوسری ہی طرف جا رہا تھا۔ احمد نگر یقیناً دُور نہیں ہے۔ بہت جلد آجائے گا مگر احمد نگر پر سفر ختم کب ہوتا ہے؟ احمد نگر سے تو شروع ہوگا۔ بے اختیار ابوالعلاء معرّیؔ کا لامیہ یاد آگیا:

فیا دارھا بالخیف، ان مزارھا
قریبٌ، ولاکن دون ذلک اھوال

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ملک کے تقریباً تمام تاریخی مقامات دیکھنے میں آئے۔ مگر قلعۂ احمد نگر دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ جب بمبئی میں تھا تو قصد بھی کیا تھا مگر پھر حالات نے مہلت نہ دی۔ یہ شہر بھی ہندوستان کے اُن خاص مقامات میں ہے جن کے ناموں کے ساتھ صدیوں کے انقلابوں کی داستانیں وابستہ ہو گئی ہیں۔ پہلے یہاں بھینگر نامی ندی کے کنارے ایک اسی نام کا گاؤں آباد تھا۔ پندرھویں صدی مسیحی کے اواخر میں جب دکن کی بہمنی حکومت کمزور پڑ گئی تو ملک احمد نظام الملک بحیری نے علمِ استقلال بلند کیا اور بھینگر کے قریب احمد نگر کی بنیاد ڈال کر جنیر کی جگہ اُسے حاکم نشین شہر بنایا۔ اُس وقت سے نظام شاہی مملکت کا دارالحکومت یہی مقام بن گیا۔ فرشتہ، جس کا خاندان مازندران سے آکر یہیں آباد ہوا تھا، لکھتا ہے چند برسوں کے اندر اس شہر نے وہ رونق و وسعت پیدا کرلی کہ بغداد اور قاہرہ کا مقابلہ کرنے لگا تھا۔

کس پائمال آفتِ فرسودگی مباد
دیروزہ ریگ بادیہ آئینہ خانہ بود!

ملک احمد نے جو قلعہ تعمیر کیا تھا اس کا حصار مٹی کا تھا۔ اس کے لڑکے برہان نظام شاہ اوّل نے اسے منہدم کر کے از سرِ نو پتھر کا حصار تعمیر کیا اور اسے اس درجہ بلند اور مضبوط بنایا کہ مصر اور ایران تک اُس کی مضبوطی کا غلغلہ پہنچا۔ ۱۸۰۳ء کی دوسری جنگِ مرہٹہ میں جب جنرل ویلزلی نے (جو آگے چل کر ڈیوک آف ولنگٹن ہوا) اس کا معائنہ کیا تھا تو اگرچہ تین سو برس کے انقلابات سہہ چکا تھا۔ پھر بھی اس کی مضبوطی میں فرق نہیں آیا تھا۔ اُس نے اپنے مراسلے میں لکھا تھا کہ دکن کے تمام قلعوں میں صرف ویلور کا قلعہ ایسا ہے جسے مضبوطی کے لحاظ سے اس پر ترجیح دی جا سکتی ہے:

کاروانِ رفتہ و اندازۂ جاہش پیداست
زاں نشاں ہا کہ بہ ہر راہگزار افتاد ست

یہی احمد نگر کا قلعہ ہے جس کی سنگی دیواروں پر برہان نظام شاہ کی بہن چاند بی بی نے اپنے عزم و شجاعت کی یادگارِ زمانہ داستانیں کندہ کی تھیں اور جنہیں تاریخ نے پتھر کی سلوں سے اتار کر اپنے اوراقِ دفاتر میں محفوظ کر لیا ہے:

بیفشاں جرعۂ بر خاک و حالِ اہلِ شوکت پرس!
کہ از جمشید و کیخسرو ہزاراں داستاں دارد!

اسی احمد نگر کے معرکوں میں عبدالرحیم خانخاناں کی جوانمردی کا وہ واقعہ نمایاں ہوا تھا جس کی سرگزشت عبدالباقی نہاوندی اور صمصام الدولہ نے ہمیں سنائی ہے۔ جب احمد نگر کی مدد پر بیجاپور اور گولکنڈہ کی فوجیں بھی آ گئیں اور خانخاناں کی قلیل التعداد فوج کو سہیل حبشی کی طاقت ور فوج سے ٹکرانا پڑا تو دولت خاں لودھی نے پوچھا تھا۔ ”چنیں انبوہے در پیش و فتح آسمانی اگر رو نہ دہد، جائے نشاں دہید کہ شمارا دریابیم“ خانخاناں نے جواب دیا تھا ”زیر لاشہا!“

ونحن اناس لا توسط بیننا
لنا الصدر دون العالمین او القبر!

احمد نگر کے نام نے حافظے کے کتنے ہی بھولے ہوئے نقوش یکایک تازہ کر دیئے
ریل تیزی کے ساتھ دوڑی جا رہی تھی۔ میدان کے بعد میدان گزرتے جاتے تھے۔
ایک منظر پر نظر جمنے نہیں پاتی تھی کہ دوسرا منظر سامنے آجاتا تھا اور ایسا ہی ماجرا
میرے دماغ کے اندر بھی گزر رہا تھا۔ احمد نگر اپنی چھ سو برس کی داستانِ کہن لیے ورق
پر ورق اُلٹتا جاتا۔ ایک صفحے پر ابھی نظر جمنے نہ پاتی کہ دُوسرا سامنے آجاتا:

گہے گاہے باز خواں ایں دفترِ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

مجھے خیال ہُوا، اگر ہمارے قیدو بند کے لیے یہی جگہ چُنی گئی ہے تو انتخاب کی
موزونیت پر کلام نہیں۔ ہم خراباتیوں کے لیے کوئی ایسا ہی خرابہ ہونا تھا،

بایک جہاں کدورت، باز ایں خرابہ جا نیست!

دو بجنے والے تھے کہ ٹرین احمد نگر پہنچی۔ اسٹیشن میں سناٹا تھا۔ صرف چند فوجی
افسر ٹہل رہے تھے۔ انہی میں مقامی چھاؤنی کا کمانڈنگ آفیسر بھی تھا جس سے ہمیں
ملایا گیا۔ ہم اترے اور فوراً اسٹیشن سے روانہ ہو گئے۔ اسٹیشن سے قلعے تک سیدھی
سڑک چلی گئی۔ راہ میں کوئی موڑ نہیں ملی۔ میں سوچنے لگا کہ مقاصد کے سفر کا بھی ایسا ہی
حال ہے۔ جب قدم اٹھا دیا تو پھر کوئی موڑ نہیں ملتی۔ اگر مڑنا چاہیں تو صرف پیچھے ہی کی
طرف مُڑ سکتے ہیں لیکن پیچھے مڑنے کی راہ یہاں پہلے سے بند ہو جاتی ہے؛

ہاں، رہِ عشق ست، کہ گشتن ندارد و باز گشت
جرم را ایں جا عقوبت ہست، استغفار نیست!

اسٹیشن سے قلعے تک کی مسافت زیادہ سے زیادہ دس بارہ منٹ کی ہو گی۔
قلعے کا حصار پہلے کسی قدر فاصلے پر دکھائی دیا پھر یہ فاصلہ چند لمحوں میں طے ہو گیا۔
اب اس دنیا میں جو قلعے سے باہر ہے اور اس میں جو قلعے کے اندر ہے صرف ایک
قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ چشم زدن میں یہ بھی طے ہو گیا اور ہم قلعے کی دنیا میں داخل ہو گئے۔

غور کیجیے تو زندگی کی تمام مسافتوں کا یہی حال ہے۔ خود زندگی اور موت کا باہمی فاصلہ بھی ایک قدم سے زیادہ نہیں ہوتا۔

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دُنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا!

قلعے کی خندق، جس کی نسبت ابوالفضل نے لکھا ہے کہ چالیس گز چوڑی اور دس گز گہری تھی اور جسے ۱۸۰۳ء میں جنرل ویلزلی نے ایک سو آٹھ فٹ تک چوڑا پایا تھا، مجھے دکھائی نہیں دی۔ غالباً جس رُخ سے ہم داخل ہوئے اُس طرف پاٹ دی گئی ہے۔ اُس کا بیرونی کنارہ، جو کھدائی کی خاک ریز سے اس قدر اونچا کر دیا گیا تھا کہ قلعے کی دیوار چھپ گئی تھی۔ وہ بھی اس رُخ پر نمایاں نہ تھا۔ ممکن ہے کہ وہ صورت اب باقی نہ رہی ہو۔

قلعے کے اندر پہلے موٹر لاریوں کی قطار ملی پھر ٹینکوں کی۔ اس کے بعد ایک احاطے کے سامنے، جو قلعے کی عام سطح سے چودہ پندرہ فٹ بلند ہوگا اور اس لیے چڑھائی پر واقع ہے، کاریں رُک گئیں اور ہمیں اترنے کیلئے کہا گیا۔ یہاں انسپکٹر جنرل پولیس بمبئی نے جو ہمارے ساتھ آیا تھا، ہمارے ناموں کی فہرست کمانڈنگ آفیسر کے حوالے کی۔ وہ فہرست لے کر دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ یہ گویا ہماری سپردگی کی باضابطہ رسم تھی۔ اب ہماری حفاظت کا سررشتہ حکومتِ بمبئی کے ہاتھ سے نکل کر فوجی انتظام کے ہاتھ آگیا اور ہم ایک دُنیا سے نکل کر دوسری دُنیا میں داخل ہو گئے۔

در جستجوئے ما نہ کشی زحمتِ سراغ
جائے رسیدہ ایم کہ عنقا نمی رسد

دروازے کے اندر داخل ہوئے تو ایک مستطیل احاطہ سامنے تھا۔ غالباً دو سو فٹ لمبا اور ڈیڑھ سو فٹ چوڑا ہوگا۔ اس کے تینوں طرف بارک کی طرح کمروں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ کمروں کے سامنے برآمدہ ہے اور بیچ میں کھلی جگہ ہے۔ یہ اگرچہ اتنی وسیع نہیں کہ

اسے میدان کہا جا سکے۔ تاہم احاطے کے زندانیوں کے لیے میدان کا کام دے سکتی ہے۔ آدمی کمرے سے باہر نکلے گا تو محسوس کرے گا کہ کھلی جگہ میں آ گیا۔ کم از کم اتنی جگہ ضرور ہے کہ جی بھر کے خاک اڑائی جا سکتی ہے:

سر پہ ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

صحن کے وسط میں ایک پختہ چبوترہ ہے جس میں جھنڈے کا مستول نصب ہے مگر جھنڈا اتار لیا گیا ہے۔ میں نے مستول کی بلندی دیکھنے کے لئے سر اٹھایا تو وہ اشارہ کر رہا تھا:

یہیں ملیں گے مجھے نالۂ بلند ترے!

احاطے کے شمالی کنارے میں ایک پرانی ٹوٹی قبر ہے۔ نیم کے ایک درخت کی شاخیں اس پر سایہ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں مگر کامیاب نہیں ہوتیں۔ قبر کے سرہانے ایک چھوٹا سا طاق ہے۔ طاق اب چراغ سے خالی ہے مگر محراب کی رنگت بول رہی ہے کہ یہاں کبھی ایک دیا جلا کرتا تھا:

اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں!

معلوم نہیں کس کی قبر ہے؟ چاند بی بی کی ہو نہیں سکتی کیونکہ اس کا مقبرہ قلعے سے باہر ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ بہرحال کسی کی ہو مگر کوئی مجہول الحال شخصیت نہ ہو گی، ورنہ جہاں قلعے کی تمام عمارتیں گرائی گئیں۔ وہاں اسے بھی گرا دیا ہوتا۔ سبحان اللہ! اس روزگارِ خراب کی ویرانیاں بھی اپنی آبادیوں کے کرشمے رکھتی ہیں! ان پرانی قبروں کو ویران بھی ہونا تھا تو اس لئے کہ کبھی ہم زندانیانِ خراباتی کے شور و ہنگامہ سے آباد ہو!

کشتوں کا تیری چشمِ سیہ مست کے مزار
ہو گا خراب بھی تو خرابات ہووے گا!

مغربی رُخ کے تمام کمرے کھلے اور چشم براہ تھے۔ قطار کا پہلا کمرہ میرے حصے

میں آیا۔ میں نے اندر قدم رکھتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ چارپائی پر جو کہ بچھی ہوئی تھی، دراز ہو گیا تو مہینے کی نیند اور تھکن میرے ساتھ بستر پر گری :

ماگوشہ را نہ بہرِ قناعت گرفتہ ایم
تن پروری بہ گوشۂ خاطر رسیدہ است

تقریباً تین بجے سے چھ بجے تک سوتا رہا۔ پھر رات کو نو بجے تکیے پر سر رکھا تو صبح تین بجے آنکھ کھولی :

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

تین بجے اُٹھا تو تازہ دم اور چست و چاق تھا۔ نہ سر میں گرانی تھی۔ نہ انفلوئنزا کا نام و نشان تھا۔ فوراً بجلی کا آلہ حرارت کام میں لایا اور چائے دم دی۔ اب جام و صراحی سامنے دھرا بیٹھا ہوں۔ آپ کو مخاطب تصور کرتا ہوں اور یہ داستانِ بے ستون و کوہکن سنا رہا ہوں :

شیریں تر از حکایتِ مانیست قصۂ
تاریخِ روزگار سراپا نوشتہ ایم!

مہینوں سے ایسی گہری اور آسودہ نیند نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل صبح بمبئی سے چلتے ہوئے جو دامن جھاڑنا پڑا تھا تو علائق کی گرد کے ساتھ مہینوں کی ساری تھکن بھی نکل گئی تھی۔ یغمائے جندقی کیا خوب کہہ گیا ہے :

غلط گفتی "چرا سجادۂ تقویٰ گرو کردی؟"
بہ زُہد آلودہ بودم، گر نمی کردم چہ می کردم!

یہ اُسی غزل کا شعر ہے جس کا ایک اور شعر جو مجتہد کاشان کی نسبت کہا تھا، بہت مشہور ہو چکا ہے :

ز شیخِ شہر جاں بُردم بہ تزویرِ مسلمانی   مدارا گر بہ ایں کافر نمی کردم چہ می کردم!

ردیف کا نبھانا آسان نہ تھا مگر دیکھئے کس طرح بول رہی ہے؟ بول نہیں رہی ہے چیخ رہی ہے۔ میں بھی اس وقت چائے کے فنجان پر فنجان لنڈھائے جاتا ہوں اور اس کا مطلع دُہرا رہا ہوں:

ز ساغر گر دماغے تر نمی کردم، چہ می کردم!

خدارا داد دیجئے۔ نظر بہ حالاتِ موجودہ یہاں چہ می کردم کیا قیامت ڈھا رہا ہے؟ گویا یہ مصرعہ خاص اسی موقع کے لئے کہا گیا تھا مگر یوں پتہ نہیں چلے گا۔ "چہ می کردم" پر زیادہ سے زیادہ زور دے کر پڑھئے۔ پھر دیکھئے صورتِ حال کی پوری تصویر کس طرح سامنے نمودار ہو جاتی ہے۔

یہ جو کچھ لکھ رہا ہوں، یکسر ہرزہ گوئی اور لاطائل نویسی سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم، بحالتِ موجودہ میری صدائیں آپ تک پہنچ بھی سکیں گی یا نہیں؟ تاہم کیا کروں افسانہ سرائی سے اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکتا۔ یہ وہی حالت ہوئی جسے مرزا غالب نے ذوقِ خامہ فرسائی ستم زدگی سے تعبیر کیا تھا:

مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

ابوالکلام

مکتوب

قلعۂ احمد نگر
۱۱؍ اگست ۱۹۴۲ء

صدیق مکرم!

قید و بند کی زندگی کا یہ چھٹا تجربہ ہے۔ پہلا تجربہ ۱۹۱۶ء میں پیش آیا تھا جب مسلسل چار برس تک قید و بند میں رہا۔ پھر ۱۹۲۱ء، ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۰ء میں یکے بعد دیگرے یہی منزل پیش آتی رہی اور اب پھر اسی منزل سے قافلۂ بادپیمائے عمر گزر رہا ہے:

بازمی خواہم ز سر گیرم رہِ بیہودہ را!

پچھلی پانچ گرفتاریوں کی اگر مجموعی مدت شمار کی جائے تو سات برس آٹھ مہینے سے زیادہ نہیں ہوگی۔ عمر کے ترپن برس جو گزر چکے ہیں۔ اُن سے یہ مدت وضع کرتا ہوں تو ساتویں حصّے کے قریب پڑتی ہے۔ گویا زندگی کے ہر سات دن میں ایک دن قید خانہ کے اندر گزارا۔ تورات کے احکامِ عشرہ میں ایک حکم سبت کے لئے بھی تھا یعنی ہفتہ کا ساتواں دن تعطیل کا مقدس دن سمجھا جائے۔ مسیحیت اور اسلام نے بھی یہ تعطیل قائم رکھی۔ سو ہمارے حصہ میں بھی سبت کا دن آیا مگر ہماری تعطیلیں اس طرح بسر ہوئیں گویا خواجہ شیراز کے دستور العمل پر کاربند رہے:

نہ دو ہفتہ کہ ہمہ سالہ مے پرستی کن ـ سہ ماہ مے خور و نُہ ماہ پارسا می باش

---

[1] یہ مکتوب ۱۱؍ اگست ۱۹۴۲ء کو لکھا تھا۔ اس کے بعد قید کے دو برس گیارہ مہینے اور گزر گئے مجموعی مدت سات برس آٹھ مہینے کی جگہ دس برس سات ماہ ہوگئی۔ اس اضافے کے خلاف کوئی شکوہ کرنا نہیں چاہتا۔ البتہ اس کا افسوس ضرور ہے کہ وہ ساتویں حصے کی مناسبت کی بات مختل ہوگئی اور سبت کی تعطیل کا معاملہ ہاتھ سے نکل گیا۔

وقت کے حالات پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس تناسب پر غور کرتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے۔ اس پر نہیں کہ سات برس آٹھ مہینے قید و بند میں کیوں کٹے؟ اس پر کہ صرف سات برس آٹھ مہینے ہی کیوں کٹے؟

نالہ از بہرِ رہائی نہ کند مرغِ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود!

وقت کے جو حالات ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ اُن میں اس ملک کے باشندوں کے لیے زندگی بسر کرنے کی دو ہی راہیں رہ گئی ہیں۔ بے حسی کی زندگی بسر کریں یا احساسِ حال کی۔ پہلی زندگی ہر حال میں اور ہر جگہ بسر کی جا سکتی ہے مگر دوسری کے لیے قید خانے کی کوٹھڑی کے سوا اور کہیں جگہ نہ نکل سکی۔ ہمارے سامنے بھی دونوں راہیں کھلی تھیں۔ پہلی ہم اختیار نہیں کر سکتے تھے، ناچار دوسری اختیار کرنی پڑی:

رندِ ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نہ بود
لیک صنم بہ سجدہ در ناصیہ مشترک نخواست!

زندگی میں جتنے جرم کیے اور اُن کی سزائیں پائیں، سوچتا ہوں تو اُن سے کہیں زیادہ تعداد اُن جرموں کی تھی جو نہ کر سکے اور جن کے کرنے کی حسرت دل میں رہ گئی۔ یہاں کردہ جرموں کی سزائیں تو مل جاتی ہیں لیکن ناکردہ جرموں کی حسرتوں کا صلہ کس سے مانگیں؟

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب، اگران کردہ گناہوں کی سزا ہے!

۱۹۱۶ء میں جب یہ معاملہ پیش آیا تو مجھے پہلی مرتبہ موقع ملا کہ اپنی طبیعت کے تاثرات کا جائزہ لوں۔ اس وقت عمر کے صرف ستائیس برس گزرے تھے۔ "الہلال" "البلاغ" کے نام سے جاری تھا۔ دارالارشاد قائم ہو چکا تھا۔ زندگی کی گہری مشغولیتیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ طرح طرح کی سرگرمیوں میں دل اٹکا ہوا

علائق اور رابطوں کی گرانیوں سے بوجھل تھا۔ اچانک ایک دن دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہونا پڑا اور مشغولیت کی ڈوبی ہوئی زندگی کی جگہ قید و بند کی تنہائی اور بے تعلقی اختیار کر لینی پڑی۔ بظاہر اس ناگہانی انقلابِ حال میں طبیعت کے لئے بڑی آزمائش ہونی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہیں ہوئی۔ آباد گھر چھوڑا اور ایک ویرانے میں جا بیٹھ رہا[1]؎

نقصاں نہیں جنوں میں، بلا سے ہو گھر خراب
دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں!

لیکن پھر کچھ عرصے کے بعد جب اس صورتِ حال کا ردِ فعل شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ معاملہ اتنا سہل نہ تھا جتنا ابتدائے حال کی سرگرمیوں میں محسوس ہوا تھا اور اس کی آزمائشیں ابھی گزر نہیں چکیں بلکہ اب پیش آ رہی ہیں۔

جب کبھی اس طرح کا معاملہ یکایک پیش آ جاتا ہے تو ابتدا میں اس کی سختیاں پوری طرح محسوس نہیں ہوتیں کیونکہ طبیعت میں مقاومت کا ایک سخت جذبہ پیدا اور وہ نہیں چاہتا کہ صورتِ حال سے دب جائے۔ وہ اس کا غالبانہ مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک پُرجوش نشے کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ نشے کی تیزی میں کتنی ہی سخت چوٹ لگے۔ اس کی تکلیف محسوس نہیں ہو گی۔ تکلیف اس وقت محسوس ہو گی جب نشہ اترنے لگے گا اور جماہیاں آنی شروع ہوں گی۔ اس وقت ایسا معلوم ہو گا جیسے سارا جسم درد سے چور چور ہو رہا ہو۔ چنانچہ اس معاملے میں بھی پہلا دور رفتہ جذبات کی خود فراموشیوں کا گزرا۔ علائق کا فوری انقطاع، کاروبار کی ناگہانی برہمی، مشغولیتوں کا یک قلم تعطل، کوئی بات بھی دامنِ دل کو کھینچ نہ سکی کہ کلکتہ سے

---

[1] ۷ اپریل سنہ ۱۹۱۶ء کو حکومتِ بنگال نے ڈیفنس آرڈی ننس کے ماتحت مجھے بنگال سے خارج کر دیا تھا۔ میں رانچی گیا اور شہر سے باہر مورابادی میں مقیم ہو گیا۔ پھر کچھ دنوں بعد مرکزی حکومت نے وہیں قید کر دیا اور اس کا سلسلہ سنہ ۲۰ء تک جاری رہا۔

بہ اطمینان تمام نکلا اور رانچی میں شہر کے باہر ایک غیر آباد حصے میں مقیم ہو گیا لیکن پھر جُوں جُوں دن گزرتے گئے، طبیعت کی بے پروائیاں جواب دینے لگیں اور صورتِ حال کا ایک ایک کانٹا پہلوئے دل میں چبھنے لگا۔ یہی وقت تھا جب مجھے اپنی طبیعت کی اس انفعالی حالت کا مقابلہ کرنا پڑا اور ایک خاص طرح کا سانچا اُس کے لئے ڈھالنا پڑا۔ اُس وقت سے لے کر آج تک کہ چھبیس برس گزر چکے، وہی سانچا کام دے رہا ہے اور اب اس قدر پختہ ہو چکا ہے کہ ٹوٹ جا سکتا ہے مگر لچک نہیں کھا سکتا۔

طالب علمی کے زمانے سے فلسفہ میری دلچسپی کا خاص موضوع رہا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ دلچسپی بھی برابر بڑھتی گئی۔ لیکن تجربے سے معلوم ہوا کہ عملی زندگی کی تلخیاں گوارا کرنے میں فلسفے سے کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ یہ بلاشبہ طبیعت میں ایک طرح کی رواقی Stoical بے پروائی پیدا کر دیتا ہے اور ہم زندگی کے حوادث و آلام کو عام سطح سے کچھ بلند ہو کر دیکھنے لگتے ہیں۔ لیکن اس سے زندگی کے طبعی انفعالات کی گتھیاں سلجھ نہیں سکتیں۔ یہ ہمیں ایک طرح کی تسکین ضرور دے دیتا ہے لیکن اس کی تسکین سر تا سر سلبی تسکین ہوتی ہے۔ ایجابی تسکین سے اس کی جھولی ہمیشہ خالی رہی۔ یہ فقدان کا افسوس کم کر دے گا لیکن حاصل کی کوئی امید نہیں دلائے گا۔ اگر ہماری ساعتیں ہم سے چھین لی گئی ہیں تو فلسفہ ہمیں کلیلہ و دمنہ (پنچ تنتر) کی دانش آموز چڑیا کی طرح نصیحت کرے گا: "لا تأس علی ما فات" جو کچھ کھو چکا اُس پر افسوس نہ کر۔ لیکن کیا اس کھونے کے ساتھ کچھ پانا بھی ہے؟ اس بارے میں وہ ہمیں کچھ نہیں بتاتا کیونکہ بتا سکتا ہی نہیں اور اس لئے زندگی کی تلخیاں گوارا کرنے کے لیے صرف اس کا سہارا کافی نہ ہُوا۔

سائنس عالمِ محسوسات کی ثابت شدہ حقیقتوں سے ہمیں آشنا کرتا ہے اور مادی زندگی کی بے رحم جبریت Physical Determination کی خبر دیتا ہے۔ اس لیے عقیدے کی تسکین اُس کے بازار میں بھی نہیں مل سکتی۔ وہ یقین اور اُمید کے سارے پچھلے چراغ گُل کر دے گا مگر کوئی نیا چراغ روشن نہیں کرے گا۔

پھر اگر ہم زندگی کی ناگواریوں میں سہارے کے لئے نظر اٹھائیں تو کس کی طرف اٹھائیں:

کون ایسا ہے جسے دست ہو دل سازی میں؟
شیشہ ٹوٹے تو کریں لاکھ ہنر سے پیوند!

ہمیں مذہب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی دیوار ہے جس سے ایک دُکھتی ہوئی پیٹھ ٹیک لگا سکتی ہے:

دل شکستہ درآں کوچہ می کنند درست
چنانکہ خود نشناسی کہ از کجا بشکست!

بلاشبہہ مذہب کی وہ پرانی دنیا جس کی مافوق الفطرت کارفرمائیوں کا یقین ہمارے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا۔ اب ہمارے لیئے باقی نہیں رہی۔ اب مذہب بھی ہمارے سامنے آتا ہے تو عقلیت اور منطق کی ایک سادہ اور بے رنگ چادر اوڑھ کر آتا ہے اور ہمارے دلوں سے زیادہ ہمارے دماغوں کو مخاطب کرنا چاہتا ہے۔ تاہم اب بھی تسکین اور یقین کا سہارا مل سکتا ہے تو اسی سے مل سکتا ہے:

درِ دیگرے بنما کہ من بکجا روم چو برانیم؟

فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا اور پھر اسے بند نہیں کر سکے گا۔ سائنس ثبوت دے گا مگر عقیدہ نہیں دے سکے گا۔ لیکن مذہب ہمیں عقیدہ دے دیتا ہے اگرچہ ثبوت نہیں دیتا اور یہاں زندگی بسر کرنے کے لئے صرف ثابت شدہ حقیقتوں ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ عقیدے کی بھی ضرورت ہے۔ ہم صرف انہی باتوں پر قناعت نہیں کر سکتے جنھیں ثابت کر سکتے ہیں اور اس لئے مان لیتے ہیں۔ ہمیں کچھ باتیں ایسی بھی چاہئیں جنھیں ثابت نہیں کر سکتے لیکن مان لینا پڑتا ہے۔

By Faith and By faith alone embrace
Believing, Where we cannot prove.

عام حالات میں مذہب انسان کو اُس کے خاندانی ورثے کے ساتھ ملتا ہے اور مجھے بھی ملا لیکن میں موروثی عقائد پر قانع نہ رہ سکا۔ میری پیاس اس سے زیادہ نکلی جتنی سیرابی وہ دے سکتے تھے۔ مجھے پُرانی راہوں سے نکل کر خود اپنی نئی راہیں ڈھونڈنی پڑیں۔ زندگی کے ابھی پندرہ برس بھی پُورے نہیں ہوئے تھے کہ طبیعت نئی خلشوں اور نئی جستجوؤں سے آشنا ہو گئی تھی اور موروثی عقائد جس شکل و صورت میں سامنے آکھڑے ہوئے تھے، ان پر مطمئن ہونے سے انکار کرنے لگی تھی۔ پہلے اسلام کے اندرونی مذاہب کے اختلافات سامنے آئے، اور اُن کے متعارض دعووں اور متصادم فیصلوں نے حیران و سرگشتہ کر دیا۔ پھر جب کچھ قدم آگے بڑھے تو نفسِ مذہب کی عالمگیر نزاعیں سامنے آگئیں اور انھوں نے حیرانگی کو شک تک اور شک کو انکار تک پہنچا دیا۔ پھر اس کے بعد مذہب اور علم کی باہمی آویزشوں کا میدان نمودار ہوا اور اس نے رہا سہا اعتقاد بھی کھو دیا۔ زندگی کے وہ بنیادی سوال، جو عام حالات میں بہت کم ہمیں یاد آتے ہیں، ایک ایک کر کے اُبھرے اور دل و دماغ پر چھا گئے۔ حقیقت کیا ہے اور کہاں ہے؟ اور ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے اور ایک ہی ہے۔ کیونکہ ایک سے زیادہ حقیقتیں ہو نہیں سکتیں تو پھر راستے مختلف کیوں ہوئے؟ کیوں صرف مختلف ہی نہیں ہوئے بلکہ باہم متعارض اور متصادم ہوگئے؟ پھر یہ کیا ہے کہ خلاف و نزاع کی ان تمام لڑتی ہوئی راہوں کے سامنے علم اپنے بے لچک فیصلوں اور ٹھوس حقیقتوں کا چراغ ہاتھ میں لیے کھڑا ہے اور اس کی بے رحم روشنی میں قدامت اور روایت کی وہ تمام پُراسرار تاریکیاں جنھیں نوعِ انسانی عظمت و تقدیس کی نگاہ سے دیکھنے کی خوگر ہوگئی تھی، ایک ایک کر کے نابود ہو رہی ہیں!

یہ راہ ہمیشہ شک سے شروع ہوتی ہے اور انکار پر ختم ہوتی ہے اور اگر قدم اُسی پر رُک جائیں تو پھر مایوسی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا:

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں!

مجھے بھی ان منزلوں سے گزرنا پڑا مگر میں رُکا نہیں میری پیاس مایوسی پر قانع ہوتا نہیں چاہتی تھی۔ بالآخر حیرانگیوں اور سرگشتگیوں کے بہت سے مرحلے طے کرنے کے بعد جو مقام نمودار ہوا، اُس نے ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیا۔ معلوم ہوا کہ اختلاف و نزاع کی انہی متعارض راہوں اور اوہام و خیالات کی انہی گہری تاریکیوں کے اندر ایک روشن اور قطعی راہ بھی موجود ہے جو یقین اور اعتقاد کی منزلِ مقصود تک چلی گئی ہے اور اگر سکون و طمانیت کے سرچشمے کا سُراغ مل سکتا ہے تو وہیں مل سکتا ہے میں نے جو اعتقاد حقیقت کی جستجو میں کھو دیا تھا۔ وہ اسی جستجو کے ہاتھوں پھر واپس مل گیا۔ میری بیماری کی جو علّت تھی۔ وہی بالآخر دارو ئے شفا بھی ثابت ہوئی:

قد اویتُ من لیلیٰ بلیلیٰ عن الھویٰ

کما یتداویٰ شارب الخمر بالخمر!

البتہ جو عقیدہ کھویا تھا وہ تقلیدی تھا، اور جو عقیدہ اب پایا وہ تحقیقی تھا:

راہے کہ خضر داشت ز سرچشمہ دُور بُود

لب تشنگی ز راہِ دگر بردہ ایم ما

جب تک موروثی عقائد کے جمود اور تقلیدی ایمان کی چشم بندیوں کی پٹیاں ہماری آنکھوں پر بندھی رہتی ہیں۔ ہم اس راہ کا سُراغ نہیں پا سکتے لیکن جونہی یہ پٹیاں کھلنے لگتی ہیں، صاف دکھائی دینے لگتا ہے کہ راہ نہ تو دُور تھی اور نہ کھوئی ہوئی تھی، یہ خود ہماری ہی چشم بندی تھی جس نے عین روشنی میں گم کر دیا تھا،

در دشتِ آرزو نہ بود بیم دام و دَد

راہے ست ایں کہ ہم ز تو خیزد بلائے تو!

اب معلوم ہوا کہ آج تک جسے مذہب سمجھتے آئے تھے وہ مذہب کہاں تھا؟ وہ تو خود ہماری ہی وہم پرستیوں اور غلط اندیشیوں کی ایک صورت گری تھی:

تا بغایت ما ہنر پنداشتیم ۔۔۔ عاشقی ہم ننگ و عارے بودہ است با!

ایک مذہب تو موروثی مذہب ہے کہ باپ دادا جو کچھ مانتے آئے ہیں مانتے رہیے۔ ایک جغرافیائی مذہب ہے کہ زمین کے کسی خاص ٹکڑے میں ایک شاہراہ عام بن گئی ہے سب اُسی پر چلتے ہیں، آپ بھی چلتے رہیئے۔ ایک مردم شماری کا مذہب ہے، کہ مردم شماری کے کاغذات میں ایک خانہ مذہب کا بھی ہوتا ہے اس میں اسلام درج کرا دیجیے۔ ایک رسمی مذہب ہے کہ رسموں اور تقریبوں کا ایک سانچا ڈھل گیا ہے۔ اُسے نہ چھیڑیے اور اسی میں ڈھلتے رہیئے لیکن ان تمام مذہبوں کے علاوہ بھی مذہب کی ایک حقیقت باقی رہ جاتی ہے۔ تعریف و امتیاز کے لیے اُسے حقیقی مذہب کے نام سے پکارنا پڑتا ہے اور اسی کی راہ گم ہو جاتی ہے:

ہمیں ورق کہ سیہ گشت، مدعا ایں جاست!

اسی مقام پر پہنچ کر یہ حقیقت بھی بے نقاب ہوئی کہ علم اور مذہب کی جنگی نزاع ہے۔ فی الحقیقت علم اور مذہب کی نہیں ہے۔ مدعیانِ علم کی خامکاریوں اور مدعیانِ مذہب کی ظاہر پرستیوں اور قواعد سازیوں کی ہے حقیقی علم اور حقیقی مذہب اگرچہ چلتے ہیں الگ الگ راستوں سے مگر بالآخر پہنچ جاتے ہیں ایک ہی منزل پر:

عباراتنا شتیٰ و حسنک واحد

وکل الیٰ ذاک الجمال یشیر!

علم عالمِ محسوسات سے سروکار رکھتا ہے۔ مذہب ماورائے محسوسات کی خبر دیتا ہے۔ دونوں میں دائروں کا تعدّد ہوا مگر تعارض نہیں ہوا۔ جو کچھ محسوسات سے ماورا ہے۔ ہم اسے محسوسات سے معارض سمجھ لیتے ہیں اور یہیں سے ہمارے دیدۂ کج اندیش کی ساری درماندگیاں شروع ہو جاتی ہیں!

بہ چہرۂ حقیقت اگر ماند پردہ

جرمِ نگاہِ دیدۂ صورت پرستِ ماست!

بہرحال زندگی کی ناگواریوں میں مذہب کی تسکین صرف ایک سلبی تسکین ہی نہیں ہوتی

بلکہ ایجابی تسکین ہوتی ہے کیونکہ وہ ہمیں اعمال کے اخلاقی اقدار Moral
Values کا یقین دلاتا ہے اور یہی یقین ہے جس کی روشنی کسی دوسری جگہ
سے نہیں مل سکتی۔ وہ ہمیں بتلاتا ہے کہ زندگی ایک فریضہ ہے جسے انجام دینا چاہیئے
ایک بوجھ ہے جسے اٹھانا چاہیئے :

جلوۂ کاروانِ ما نیست بہ نالۂ جرس
عشقِ تو راہ می برد شوقِ تو زاد می دہد

لیکن کیا یہ بوجھ کانٹوں پر چلے بغیر نہیں اٹھایا جا سکتا ؟
نہیں اٹھایا جا سکتا کیونکہ یہاں خود زندگی کے تقاضے ہوئے جن کا ہمیں جواب
دینا ہے اور خود زندگی کے مقاصد ہوئے جن کے پیچھے والہانہ دوڑنا ہے جن باتوں کو
ہم زندگی کی راحتوں اور لذتوں سے تعبیر کرتے ہیں وہ ہمارے لیئے راحتیں اور لذتیں ہی
کب رہیں گی اگر ان تقاضوں اور مقصدوں سے منہ موڑ لیں ؟ بلاشبہہ یہاں زندگی کا
بوجھ اٹھا کے کانٹوں کے فرش پر دوڑنا پڑا لیکن اس لیئے دوڑنا پڑا کہ دیباؤ مخمل کے
فرش پر چل کر ان تقاضوں کا جواب نہیں دیا جا سکتا تھا۔ کانٹے کبھی دامن سے الجھیں گے
کبھی تلووں میں چبھیں گے لیکن مقصد کی خلش، جو پہلو کے دل میں چبھتی رہے گی، نہ
دامنِ تار تار کی خبر لینے دے گی نہ زخمی تلووں کی :

معشوق در میانۂ جاں، مدعی کجاست
گل در دماغ می دہد آسیبِ خار چیست؟

اور پھر زندگی کی جن حالتوں کو ہم راحت والم سے تعبیر کرتے ہیں ان کی حقیقت بھی اس
سے زیادہ کیا ہوئی کہ اضافت کے کرشموں کی ایک صورت گری ہے ؟ یہاں نہ
مطلق راحت ہے نہ مطلق الم۔ ہمارے تمام احساسات سرتاسر اضافی ہیں :

دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن !

اضافتیں بدلتے جاؤ راحت والم کی نوعیتیں بھی بدلتی جائیں گی۔ یہاں ایک ہی ترازو لے کر

ہر طبیعت اور ہر حالت کا احساس نہیں تولا جا سکتا۔ ایک دہقان کی راحت و الم تولنے کے لیے جس ترازو سے ہم کام لیتے ہیں۔ اس سے فنونِ لطیفہ کے ایک ماہر کا معیارِ راحت و الم نہیں تول سکیں گے۔ ایک ریاضی دان کو ریاضی کا ایک مسئلہ حل کرنے میں جو لذت ملتی ہے وہ ایک ہوس پرست کو شبستانِ عشرت کی سیہ مستیوں میں کب مل سکے گی؟ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم پھولوں کی سیج پر لوٹتے ہیں اور راحت نہیں پاتے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کانٹوں پر دوڑتے ہیں اور اس کی ہر چبھن میں راحت و سرور کی ایک نئی لذت پانے لگتے ہیں:

بہرِ یک گل، زحمتِ صد خار می باید کشید!

راحت و الم کا احساس ہمیں باہر سے لا کر کوئی نہیں دے دیا کرتا۔ یہ خود ہمارا ہی احساس ہے جو کبھی زخم لگاتا ہے، کبھی مرہم بن جاتا ہے۔ طلب و سعی کی زندگی بجائے خود زندگی کی سب سے بڑی لذت ہے۔ بشرطیکہ کسی مطلوب کی راہ میں ہو:

رہرواں را خستگیِ راہ نیست
عشق ہم راہ ست و ہم خود منزل ست!

اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں فلسفہ نہیں ہے۔ زندگی کے عام واردات ہیں۔ عشق و محبت کے واردات کا میں حوالہ نہیں دوں گا کیونکہ وہ ہر شخص کے حصے میں نہیں آ سکتے۔ لیکن زندگی اور ہوسناکی کے کوچوں کی خبر رکھنے والے تو بہت نکلیں گے۔ وہ خود اپنے دل سے پوچھ دیکھیں کہ کسی کی راہ میں رنج و الم کی تلخیوں نے کبھی خوشگواریوں کے مزے بھی دیئے تھے یا نہیں؟

حدیثِ کاوشِ مژگانِ خونریزش نہ، ناصح
بدست آور رگِ جانے و نشتر را تماشا کن!

زندگی بغیر کسی مقصد کے بسر نہیں کی جا سکتی۔ کوئی اٹکاؤ، کوئی لگاؤ، کوئی بندھن ہونا چاہیے جس کی خاطر زندگی کے دن کاٹے جا سکیں۔ یہ مقصد مختلف طبیعتوں کے سامنے مختلف شکلوں میں آتا ہے:

زاہد بہ نماز و روزہ ضبطے دارد
سرمد بہ مئے و پیالہ ربطے دارد

کوئی زندگی کی کاربرداریوں ہی کو مقصدِ زندگی سمجھ کر ان پر قانع ہوجاتا ہے۔ کوئی ان پر قانع نہیں ہوسکتا جو قانع نہیں ہوسکتے ان کی حالتیں بھی مختلف ہوئیں۔ اکثروں کی پیاس ایسے مقصدوں سے سیراب ہوجاتی ہے جو انھیں مشغول رکھ سکیں لیکن کچھ طبیعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے لیے صرف مشغولیت کافی نہیں ہوسکتی۔ وہ زندگی کا اضطراب بھی چاہتی ہیں:

نہ داغِ تازہ می کارد، نہ زخمِ کہنہ می خارد
بدہ یارب دلے کیں صورتِ بیجاں نمی خواہم

پہلوں کے لئے جو دلبستگی اس میں ہوئی کہ مشغول رہیں، دوسروں کے لیے اس میں ہوئی کہ مضطرب رہیں:

دریں چمن کہ ہوا داغِ شبنم آرائی ست
نسیتے بہ ہزار اضطراب می باخند!

ایک خشک اور ناآشنائے شورش مقصد سے ان کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ انھیں ایسا مقصد چاہیئے جو اضطراب کے انگاروں سے دہک رہا ہو، جو ان کے اندر شورش و سرمستی کا ایک تہلکہ مچادے، جس کے دامنِ ناز کو پکڑنے کے لیے وہ ہمیشہ اپنا گریبان وحشت چاک کرتے رہیں:

دامن اس کا تو بھلا دور ہے اے دستِ جنوں
کیوں ہے بیکار، گریباں تو مرا دور نہیں!

ایک ایسا بلائے جاں مقصد جس کے پیچھے انھیں دیوانہ وار دوڑنا پڑے جو دوڑنے والوں کو ہمیشہ نزدیک بھی دکھائی دے اور ہمیشہ دور بھی ہوتا رہے۔ نزدیک اتنا کہ جب چاہیں ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیں۔ دور اتنا کہ اس کی گردِ راہ کا بھی سراغ نہ پاسکیں:

بامن آویزشِ او اُلفتِ موج ست وکنار
دمبدم بامن و ہر لحظہ گریزاں از من !

پھر نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو معاملے کا ایک اور پہلو بھی ہے جسے صرف تہ رس نگاہیں ہی دیکھ سکتی ہیں۔ یکسانی، اگرچہ سکون و راحت کی ہو، یکسانی ہوئی اور یکسانی بجائے خود زندگی کی سب سے بڑی بے نمکی ہے۔ تبدیلی اگرچہ سکون سے اضطراب کی ہو، مگر پھر تبدیلی ہے اور تبدیلی بجائے خود زندگی کی ایک بڑی لذت ہوئی عربی میں کہتے ہیں "حمِّضوا مجالسکم" اپنی مجلسوں کا ذائقہ بدلتے رہو۔ سو یہاں زندگی کا مزہ بھی انہی کو مل سکتا ہے جو اُس کی شیرینیوں کے ساتھ اُس کی تلخیوں کے بھی گھونٹ پیتے رہتے ہیں اور اس طرح زندگی کا ذائقہ بدلتے رہتے ہیں۔ ورنہ وہ زندگی ہی کیا جو ایک ہی طرح کی صبحوں اور ایک ہی طرح کی شاموں میں بسر ہوتی رہے؟ خواجہ درد کیا خوب کہہ گئے ہیں:

آ جائے ایسے جینے سے اپنا تو جی تنگ
آخر جیئے گا کب تلک اے خضر، مر کہیں!

یہاں پانے کا مزہ انہی کو مل سکتا ہے جو کھونا جانتے ہیں جنھوں نے کچھ کھویا ہی نہیں اُنھیں کیا معلوم کہ پانے کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ نظیری کی نظر اسی حقیقت کی طرف گئی تھی:

آنکہ او در کلبۂ احزاں پسر گم کردہ، یافت
تو کہ چیزے گم نہ کردی، از کجا پیدا شود؟

اور پھر غور و فکر کا ایک قدم اور آگے بڑھایئے تو خود ہماری زندگی کی حقیقت بھی حرکت و اضطراب کے ایک تسلسل کے سوا اور کیا ہے؟ جس حالت کو ہم سکون سے تعبیر کرتے ہیں اگر چاہیں تو اُسی کو موت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ موج جب تک مضطرب ہے زندہ ہے آسودہ ہوئی اور معدوم ہوئی۔ فارسی کے ایک شاعر نے دو مصرعوں کے اندر سارا فلسفۂ حیات ختم کر دیا تھا:

موجیم کہ آسودگیِ ما عدمِ ماست ... ما زندہ از انیم کہ آرام نہ گیریم!

اور پھر یہ راہ اس طرح بھی طے نہیں کی جاسکتی کہ اُس کے اٹکاؤ کے ساتھ دُوسرے لگاؤ بھی لگے رکھیے۔ راہِ مقصد کی خاک بڑی ہی غیور واقع ہوئی ہے۔ وہ راہرو کی جبینِ نیاز کے سارے سجدے اس طرح کھینچ لیتی ہے کہ پھر کسی دوسری چوکھٹ کے لیے کچھ باقی ہی نہیں رہتا۔ دیکھیے، میں نے یہ تعبیر غالب سے مستعار لی:

خاکِ کوئیش خود پسند افتاد در جذبِ سجود
سجدہ از بہرِ حرم نہ گذاشت در سیمائے من!

مقصود اس تمام دراز نفسی سے یہ تھا کہ آج اپنے اوراقِ فکرِ پریشاں کا ایک صفحہ آپ کے سامنے کھول دوں:

لختے زحالِ خویش بہ سیما نوشتہ ایم!

اس میکدۂ ہزار شیوہ و رنگ میں ہر گرفتارِ دامِ تخیّل نے اپنی خود فراموشیوں کے لیے کوئی نہ کوئی جامِ سرشاری سامنے رکھ لیا ہے اور اسی میں بیخود رہتا ہے:

ساقی بہ ہمہ بادہ زیک خم دہد، امّا
در مجلسِ او مستی ہر یک ز شرابے ست

کوئی اپنا دامن پھولوں سے بھرنا چاہتا ہے کوئی کانٹوں سے اور دونوں میں سے کوئی بھی پسند نہیں کرے گا کہ تہی دامن رہے۔ جب لوگ کامجوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول چُن رہے تھے، تو ہمارے حصے میں تمناؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے۔ انھوں نے پھول چُن لیے اور کانٹے چھوڑ دیئے۔ ہم نے کانٹے چُن لیے اور پھول چھوڑ دیئے:

زخار زارِ محبّت دلِ ترا چہ خبر
کہ گل بجیب نہ گنجد قبائے تنگ ترا!

ابوالکلام

مکتوب

قلعۂ احمد نگر
۱۵ اگست ۱۹۴۲ء

ما را زبانِ شکوہ ز بیدادِ چرخ نیست
از ما خطے بہ مہرِ خموشی گرفتہ اند

صدیقِ مکرم!

وہی صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہے۔ صراحی لبریز ہے اور جام آمادہ۔ ایک دور ختم کر چکا ہوں، دوسرے کے لیے ہاتھ بڑھا رہا ہوں:

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل ست
صراحئ مئے ناب و سفینۂ غزل ست
جریدہ رو کہ گزرگاہِ عافیت تنگ ست
پیالہ گیر کہ عمرِ عزیز بے بدل ست

طبیعت وقت کی کشاکش سے یک قلم فارغ اور دل فکرِ این و آں سے بالکل آسودہ ہے۔ اپنی حالت دیکھتا ہوں تو وہ عالم دکھائی دیتا ہے جس کی خبر خواجہ شیراز نے چھ سو سال پہلے دے دی تھی۔ زندگی کے چالیس سال طرح طرح کی کاوشوں میں بسر ہو گئے۔ مگر اب دیکھا تو معلوم ہوا کہ ساری کاوشوں کا حاصل اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ صبح کا جانفزا وقت ہو اور چینی کی بہترین چائے کے پے در پے فنجان:

چہل سال رنج و غصہ کشیدیم و عاقبت
تدبیر ما بہ دستِ شرابِ دو سالہ بود!

آج تین بجے سے کچھ پہلے آنکھ کھل گئی تھی۔ صحن میں نکلا تو ہر طرف سناٹا تھا۔ صرف احاطے کے باہر سے پہرہ داری گشت و بازگشت کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہاں

رات کو احاطے کے اندر وارڈروں کا تین تین گھنٹے کا پہرہ لگا کرتا ہے۔ مگر بہت کم جاگتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اس وقت بھی سامنے کے برآمدے میں ایک وارڈر کمبل بچھائے لیٹا تھا اور زور زور سے خراٹے لے رہا تھا۔ بے اختیار مومن خاں کا شعر یاد آگیا :

ہے اعتماد مرے بختِ خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشمِ پاسباں کے لیے

زندانیوں کے اس قافلے میں کوئی نہیں جو سحر خیزی کے معاملے میں میرا شریکِ حال ہو۔ سب بے خبر سو رہے ہیں اور اسی وقت میٹھی نیند کے مزے لیتے ہیں :

دانم کسے بقافلہ بودہ ست پاسباں
بیدار شو کہ چشمِ رفیقاں بخواب شُد

سو نچتا ہوں تو زندگی کی بہت سی باتوں کی طرح اس معاملے میں بھی ساری دُنیا سے اُلٹی ہی چال میرے حصے میں آئی۔ دُنیا کے لیے سونے کا جو وقت سب سے بہتر ہُوا۔ وہی میرے لیے بیداری کی اصلی پُونجی ہوئی۔ لوگ ان گھڑیوں کو اس لیے عزیز رکھتے ہیں کہ میٹھی نیند کے مزے لیں۔ میں اس لیے عزیز رکھتا ہوں کہ بیداری کی تلخ کامیوں سے لذت یاب ہوتا رہوں :

خلق را بیدار باید بُود ز آبِ چشمِ من
ویں عجب کاں دم کہ می گریم کسے بیدار نیست

ایک بڑا فائدہ اس عادت سے یہ ہُوا کہ میری تنہائی میں اب کوئی خلل نہیں ڈال سکتا۔ میں نے دنیا کو ایسی جراتوں کا سرے سے موقع ہی نہیں دیا۔ وہ جب جاگتی ہے تو میں سو رہتا ہوں، جب سو جاتی ہے تو اٹھ بیٹھتا ہوں :

خوابِ غفلت ہمہ را بردہ و بیدار یکے مست

خلائق کے کتنے ہی ہجوم میں ہوں لیکن اپنا وقت صاف بچا لے جاتا ہوں۔ کیونکہ میری اس خلوت در انجمن پر کوئی ہاتھ ڈال ہی نہیں سکتا۔ میرے عیش و طرب کی بزم اُس وقت آراستہ ہوتی ہے جب نہ کوئی آنکھ دیکھنے والی ہوتی ہے نہ کوئی کان سننے والا۔ رضیؔ دانش نے میری زبان سے کہا تھا:

خوش زمزمۂ گوشۂ تنہائی خویشم
از جوش و خروشِ گل و بلبل خبرم نیست

ایک بڑا فائدہ اس سے یہ ہوا کہ دل کی انگیٹھی ہمیشہ گرم رہنے لگی۔ صبح کی اس مہلت میں تھوڑی سی آگ جو سلگ جاتی ہے اُس کی چنگاریاں بجھنے نہیں پاتیں۔ راکھ کے تلے دبی دبائی کام کرتی رہتی ہیں:

ازاں بہ دیرِ مغانم عزیز می دارند
کہ آتشے کہ نمیرد ہمیشہ در دلِ ماست

دن بھر اگر سوز و تپش کا سامان نہ بھی ملے جب بھی چولھے کے ٹھنڈے پڑ جانے کا اندیشہ نہ رہا۔ عرفیؔ کیا خوب بات کہہ گیا ہے:

سینۂ گرم نہ داری مطلبِ صحبتِ عشق
آتشے نیست چو در مجمرہ ات، عود مخر!

اس سحر خیزی کی عادت کے لیے والد مرحوم کا منّت گزار ہوں۔ اُن کا معمول تھا کہ رات کی پچھلی پہر ہمیشہ بیداری میں بسر کرتے۔ بیماری کی حالت بھی اس معمول میں فرق نہیں ڈال سکتی تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ رات کو جلد سونا اور صبح جلد اُٹھنا زندگی کی سعادت کی پہلی علامت ہے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے کے حالات سناتے کہ دہلی میں مفتی صدر الدین مرحوم سے صبح کی سنت و فرض کے درمیان سبق لیا کرتا تھا اور اس امتیاز پر نازاں رہتا تھا کیونکہ وہ چاہتے تھے، مجھے خصوصیت کے ساتھ اوروں سے علٰحدہ سبق دیں اور اس کے لیے صرف یہی وقت نکل سکتا تھا۔ یہ بھی فرماتے کہ یہ فیض مجھے اپنے نانا رکن المدرسین

سے ملا۔ وہ بھی شاہ عبدالعزیز سے علی الصبح سبق لیا کرتے تھے اور پچھلی پہر سے اُٹھ کر اس کی طیاری میں لگ جاتے تھے۔ پھر خواجۂ شیراز کا یہ مقطع ذوق سے لے کر پڑھتے:

مرو بخواب کہ حافظ بہ بارگاہِ قبول
ز وردِ نیم شب و درسِ صبح گاہ رسید

میری ابھی دس گیارہ برس کی عمر ہوگی کہ یہ باتیں کام کر گئی تھیں۔ بچپنے کی نیند سر پہ سوار رہتی تھی مگر میں اس سے لڑتا رہتا۔ صبح اندھیرے میں اٹھتا اور شمع دان روشن کر کے اپنا سبق یاد کرتا۔ بہنوں سے منتیں کیا کرتا تھا کہ صبح آنکھ کھلے تو مجھے جگا دینا۔ وہ کہتی تھیں یہ نئی شرارت کیا سوجھی ہے۔ اس خیال سے کہ میری صحت کو نقصان نہ پہنچے، والد مرحوم روکتے۔ لیکن مجھے کچھ ایسا شوق پڑ گیا تھا کہ جس دن دیر سے آنکھ کھلتی، دن بھر پشیمان سا رہتا۔ آنے والی زندگی میں جو معاملات پیش آنے والے تھے یہ ان سے میرا پہلا سابقہ تھا:

اتانی هواها قبل ان اعرف الهوی
فصادف قلباً فارغاً فتمکنا

دیکھیے، یہاں "پہلا سابقہ" لکھتے ہوئے میں نے عربی کی ترکیب "کان اول عهدی بکذا" کا بلا قصد ترجمہ کر دیا کہ دماغ میں بسی ہوئی تھی۔ یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور عالمِ تنہائی کی خلوت اندوزیوں کا پورا پورا لطف اُٹھا رہا ہوں۔ گویا ساری دُنیا میں اس وقت میرے سوا کوئی نہیں بستا۔ کہ نہیں سکتا۔ تنہائی کا یہ احساس میری طبعِ خلوت پرست کی جولانیوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا کرتا ہے۔ بیدل کی خیال بندیوں کا غلبہ بے کیف ہو لیکن اس کی بحرِ طویل کی بعض غزلیں کیف سے خالی نہیں ہیں:

ستمست اگر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ، درِ دل کشا، بہ چمن درآ

پئے نافہ ہائے خجستہ بو، مپسند زحمتِ جستجو
بخیالِ حلقۂ زلفِ او، گرہے خورد بہ ختن درآ

پانچ بجے سے قلعے میں ٹینکوں کے چلانے کی مشق شروع ہوتی ہے اور گھڑ گھڑ کی آواز آنے لگتی ہے مگر اس میں ابھی دیر ہے۔ چار بجے دودھ کی لاری آتی ہے اور چند لمحوں کے لئے صبح کا سکون ہنگامے سے بدل دیتی ہے۔ وہ ابھی چند منٹ ہوئے آئی تھی اور واپس گئی اگر اس وقت کے سناٹے میں کوئی آواز مخل ہو رہی ہے تو وہ صرف جواہر لال کے ہلکے خراٹوں کی آواز ہے۔ وہ ہمسائے میں سو رہے ہیں۔ صرف لکڑی کا ایک پردہ حائل ہے۔ خراٹے جب تھمتے ہیں تو حسبِ معمول نیند میں بڑبڑانے لگتے ہیں۔ یہ بڑبڑانا ہمیشہ انگریزی میں ہوتا ہے۔

یارِ ما ایں دارد و آں نیز ہم!

مؤتمن الدولہ اسحاق خاں شوستری محمد شاہی امرا میں سے تھا۔ اس کا ایک مطلع آپ نے تذکروں میں دیکھا ہوگا۔ مطلع جگت کی صنعت گری کے سوا کچھ نہیں ہے مگر جب کبھی جواہر لال کو انگریزی میں بڑبڑاتے سنتا ہوں تو بے اختیار یاد آجاتا ہے:

زبسکہ در دلِ تنگم خیالِ آں گل بود
نفیرِ خوابِ من امشب صفیرِ بلبل بود

یہ نیند میں بڑبڑانے کی حالت بھی عجیب ہے۔ یہ عموماً انہی طبیعتوں پر طاری ہوتی ہے جن میں دماغ سے زیادہ جذبات کام کیا کرتے ہیں۔ جواہر لال کی طبیعت بھی سر تا سر جذباتی واقع ہوئی ہے۔ اس لئے خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں جذبات کام کرتے رہتے ہیں۔

یہاں آئے ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا ہے۔ فوجی صیغے نے ہمارا چارج لے لیا۔ داخلے کے وقت فہرست سے مقابلہ کر لیا۔ ہماری حفاظت کا اور دنیا سے بے تعلقی کا جس قدر بندوبست کیا جا سکتا تھا وہ بھی کر لیا لیکن اس سے زیادہ انھیں ہمارے

معاملات سے کوئی سروکار معلوم نہیں ہوتا۔ اندر کا تمام انتظام گورنمنٹ بمبئی کے ہوم ڈیپارٹمنٹ سے براہِ راست اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور اصلی رشتہ کار مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہے۔

ہمیں یہاں رکھنے کے لیے جو ابتدائی انتظام کیا گیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ گرفتاری سے ایک دن پہلے یعنی ۸ راگست کو یرودا سنٹرل جیل پونا سے ایک سینیر جیلر یہاں بھیج دیا گیا۔ جیل کے دس وارڈرز اور پندرہ قیدی کام کاج کے لیے اس کے ساتھ آئے۔ جیلر کو کچھ معلوم نہ تھا کہ کیا صورتِ حال پیش آنے والی ہے۔ صرف اتنی بات بتلائی گئی تھی کہ ایک ڈیٹینشن کیمپ کھل رہا ہے

چند دنوں کے لیے دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ ہم پہنچے تو معاملہ ایک دوسری ہی شکل میں نمایاں ہوا اور بیچارہ سراسیمہ ہو کر رہ گیا۔ چونکہ میں نے یہاں آتے ہی اپنا غصہ اس غریب پر نکالا تھا۔ اس لیے کئی دن تک منہ چھپائے پھرتا رہا۔ جب اور کچھ نہ بنتی تو ضلع کے کلکٹر کے پاس دوڑا ہوا جاتا۔ وہ اس سے زیادہ بے خبر تھا:

در پیرکس کہ زدم، بے خبر و غافل بود

دوسرے دن کلکٹر اور سول سرجن آئے اور معذرت کر کے چلے گئے۔ سول سرجن ہر شخص کا سینہ ٹھوک بجا کے دیکھتا رہا کہ کیا آواز نکلتی ہے؟ معلوم نہیں پھیپھڑوں کی حالت معلوم کرنی چاہتا تھا یا دلوں کی۔ مجھ سے بھی معائنے کی درخواست کی۔ میں نے کہا میرا سینہ دیکھنا بے سود ہے۔ اگر دماغ کے دیکھنے کا کوئی آلہ ساتھ ہے تو اسے کام میں لائیے:

بگذر مسیح از سر ما کشتگانِ عشق
یک زندہ کردنِ تو بہ صد خوں برابر ست

بہرحال چوتھے دن انسپکٹر جنرل آف پریزن آیا اور گورنمنٹ کے احکام کا پرچہ حوالے کیا۔ کسی سے ملاقات نہیں کی جاسکتی۔ کسی سے خط و کتابت نہیں کی جاسکتی۔ کوئی اخبار نہیں آسکتا۔ ان باتوں کے علاوہ اگر کسی اور بات کی شکایت ہو تو حکومت اس پر غور

کرنے کے لیے طیار رہے۔ اب ان باتوں کے بعد اور کون سی بات رہ گئی تھی جس کی شکایت کی جاتی اور حکومت ازراہِ عنایت اُسے دُور کر دیتی؟

زباں جلائی گئی کیسے قطع ہاتھ پہنچوں سے
یہ بند و بست ہوئے ہیں مری دعا کے لیے!

انسپکٹر جنرل نے کہا: اگر آپ کتابیں یا کوئی اور سامان گھر سے منگوانا چاہیں تو ان کی فہرست لکھ کر مجھے دے دیں۔ گورنمنٹ اپنے طور پر منگوا کر آپ کو پہنچا دے گی۔ چونکہ گرفتاری سفر کی حالت میں ہوئی تھی۔ اس لیے میرے پاس دو کتابوں کے سوا، جو راہ میں دیکھنے کے لیے ساتھ رکھ لی تھیں، مطالعے کا کوئی سامان نہ تھا۔ خیال ہُوا، اگر مکان سے بعض مسودات اور کچھ کتابیں آجائیں تو فیدو بند کی یہ فرصت کام میں لائی جائے۔ بظاہر اس خواہش میں کوئی بُرائی معلوم نہیں ہوتی۔ دُنیا را بہ اُمید خوردہ اند۔ آرزو عیب نہ دارد:

نقابِ چہرۂ اُمید باشد گردِ نومیدی
غبارِ دیدۂ یعقوب آخر توتیا گردد

میں نے مطلوبہ اشیاء کا ایک پرچہ لکھ کر اُس کے حوالے کیا اور وہ لے کر چلا گیا لیکن اُس کے جانے کے بعد جب صورتِ حال پر زیادہ غور کرنے کا موقع ملا تو طبیعت میں ایک خلش سی محسوس ہونے لگی۔ معلوم ہُوا کہ یہ بھی دراصل طبیعت کی ایک کمزوری تھی کہ حکومت کی اس رعایت سے فائدہ اُٹھانے پر راضی ہو گئی۔ جب عزیز و اقربا سے بھی ملنے اور خط و کتابت کرنے کی اجازت نہیں دی گئی جس کا حق مجرموں اور قاتلوں تک سے چھینا نہیں جاتا تو پھر یہ توقع کیوں رکھی جائے کہ وہی حکومت گھر سے سامان منگوا کر فراہم کر دے گی؟ ایسی حالت میں عزّتِ نفس کا تقاضا صرف یہی ہو سکتا ہے کہ نہ تو کوئی آرزو کی جائے نہ کوئی توقع رکھی جائے:

ز تیغِ بے نیازی تا توانی قطعِ ہستی کن
فلک تا انگند از پا ترا، خود پیش دستی کن

میں نے دوسرے ہی دن انسپکٹر جنرل کو خط لکھ دیا کہ فہرست کا پرچہ واپس کر دیا جائے۔ جب تک گورنمنٹ کا موجودہ طرزِ عمل قائم رہتا ہے، میں کوئی چیز مکان سے منگوانی نہیں چاہتا۔ یہاں اور تمام ساتھیوں نے بھی یہی طرزِ عمل اختیار کیا:

دامن اس کا تو بھلا دور ہے اے دستِ جنوں
کیوں ہے بیکار؟ گریباں تو مرا دور نہیں!

اب چائے کے تیسرے فنجان کے لیے کہ ہمیشہ اس دورِ صبوحی کا آخری جام ہوتا ہے ہاتھ بڑھاتا ہوں اور یہ افسانہ سرائی ختم کرتا ہوں۔ یادش بخیر! خواجۂ شیراز کے پیر مے فروش کی موعظت بھی وقت پر کیا کام دے گئی ہے:

دی پیرِ مے فروش کہ ذکرش بخیر باد
گفتا "شراب نوش و غمِ دل ببر زیاد"
گفتم "بباد می دہدم بادہ نام و ننگ"
گفتا "قبول کن سخن و ہر چہ باد باد"
بے خار گل نباشد و بے نیش، نوش ہم
تدبیر چیست؟ وضعِ جہاں ایں چنیں فتاد
پُر کن ز بادہ جام دمادم بگوشِ ہوش
بشنو از و حکایتِ جمشید و کیقباد

ابوالکلام

مکتوب

قلعۂ احمد نگر
۱۹ اگست ۱۹۴۲ء

چو تخمِ اشک بہ کلفت سرشتہ اند مرا
بہ نا اُمیدئ جاوید کشتہ اند مرا
ز آہِ بے اثرم داغ خام کاریِ خویش
ز آتشے کہ ندارم، برشتہ اند مرا

صدیق مکرم!

وہی صبح چار بجے کا وقت ہے۔ چائے سامنے دھری ہے۔ جی چاہتا ہے۔ آپ کو مخاطب تصور کروں اور کچھ لکھوں۔ مگر لکھوں تو کیا لکھوں؟ مرزا غالب نے رنجِ گراں نشینی کی حکایتیں لکھی تھیں، صبر گریز پا کی شکایتیں کی تھیں:

کبھی حکایتِ رنجِ گراں نشیں لکھیئے
کبھی شکایتِ صبرِ گریز پا کہیئے

لیکن یہاں نہ رنج کی گراں نشینیاں ہیں کہ لکھوں، نہ صبر کی گریز پائیاں ہیں کہ سناؤں۔ رنج کی جگہ صبر کی گراں نشینیوں کا خوگر ہو چکا ہوں، صبر کی جگہ رنج کی گریز پائیوں کا تماشائی رہتا ہوں۔ عُرفی کا وہ شعر کیا خوب ہے جو ناصر علی نے اس کے تمام کلام میں سے چُنا تھا:

من ازیں رنجِ گراں بار چہ لذت یابم
کہ بہ اندازۂ آں صبر و ثباتم دادند!

اگر اس شعر کو اپنی حالت پر ڈھالنے کی کوشش کروں تو یہ ایک طرح کی خود ستائی اور خوشتن بینی کی بے صرفگی سمجھی جائے گی۔ لیکن یہ کہنے میں کیا عیب ہے کہ اس مقام کی لذت شناسی سے بے بہرہ نہیں ہوں اور اس کا آرزومند رہتا ہوں؟ اسی عرفی نے

یہ بھی تو کہا ہے :

مُنکر نہ تواں گشت اگر دم زنم از عشق
ایں نشّۂ بہ من گر نہ بود بادگرے ہست

یہاں پہنچنے کے بعد چند دنوں تک تو صرف جیلر ہی سے سابقہ رہا۔ ایک دو مرتبہ کلکٹر اور سول سرجن بھی آئے۔ پھر جس دن انسپکٹر جنرل آیا۔ اسی دن ایک اور شخص بھی اُس کے ہمراہ آیا۔ معلوم ہوا۔ آئی، ایم، ایس سے تعلق رکھتا ہے۔ میجر ایم سینڈک Major M. Sandak نام ہے اور یہاں کے لیے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوا ہے۔ میں نے جی میں کہا۔ یہ سینڈک، ببنڈک کون کہے؟ کوئی اور نام ہونا چاہیے جو ذرا مانوس اور رواں ہو۔ معاً حافظے نے یاد دلایا کہیں نظر سے گزرا تھا کہ چاند بی بی کے زمانے میں اس قلعے کا قلعہ دار چیتہ خاں نامی ایک حبشی تھا۔ میں نے ان حضرت کا نام چیتہ خاں ہی رکھ دیا کہ اوّل بہ آخر نسبتے دارد :

نام اس کا آسماں ٹھہرا لیا تحریر میں

ابھی دو چار دن بھی نہ گزرے تھے کہ یہاں ہر شخص کی زبان پہ چیتہ خاں تھا۔ قیدی اور وارڈرز بھی اسی نام سے پکارنے لگے۔ کل جیلر کہتا تھا کہ آج چیتہ خاں وقت سے پہلے گھر چلا گیا۔ میں نے کہا۔ چیتہ خاں کون؟ کہنے لگا میجر اور کون!

ہیچ نہ گفتیم و حکایت بدر افتاد

بہرحال غریب جیلر کی جان چھُٹی، اب سابقہ چیتہ خاں سے رہتا ہے۔ جب جاپانیوں نے انڈیمان پر قبضہ کیا تو یہ وہیں متعین تھا۔ اس کا تمام سامان غارت گیا اپنی بربادیوں کی کہانیاں یہاں لوگوں کو سناتا رہتا ہے :

اگر ما دردِ دل داریم زاہد دردِ دیں دارد!

اس مرتبہ سب سے زیادہ اہتمام اس بات کا کیا گیا ہے کہ نہ قیدیوں کا کوئی تعلق باہر کی دُنیا سے نہ رہے حتیٰ کہ باہر کی پرچھائیں بھی یہاں نہ پڑنے پائے۔ غالباً ہمارا محلِ قیام

بھی پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ اب گویا احمد نگر بھی جنگ کے پُراسرار مقامات کی طرح سم ویران انڈیا Somewhere in India کے حکم میں داخل ہو گیا۔ دیکھیے ناسخ کا ایک فرسودہ شعر یہاں کیا کام دے گیا ہے:

ہم سا کوئی گمنام زمانے میں نہ ہوگا
گم ہو وہ نگیں جس پہ کھُدے نام ہمارا

قلعے کی جس عمارت میں ہم رکھے گئے ہیں یہاں غالباً چھاؤنی کے افسر رہا کرتے تھے۔ گاہ گاہ جنگی قیدیوں کے لیے بھی اسے کام میں لایا گیا ہے۔ جنگ بوئر کے زمانے میں جو قیدی ہندوستان لائے گئے تھے۔ ان کے افسروں کا ایک گروہ یہیں رکھا گیا تھا۔ گزشتہ جنگ میں بھی ہندوستان کے جرمن یہیں نظر بند کیئے گئے اور موجودہ جنگ میں بھی اطالوی افسروں کا ایک گروہ، جو مصر سے لایا گیا تھا، یہیں نظر بند رہا۔

چیتہ خاں کہتا ہے کہ ہمارے آنے سے پہلے یہاں فوجی افسروں کے ٹریننگ کی ایک کلاس کھولی گئی تھی۔ کل میرے کمرے میں الماری ہٹا کر اس نے دکھایا کہ ایک بڑا سیاہ بورڈ دیوار پر بنا ہے۔ میں نے جی میں کہا، غالباً اسی لیے ہمیں یہاں لاکر رکھا گیا ہے کہ ابھی درس گاہِ جنون و وحشت کے کچھ سبق باقی رہ گئے تھے،

دریں تعلیم شُد عمر و ہنوز ابجد ہمی خوانم
نہ دانم کے سبق آموز خواہم شد بہ دیوانش!

احاطے کے مغربی رُخ پر جو کمرے ہیں اور جو ہمیں رہنے کے لیے دیئے گئے ہیں ان کی کھڑکیاں قلعے کے احاطے میں کھلتی ہیں۔ کھڑکیوں کے اوپر روشندان بھی ہیں۔ اس خیال سے کہ ہماری طرح ہماری نگاہیں بھی باہر نہ جا سکیں، تمام کھڑکیاں دیواریں چُن کر بند کر دی گئی ہیں۔ دیواریں ہمارے آنے سے ایک دن پہلے چُنی گئی ہوں گی کیونکہ جب ہم آئے تھے تو سفیدی خشک نہیں ہوئی تھی، ہاتھ پڑ جاتا تو اپنا نقش بٹھا دیتا اور نقش اس طرح بیٹھتا کہ پھر اُٹھتا نہیں،

ہر داغِ معاصی مرا اس دامنِ تر سے
جوں حرفِ سرِ کاغذ نم اُٹھ نہیں سکتا

دیواریں اس طرح چنی ہیں کہ اوپر تلے، دہنے بائیں، کوئی رخنہ باقی نہیں چھوڑا، روشندان تک چُھپ گئے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر کھڑکیاں کھلی بھی ہوتیں تو کونسا بڑا میدان سامنے کُھل جاتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ قلعے کی سنگیں دیواروں تک نگاہیں جاتیں اور ٹکرا کر واپس آجاتیں لیکن ہماری نگاہوں کی اتنی رسائی بھی خطرناک سمجھی جاتی۔ روشندان کے آئینے تک بند کر دیئے گئے:

ہوسِ گُل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے

قلعے کے دروازے کی شب و روز پاسبانی کی جاتی ہے اور قلعے کے اندر بھی مسلح سنتری چاروں طرف پھرتے رہتے ہیں، پھر بھی ہماری حفاظت کے لیے مزید روک تھام ضروری سمجھی گئی۔ ہمارے احاطے کا شمالی رُخ پہلے کُھلا تھا، اب دس دس فٹ اونچی دیواریں کھینچ دی گئی ہیں اور ان میں دروازہ بنایا گیا ہے اور اُس دروازے پر بھی رات دن مسلح فوجی پہرہ رہتا ہے۔ فوج یہاں تمام تر انگریز سپاہیوں کی ہے۔ وہی ڈیوٹی پر لگائے جاتے ہیں۔ جیلر اور ایک وارڈر کے سوا، جسے بازار سے سودا سلف لانے کے لئے نکلنا پڑتا ہے اور کوئی شخص باہر نہیں جاسکتا۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جو کوئی دروازے سے گزرے سنتری کو جامہ تلاشی دے۔ وارڈر کو ہر مرتبہ برہنہ ہو کر تلاشی دینی پڑتی ہے۔ وہ جیلر کے پاس جاجا کر روتا ہے مگر کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ پہلے دن جیلر نکلا تھا تو اس سے بھی جامہ تلاشی کا مطالبہ کیا گیا تھا کہ "ایں ہم بچہ شتر است!"

بازار سے سودا سلف لانے کا انتظام یوں کیا گیا ہے کہ قلعے کے دروازے کے پاس فوجی ادارے کا ایک دفتر ہے۔ یہاں کے سپرنٹنڈنٹ کا آفس ٹیلیفون کے ذریعے اس سے جوڑ دیا گیا ہے۔ جب بازار سے کوئی چیز آتی ہے تو پہلے وہاں روکی جاتی ہے اور اس کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ پھر وہاں کا متعینہ افسر سپرنٹنڈنٹ کو فون کرتا ہے کہ فلاں چیز اس

طرح کی اور اس شکل میں آئی ہے۔ مثلاً ٹوکری میں ہے، یا رومال میں بندھی ہے یا ٹین کا ڈبا ہے۔ اس اطلاع کے ملنے پر یہاں سے جیلر احاطے کے دروازے پر جاتا ہے اور نشان زدہ سامان سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں اُٹھوا لے جاتا ہے۔ اب یہاں پھر دوبارہ دیکھ بھال کی جاتی ہے اگر ٹوکری ہے تو اُسے خالی کر کے اس کا ہر حصّہ اچھی طرح دیکھ لیا جائے گا۔ کہ ادھر اُدھر کوئی پرچہ تو چھپا ہوا نہیں ہے۔ شکر اور آٹے کی خاص طور پر دیکھ بھال کی جاتی ہے کیونکہ ان کی تہ میں بہت کچھ چھپا کر رکھ دیا جا سکتا ہے!

وارڈر جو پونا سے یہاں لائے گئے ہیں وہ آئے تو تھے قیدیوں کی نگرانی کرنے مگر اب خود قیدی بن گئے ہیں۔ نہ تو احاطے سے قدم باہر نکال سکتے ہیں نہ گھر سے خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ جیلر کو بھی گھر خط لکھنے کی اجازت نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے انہی راہوں سے کوئی خبر باہر پہنچ جائے۔ وہ روتا رہتا ہے کہ مجھے صرف ایک دن کی چھٹی مل جائے کہ پونا ہو آؤں مگر کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ یہاں جسے دیکھو، ہائے ہائے کر رہا ہے:

شبنم خرابِ مہر، کتاں سینہ چاکِ ماہ
لو اور بھی ستم زدۂ روزگار ہیں!

اس صورتِ حال نے یہاں کی ضروریات کی فراہمی میں عجیب عجیب اُلجھاؤ ڈال دیئے ہیں۔ جلیبیہ خاں جب دیکھو کسی نہ کسی گرہ کے کھولنے میں اُلجھا ہوا ہے مگر گرہیں ہیں کہ کھلنے کا نام نہیں لیتیں۔ سب سے پہلا مسئلہ باورچی کا پیش آنا تھا اور پیش آیا۔ باہر کا کوئی آدمی رکھا نہیں جا سکتا کیونکہ وہ قیدی بن کر رہنے کیوں لگا؟ اور قیدیوں میں ضروری نہیں کہ باورچی نکل آئے۔ قیدی باورچی جبھی مل سکتا ہے کہ پہلے کوئی قرینے کا باورچی ذوقِ جرائم پیشگی میں اتنی ترقی کرے کہ پکڑا جائے اور پکڑا بھی جائے کسی اچھے خاصے جرم میں کہ اچھی مدّت کے لئے سزا دی جا سکے لیکن ایسا حسنِ اتفاق گاہ گاہ ہی پیش آ سکتا ہے اور آج کل تو سوءِ اتفاق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے کے باورچیوں میں کوئی مردِ میدان رہا ہی نہیں۔ انسپکٹر جنرل جب آیا تھا تو کہتا تھا پروڈا جیل میں ہر گروہ اور پیشے کے قیدی موجود

ہیں مگر باورچیوں کا کال ہے۔ نہیں معلوم ان کمبختوں کو کیا ہو گیا ہے :

کس نہ دارد ذوقِ مستی مے گساراں را چہ شد

جو قیدی یہاں چن کر کام کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں ان میں سے دو قیدیوں پر باورچی ہونے کی تہمت لگائی گئی تھی :

ستم رسیدہ یکے، نا امیدوار یکے!

حالانکہ دونوں اس الزام سے بالکل معصوم واقع ہوئے ہیں اور زبانِ حال سے نظیری کا یہ شعر دُہرا رہے ہیں۔ داد دیجیے گا، کہاں کی بات کہاں لا کر ڈالی ہے اور کیا برمحل بیٹھی ہے :

تا منفعل ز رنجشِ بے جا نہ بینمش

می آرم اعترافِ گناہِ نہ کردہ را

چیتہ خاں یہاں آتے ہی اس عقدۂ لاینحل کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ روز اپنی طلب و جستجو کی ناکامیوں کی کہانیاں سناتا :

اگر دستے کنم پیدا، نہ می یابم گریباں را

ایک دن خوش خوش آیا اور یہ خبر سنائی کہ ایک بہت اچھے باورچی کا شہر میں انتظام ہو گیا ہے۔ کلکٹر نے ابھی فون کے ذریعے خبر دی ہے کہ کل سے کام پر لگ جائے گا :

صبا بہ خوش خبری ہُدہُدِ سلیمان ست

کہ مژدۂ طرب از گلشنِ سبا آورد

دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ واقعی ایک جیتا جاگتا آدمی اندر لایا گیا ہے۔ معلوم ہوا طباخِ موعود یہی ہے :

آخر آمد زپسِ پردہ تقدیر پدید!

مگر نہیں معلوم اس غریب پر کیا بیتی تھی کہ آنے کو تو آ گیا۔ لیکن کچھ ایسا کھویا ہوا اور

سراسیمہ حال تھا، جیسے مصیبتوں کا پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑا ہو۔ وہ کھانا کیا پکانا، اپنے ہوش و حواس کا مسالا کوٹنے لگا:

اُڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا!

بعد کو اس معاملے کی جو تفصیلات کُھلیں، اُن سے معلوم ہوا کہ یہ شکار واقعی کلکٹر ہی کے جال میں پھنسا تھا۔ کچھ تو اُس کے زورِ حکومت نے کام دیا، کچھ ساٹھ روپے ماہانہ تنخواہ کی ترغیب نے؛ اور یہ اجل رسیدہ دام میں پھنس گیا۔ اگر اُسے بلاتاخیر قلعے میں فوراً پہنچا دیا جاتا تو ممکن ہے کچھ دنوں تک جال میں پھنسا رہتا، لیکن اب ایک اور مشکل پیش آ گئی۔ یہاں کے کمانڈنگ آفیسر سے باورچی رکھنے کے بارے میں ابھی بات چیت ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ پونا کے صدر دفتر کی ہدایت کا انتظار کر رہا تھا، اور اس لیے اس شکار کو فوراً قلعے کے اندر لے جا نہیں سکتا تھا۔ اب اگر اُسے اپنے گھر جانے کا موقع دیا جاتا ہے تو اندیشہ ہے کہ شہر میں چرچا پھیل جائے گا، اور بہت ممکن ہے، کوئی موقع طلب اس معاملے سے بروقت فائدہ اُٹھا کر باورچی کو نامہ و پیام کا ذریعہ بنا لے۔ اگر روک لیا جاتا ہے تو پھر رکھا کہاں جائے کہ زیادہ سے زیادہ محفوظ جگہ ہو اور باہر کا کوئی آدمی وہاں تک پہنچ نہ سکے؟

یہ بعدِ از انفصال اب اور ہی جھگڑا نکل آیا!

اسے کلکٹر کے یارانِ طریقت کی عقلمندی سمجھیے یا بے وقوفی کہ اُسے بہلا پھسلا کر یہاں کے مقامی قید خانے میں بھیج دیا۔ کیونکہ اُن کے خیال میں قلعے کے علاوہ اگر کوئی اور محفوظ جگہ یہاں ہو سکتی تھی تو وہ قید خانے کی کوٹھری ہی تھی۔ قید خانے میں جو اُسے ایک رات دن قید و بند کے توے پر سینکا گیا تو بھوننے تلنے کی ساری ترکیبیں بھول گیا۔ اس احمق کو کیا معلوم تھا کہ ساٹھ روپے کے عشق میں یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے؟ اس ابتدائے عشق ہی نے کچھ مر نکال دیا تھا۔ قلعے تک پہنچتے پہنچتے قلیہ بھی طیار ہو گیا؛

کہ عشق آساں نمود اوّل، ولے افتاد مشکل ہا!

بہر حال دو دن تو اُس نے کسی نہ کسی طرح نکال دیے۔ تیسرے دن ہوش و حواس کی طرح صبر و قرار نے بھی جواب دے دیا۔ میں صبح کے وقت کمرے کے اندر بیٹھا لکھ رہا تھا کہ اچانک کیا سنتا ہوں جیسے باہر ایک عجیب طرح کا مخلوط شور و غل ہو رہا ہو۔ 'مخلوط' اس لیے کہنا پڑا کہ صرف آوازوں ہی کا غل نہیں تھا۔ رونے کی چیخیں بھی ملی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی آدمی گھٹی ہوئی آواز میں کچھ کہتا جاتا ہے اور بیچ بیچ میں روتا بھی جاتا ہے۔ گویا وہ صورتِ حال ہے جو خسرو نے سخن کشانِ عشق کی سنائی تھی کہ:

قدمے گریہ، وہم بر سرِ افسانہ روو!

باہر نکلا تو سامنے کے برآمدے میں ایک عجیب منظر دکھائی دیا۔ چیتہ خاں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا ہے، سامنے باورچی زمین پر لوٹ رہا ہے۔ تمام وارڈرز حلقہ باندھے کھڑے ہیں۔ قیدیوں کی قطار صحن میں صف بستہ ہو رہی ہے اور ہمارے قافلے کے تمام زندانی بھی ایک ایک کر کے کمروں سے نکل آئے ہیں۔ گویا اس خرابے کی ساری آبادی وہیں سمٹ آئی ہے:

آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں!

چیتہ خاں کہ رہا ہے، تمھیں کوئی اختیار نہیں کہ یہاں سے نکلو۔ باورچی چیختا ہے کہ مجھے پورا اختیار ہے۔ تمھیں کوئی اختیار نہیں کہ مجھے روکو۔ جبر و اختیار Determinism and free will کا یہ مناظرہ سن کر مجھے بے اختیار نعمت خاں عالی کا وہ قطعہ یاد آ گیا جو اُس نے مختار خاں کی ہجو میں کہا تھا اور جس کی شرح لکھنے میں صاحب خزانہ عامرہ نے بڑی مغز پاشی کی ہے:

ایں دلیل از جبر مے آورد او از اختیار
ایں سخن ہم درمیاں ماندہ ست امرِ بین بین

باورچی اُن لوگوں میں معلوم ہوتا تھا جن کی نسبت کہا گیا ہے کہ:

قومے بہ جدّ و جہد گرفتند وصلِ دوست

مگر چیتیہ خاں اس بات پر زور دیتا تھا کہ:

قومے دگر حوالہ بہ تقدیر می کنند!

جیلر نے خیال کیا کہ حقیقتِ حال کچھ ہی ہو۔ مگر "بین الجبر و الاختیار"[1] کا مذہب اختیار کیے بغیر چارہ نہیں۔ اس کی نظر اشاعرہ کے "کسب" اور شوپن ہار کے ارادے پر گئی:

گناہ گرچہ نہ بود اختیارِ ما حافظ

تو در طریقِ ادب کوش وگو گناہِ من ست

اُس نے باورچی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس طرح کی ہٹ ٹھیک نہیں۔ کسی نہ کسی طرح ایک مہینا نکال دو، پھر تمھیں گھر جانے کی اجازت مل جائے گی۔

مُرغِ زیرک چوں بہ دام اُفتد تحمّل بایدش

لیکن اس کا معاملہ اب نصیحت پذیروں کی حد سے گزر چکا تھا:

نکل چکا ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے!

ایک جینے کی بات جو اُس نے سُنی تو اور کپڑے پھاڑنے لگا:

دل سے دیوانے کو مت چھیڑ، یہ زنجیر نہ کھینچ

شام کو چیتیہ خاں اس طرف آیا تو میں نے اس سے کہا کہ اس طرح مجبور کر کے کسی آدمی کو رکھنا ٹھیک نہیں۔ اسے فوراً رخصت کر دیا جائے۔ اگر اُسے جبراً رکھا گیا تو یہ

---

[1] یعنی "ڈیٹرمنزم اور فری ول" کے درمیان راہ نکالنے کا مذہب جیسا کہ مسلمان متکلموں میں اشاعرہ اختیار کیا۔ وہ کہتے ہیں، اگرچہ انسان خدا کی قدرت کے احاطے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ مگر اسے 'کسب' کی قوت حاصل ہے۔ یعنی ارادے کے ساتھ کام کرنے اور اس کے اثرات کسب کرنے کی قوت حاصل ہے اگرچہ اس کا ارادہ بھی خود اس کے بس کی چیز نہیں۔ دراصل اشاعرہ کا کسب بھی مذہبِ جبر کی ہی ایک دوسری تعبیر ہے۔ شوپن ہار نے اسی اعتقاد کو یوں تعبیر کیا کہ ہمارے تمام افعال کی تہ میں ہمارا ارادہ کام کرتا ہے اگرچہ ہمارا ارادہ ہمارے اختیار میں نہیں۔

کا پکایا ہوا کھانا چھوڑنے والے نہیں۔ چنانچہ دوسرے دن اُسے رہائی مل گئی۔ اتوار کے دن حسبِ معمول کلکٹر آیا تو معلوم ہوا جس دن چھوٹا تھا، اسی دن اُس نے اپنا بستر اسنبھالا اور سیدھا ریلوے اسٹیشن کا رُخ کیا۔ پیچھے مُڑکر دیکھا تک نہیں:

کردہ ام توبہ، واز توبہ پشیماں شدہ ام
کافرم، باز نہ گوئی کہ مسلماں شدہ ام

یہ تو باورچی کی سرگزشت ہوئی۔ لیکن یہاں کوئی دن نہیں جاتا کہ کوئی نہ کوئی نئی سرگزشت پیش نہ آتی ہو۔ باورچی کے بعد حجام کا مسئلہ پیش آیا۔ ابھی وہ حل نہیں ہوا تھا کہ دھوبی کے سوال نے سر اُٹھایا۔ چیتہ خاں کا سارا وقت ناخن تیز کرنے میں بسر ہوتا ہے۔ مگر رشتہ کار میں کچھ ایسی گانٹھیں پڑ گئی ہیں کہ کھُلنے کا نام نہیں لیتیں، یہ وہی غالب والا حال ہوا کہ:

پہلے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اُمید میں گانٹھ
پیچھے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

ابو الکلام

حکایت بادۂ و تریاک

قلعہ احمد نگر

۲۷ اگست ۱۹۴۲ء

صدیقِ مکرم !

انسان اپنی ایک زندگی کے اندر کتنی ہی مختلف زندگیاں بسر کرتا ہے۔ مجھے بھی اپنی زندگی کی دو قسمیں کر دینی پڑیں۔ ایک قید خانے سے باہر کی، ایک اندر کی :

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در اقلیمِ عشق
روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست!

دونوں زندگیوں کے مرقعوں کی الگ الگ رنگ و روغن سے نقش آرائی ہوئی ہے۔ آپ شاید ایک کو دیکھ کر دوسری کو پہچان نہ سکیں :

لباسِ صورت اگر واژگوں کنم بینند
کہ خرقۂ خشنم مایۂ طلاباف است

قید سے باہر کی زندگی میں اپنی طبیعت کی افتاد بدل نہیں سکتا۔ خود رفتگی اور خود مشغولی مزاج پہ چھائی رہتی ہے۔ دماغ اپنی فکروں سے باہر نہیں آنا چاہتا اور دل اپنی نقش آرائیوں کا گوشہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ بزم و انجمن کے لیے بارِ خاطر نہیں ہوتا لیکن یارِ شاطر بھی بہت کم بن سکتا ہوں :

تا کے چو موج بحر ہمہ سو شتافتن
در عینِ بحر پائے چو گرداب بند کن!

لیکن جونہی حالات کی رفتار قید و بند کا پیام لاتی ہے۔ میں کوشش کرنے لگتا ہوں کہ اپنے آپ کو یک قلم بدل دوں۔ میں اپنا پچھلا دماغ سر سے نکال دیتا ہوں اور ایک نئے دماغ سے اس کی جگہ بھرنی چاہتا ہوں۔ حریمِ دل کے طاقوں کو دیکھتا ہوں کہ خالی

ہو گئے تو کوشش کرتا ہوں کہ نئے نئے نقش و نگار بناؤں اور اُنھیں پھر سے آراستہ کر دوں:

وقتست و گر بُت کدہ سازند حرم را!

اس تحوّلِ صورت یا Metamorphism کے عمل میں کہاں تک مجھے کامیابی ہوتی ہے؟ اس کا فیصلہ تو دوسروں ہی کی نگاہیں کر سکیں گی، لیکن خود میرے فریبِ حال کے لیے اتنی کامیابی بس کرتی ہے کہ اکثر اوقات اپنی پچھلی زندگی کو بھولا رہتا ہوں اور جب تک اُس کے سراغ میں نہ نکلوں، اُسے واپس نہیں لا سکتا:

دل کہ جمع ست، غم از بے سروسامانی نیست
فکرِ جمعیت اگر نیست، پریشانی نیست

اگر آپ مجھے اس عالم میں دیکھیں تو خیال کریں، میری پچھلی زندگی مجھے قید خانے کے دروازے تک پہنچا کر واپس چلی گئی اور اب ایک دوسری ہی زندگی سے سابقہ پڑا ہے۔ جو زندگی کل تک اپنی حالتوں میں گم، اور خوش کامیوں اور دل شگفتگیوں سے بہت کم آشنا تھی۔ آج اچانک ایک ایسی زندگی کے قالب میں ڈھل گئی جو شگفتہ مزاجیوں اور خندہ رویوں کے سوا اور کسی بات سے آشنا ہی نہیں، ہر وقت خوش رہو اور ہر ناگوار حالت کو خوشگوار بناؤ، جس کا دستور العمل ہے:

حاصلِ کارگہِ کون و مکاں ایں ہمہ نیست
بادہ پیش آر کہ اسبابِ جہاں ایں ہمہ نیست
پنج روزے کہ دریں مرحلہ مہلت داری
خوش بیاسائے زمانے کہ زماں ایں ہمہ نیست

میں نے قید خانے کی زندگی دو متضاد فلسفوں سے ترکیب دی ہے۔ اس میں ایک جز رواقیہ Stoics کا ہے ایک لذتیہ Epicurean کا،

نیمہ را آشتی ایں جا بہ شرار افتاد ست

جہاں تک حالات کی ناگواریوں کا تعلق ہے۔ رواقیت سے اُن کے زخموں پر مرہم لگاتا ہوں اور اُن کی چبھن بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں:

ہر وقتِ بد کہ روئے، آبِ سیلِ رواں
ہر نقشِ خوش کہ جلوہ کند، موجِ آب گیر!

جہاں تک زندگی کی خوشگواریوں کا تعلق ہے، لذتیہ کا زاویۂ نگاہ کام میں لاتا ہوں اور خوش رہتا ہوں:

ہر وقتِ خوش کہ دست دہد مغتنم شمار
کس را وقوف نیست کہ انجامِ کار چیست!

میں نے اپنے کاک ٹیل Cock tail کے جام میں دونوں بوتلیں انڈیل دیں۔ میرا ذوقِ بادہ آشامی بغیر اس جامِ مرکب کے تسکین نہیں پا سکتا تھا۔ اسے قدیم تعبیر میں یوں سمجھیے کہ گویا حکایتِ بادہ و تریاک میں نے تازہ کر دی ہے:

چناں افیون ساقی در مے افگند ۔۔۔ حریفاں را نہ سر ماند و نہ دستار!

البتہ کاک ٹیل کا یہ نسخۂ خاص ہر خامکار کے بس کی چیز نہیں ہے۔ صرف بادہ گسارانِ کہن مشق ہی اسے کام میں لا سکتے ہیں۔ ورموتھ Vermouth اور جن Gin کا مرکب پینے والے اس رطلِ گراں کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔ مولانائے روم نے ایسے ہی معاملات کی طرف اشارہ کیا تھا:

بادۂ آں در خورِ ہر ہوش نیست ۔۔۔ حلقۂ آں سخرۂ ہر گوش نیست!

آپ کہیں گے، قید خانے کی زندگی رواقیت کے لیے تو موزوں ہوئی کہ زندگی کے رنج و راحت سے بے پروا بنا دینا چاہتی ہے لیکن لذتیہ کی عشرت اندوزیوں کا وہاں کیا موقع ہوا؟ جو نامراد قید خانے سے باہر کی آزادیوں میں بھی زندگی کی عیش کوشیوں سے تہی دست رہتے ہیں، اُنھیں قید و بند کی محروم زندگی میں اس کا سر و سامان کہاں میسر آ سکتا ہے؟ لیکن میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ انسان کا اصلی عیش دماغ کا عیش ہے۔ جسم کا نہیں ہے۔

میں لذتیت سے اُن کا دماغ لے لیتا ہوں۔ جسم اُن کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ داغ مرحوم نے ناصح سے صرف اس کی زبان لے لینی چاہی تھی :

ملے جو حشر میں لے لوں زبان ناصح کی
عجیب چیز ہے یہ طولِ مدّعا کے لیے

اور غور کیجئے تو یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہی ہے کہ سروسامانِ کار ہمیشہ اپنے سے باہر ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اگر یہ پردۂ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے کہ وہ ہم سے باہر نہیں ہے خود ہمارے اندر ہی موجود ہے۔ عیش و مسرت کی جن گل شگفتگیوں کو ہم چاروں طرف ڈھونڈتے ہیں اور نہیں پاتے وہ ہمارے نہاں خانۂ دل کے چمن زاروں میں ہمیشہ کھلتے اور مرجھاتے رہتے ہیں لیکن محرومی ساری یہ ہوئی کہ ہمیں چاروں طرف کی خبر ہے مگر خود اپنی خبر نہیں۔ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ۔

کہیں تجھ کو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈا
پھر آخر دل ہی میں پایا، بغل ہی میں سے تُو نکلا

جنگل کے مور کو کبھی باغ و چمن کی جستجو نہیں ہوتی۔ اُس کا چمن خود اُس کی بغل میں موجود رہتا ہے۔ جہاں کہیں اپنے پَر کھول دے گا، ایک چمنستانِ بوقلموں کھل جائے گا :

نہ با صحرا سرے دارم، نہ باگلزار سودائے
بہر جا می روم، از خویش می جوشد تماشائے

قید خانے کی چار دیواری کے اندر بھی سورج ہر روز چمکتا ہے اور چاندنی راتوں نے کبھی قیدی اور غیر قیدی میں امتیاز نہیں کیا۔ اندھیری راتوں میں جب آسمان کی قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں، تو وہ صرف قید خانے کے باہر ہی نہیں چمکتیں، اسیرانِ قید و محن کو بھی اپنی جلوہ فروشیوں کا پیام بھیجتی رہتی ہیں۔ صبح جب طلباشیر بکھیرتی ہوئی آئے گی اور شام جب شفق کی گلگوں چادریں پھیلانے لگے گی تو صرف عشرت سراؤں کے دریچوں ہی سے ان کا نظارہ نہیں کیا جائے گا، قید خانے کے روزنوں سے لگی ہوئی نگاہیں بھی انھیں دیکھ

لیا کریں گی۔ فطرت نے انسان کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کو شاد کام رکھے، کسی کو محروم کر دے۔ وہ جب کبھی اپنے چہرے سے نقاب اُلٹتی ہے تو سب کو یکساں طور پر نظارۂ حُسن کی دعوت دیتی ہے۔ یہ ہماری غفلت اندیشی ہے کہ نظر اُٹھا کر دیکھتے نہیں اور صرف اپنے گردوپیش ہی میں کھوئے رہتے ہیں:

محرم نہیں ہے تُو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں، کبھی چاندنی کی حُسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح و شام چہکیں، اُسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرّت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے؟ یہاں سروسامانِ کار کی تو اتنی فراوانی ہوئی کہ کسی گوشے میں بھی گم نہیں ہو سکتا۔ مصیبت ساری یہ ہے کہ خود ہمارا دل و دماغ ہی گم ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے سے باہر ساری چیزیں ڈھونڈتے رہیں گے مگر اپنے کھوئے ہوئے دل کو کبھی نہیں ڈھونڈیں گے حالانکہ اگر اُسے ڈھونڈ نکالیں تو عیش و مسرّت کا سامان اسی کوٹھری کے اندر سمٹا ہُوا مل جائے:

بغیرِ دل ہمہ نقش و نگار بے معنی ست
ہمیں ورق کہ سیہ گشت، مدعا اینجاست!

دیوان و محل نہ ہوں تو کسی درخت کے سائے سے کام لے لیں، دیبا و مخمل کا فرش نہ ملے تو سبزۂ خودرو کے فرش پر جا بیٹھیں۔ اگر برقی روشنی کے کنول میسر نہیں ہیں تو آسمان کی قندیلوں کو کون بُجھا سکتا ہے؟ اگر دُنیا کی ساری مصنوعی خوشنمائیاں اوجھل ہو گئی ہیں تو ہو جائیں، صبح اب بھی ہر روز مسکرائے گی، چاندنی اب بھی ہمیشہ جلوہ فروشیاں کرے گی۔ لیکن اگر دل زندہ پہلو میں نہ رہے تو خدارا بتلائیے اس کا بدل کہاں ڈھونڈیں؟ اس کی خالی جگہ بھرنے کے لیے کس چولھے کے انگارے کام دیں گے؟

مجھے یہ ڈر ہے، دلِ زندہ! تُو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے!

میں آپ کو بتلاؤں، اس راہ میں میری کامرانیوں کا راز کیا ہے؟ میں اپنے دل کو مرنے نہیں دیتا۔ کوئی حالت ہو، کوئی جگہ ہو، اُس کی تڑپ کبھی دھیمی نہیں پڑے گی۔ میں جانتا ہوں کہ جہانِ زندگی کی ساری رونقیں اسی میکدۂ خلوت کے دم سے ہیں۔ یہ اجڑا اور ساری دنیا اُجڑ گئی:

از صد سخنِ پیرم یک حرف مرا یاد است
"عالم نہ شود ویراں تا میکدہ آباد است"

باہر کے سارے ساز و سامانِ عشرت مجھ سے چھن جائیں لیکن جب تک یہ نہیں چھنتا، میرے عیش و طرب کی سرمستیاں کون چھین سکتا ہے؟

دیدمش خرم و خنداں قدحِ بادہ بدست
واندراں آئینہ صد گونہ تماشا می کرد
گفتم "ایں جامِ جہاں بیں بتو کے داد حکیم؟"
گفت "آں روز کہ ایں گنبدِ مینا میکرد!"

آپ کو معلوم ہے، میں ہمیشہ صبح تین سے چار بجے کے اندر اٹھتا ہوں اور چائے کے پیہم فنجانوں سے جامِ صبوحی کا کام لیا کرتا ہوں، خواجہ شیراز کی طرح میری صدا بھی یہی ہوتی ہے کہ:

خورشیدِ مے ز مشرقِ ساغر طلوع کرد — گر برگِ عیش می طلبی ترکِ خواب کن!

یہ وقت ہمیشہ میرے اوقاتِ زندگی کا سب سے زیادہ پُرکیف وقت ہوتا ہے لیکن قید خانے کی زندگی میں تو اُس کی سرمستیاں اور خود فراموشیاں ایک دوسرا ہی عالم پیدا کر دیتی ہیں۔ یہاں کوئی آدمی ایسا نہیں ہوتا، جو اس وقت خواب آلود آنکھیں لیے ہوئے اُٹھے اور قرینے سے چائے بنا کر میرے سامنے دھر دے۔ اس لیے خود اپنے ہی دستِ شوق کی سرگرمیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ میں اُس وقت بادۂ کہن کے شیشے کی جگہ چینی چائے کا تازہ ڈبا کھولتا ہوں

اور ایک ماہرِ فن کی دقیقہ سنجیوں کے ساتھ چائے دم دیتا ہوں۔ پھر جام و صراحی کو میز پر دہنی طرف جگہ دوں گا کہ اس کی اوّلیت اسی کی مستحق ہوئی۔ قلم و کاغذ کو بائیں طرف رکھوں گا کہ سرو سامانِ کار میں ان کی جگہ دوسری ہوئی۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاؤں گا اور کچھ نہ پوچھیے، کہ بیٹھتے ہی کس عالم میں پہنچ جاؤں گا؟ کسی بادہ گسار نے شامپین اور بورڈو کے صد سالہ تہ خانوں کے عرقِ کہن سال میں بھی وہ کیف و سرور کہاں پایا ہوگا جو چائے کے اس دورِ صبح گاہی کا ہر گھونٹ میرے لیے مہیّا کر دیتا ہے:

ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذّتِ شربِ مدامِ ما!

آپ کو معلوم ہے کہ میں چائے کے لیے رُوسی فنجان کام میں لاتا ہوں۔ یہ چائے کی معمولی پیالیوں سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر بے ذوقی کے ساتھ پیجیے تو دو گھونٹ میں ختم ہو جائیں مگر خدا نخواستہ میں ایسی بے ذوقی کا مرتکب کیوں ہونے لگا؟ میں جرعہ کشانِ کہن مشق کی طرح ٹھہر ٹھہر کر پیوں گا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لوں گا۔ پھر جب پہلا فنجان ختم ہو جائے گا تو کچھ دیر کے لیے رُک جاؤں گا اور اس درمیانی وقفے کو امتدادِ کیف کے لیے جتنا طول دے سکتا ہوں طول دوں گا۔ پھر دوسرے اور تیسرے کے لیے ہاتھ بڑھاؤں گا اور دُنیا کو اور اُس کے سارے کارخانۂ سود و زیاں کو یک قلم فراموش کر دوں گا:

خوشتر از فکرِ مے و جام چہ خواہد بودن
تا بہ بینیم، سرِ انجام چہ خواہد بودن

اس وقت بھی کہ یہ سطریں بے اختیار نوکِ قلم سے نکل رہی ہیں، اُسی عالم میں ہوں اور نہیں جانتا کہ ۹ر اگست کی صبح کے بعد سے دنیا کا کیا حال ہُوا اور اب کیا ہو رہا ہے:

شرابِ تلخ دہ ساقی کہ مرد افگن بود زورش
کہ تا یک دم بیا سایم ز دُنیا و شر و شورش
کمندِ صیدِ بہرامی بیفگن، جامِ مے بردار
کہ من پیمودم ایں صحرا نہ بہرام ست نے گورش

میرا دوسرا پُرکیف وقت دوپہر کا ہوتا ہے یا زیادہ صحتِ تعیّن کے ساتھ کہوں کہ زوال کا ہوتا ہے۔ لکھتے لکھتے تھک جاتا ہوں تو تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاتا ہوں۔ پھر اُٹھتا ہوں غسل کرتا ہوں، چائے کا دور تازہ کرتا ہوں اور تازہ دم ہو کر پھر اپنی مشغولیتوں میں گم ہو جاتا ہوں۔ اُس وقت آسمان کی بے داغ نیلگونی اور سورج کی بے نقاب درخشندگی کا جی بھر کے نظارہ کروں گا اور رواقِ دل کا ایک ایک دریچہ کھول دوں گا۔ گوشہ ہائے خاطر افسردگیوں اور گرفتگیوں سے کتنے ہی غبار آلود ہوں لیکن آسمان کی کشادہ پیشانی اور سورج کی چمکتی ہوئی خندہ روئی دیکھ کر ممکن نہیں کہ اچانک روشن نہ ہو جائیں:

بازم بہ کلبہ کیست، نہ شمع و نہ آفتاب
بام و درم ز ذرّہ و پروانہ پُر شدہ ست!

لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں کے لیے کام میں لائیں لیکن نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہوئی یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا۔ یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی نہ ہُوا کہ مر جائیے اور اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہ ہُوا کہ زندہ رہیئے۔ جس نے یہ مشکل حل کر لی اس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے دیا:

ناصحم گفت کہ جُز غم چہ ہُنر دارد عشق
گفتم "اے خواجۂ عاقل! ہُنرے بہتر ازیں!"

غالباً قدیم چینیوں نے زندگی کے مسئلے کو دوسری قوموں سے بہتر سمجھا تھا۔ ایک پُرانے چینی مقولے میں سوال کیا گیا ہے "سب سے زیادہ دانش مند آدمی کون ہے؟" پھر جواب دیا ہے "جو سب سے زیادہ خوش رہتا ہے۔" اس سے ہم چینی فلسفۂ زندگی کا زاویۂ نگاہ معلوم کر سکتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ بالکل سچ ہے:

نہ ہر درخت تحمّل کند جفائے خزاں
غلامِ ہمّتِ سروم کہ ایں قدم دارد!

اگر آپ نے یہاں ہر حال میں خوش رہنے کا ہُنر سیکھ لیا ہے۔ تو یقین کیجیے کہ زندگی کا سب سے بڑا کام سیکھ لیا۔ اب اس کے بعد اس سوال کی گنجائش ہی نہیں رہی کہ آپ نے اور کیا کیا سیکھا؟ خود بھی خوش رہیے اور دوسروں سے بھی کہتے رہیے کہ اپنے چہروں کو غمگین نہ بنائیں:

چو مہمانِ خراباتی بعزت باش با رنداں
کہ دردِ سر کشی جاناں، گر ایں مستی خمار آرد

زمانۂ حال کے ایک فرانسیسی اہلِ قلم آندری ژید (Andre Gide) کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی جو اُس نے اپنی خود نوشتہ سوانح میں لکھی ہے۔ خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے۔ یعنی ہماری انفرادی زندگی کی نوعیت کا اثر صرف ہم ہی تک محدود نہیں رہتا۔ وہ دوسروں تک بھی متعدی ہوتا ہے یا یوں کہیئے کہ ہماری ہر حالت کی چھوت دوسروں کو بھی لگتی ہے۔ اس لیے ہمارا اخلاقی فرض ہوا کہ خود افسردہ خاطر ہو کر دوسروں کو افسردہ خاطر نہ بنائیں:

افسردہ دل افسردہ کُند انجمنے را

ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔ یہاں ہر چہرے کا عکس بیک وقت سینکڑوں آئینوں میں پڑنے لگتا ہے۔ اگر ایک چہرے پر بھی غبار آ جائے گا تو سینکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائیں گے۔ ہم میں سے ہر فرد کی زندگی محض ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے وہ پورے مجموعے کا حادثہ ہے، دریا کی سطح پر ایک لہر تنہا اُٹھتی ہے لیکن اسی ایک لہر سے بے شمار لہریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں ہماری کوئی بات بھی صرف ہماری نہیں ہوتی۔ ہم جو کچھ اپنے لیے کرتے ہیں اُس میں بھی دوسروں کا حصہ ہوتا ہے۔ ہماری کوئی خوشی بھی ہمیں خوش نہیں کر سکے گی اگر ہمارے چاروں طرف غمناک چہرے اکٹھے ہو جائیں گے۔ ہم خود خوش رہ کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خود خوش ہونے لگتے ہیں۔ یہی حقیقت ہے جسے عرفی نے اپنے شاعرانہ پیرائے میں ادا کیا تھا:

بدیدارِ تو دل شاد اند باہم دوستانِ تو
ترا ہم شادماں خواہم چو رشکِ دوستاں بینی!

یہ عجیب بات ہے کہ مذہب، فلسفہ اور اخلاق، تینوں نے زندگی کا مسئلہ حل کرنا چاہا اور تینوں میں خود زندگی کے خلاف رجحان پیدا ہو گیا۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ایک آدمی جتنا زیادہ بجھا دل اور سوکھا چہرہ لیے کر پھرے گا اتنا ہی زیادہ مذہبی، فلسفی اور اخلاقی قسم کا ہو گا۔ گویا علم اور تقدس، دونوں کے لیے یہاں ماتمی زندگی ضروری ہوئی۔ زندگی کی تحقیر اور توہین صرف یونان کے کلبیہ Cynics ہی کا شعار نہ تھا۔ بلکہ رواقی Stoic اور مشائی Peripatetic نقطۂ نگاہ میں بھی اس کے عناصر برابر کام کرتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ افسردہ دلی اور ترش روئی فلسفیانہ مزاج کا ایک نمایاں خط و خال بن گئی۔ اخلاق سے اگر اس کے مذہب طمانیت و مسرت Eudamonism اور مادّیاتی مذہب عشرت Hedonism کے تصورات مستثنیٰ کر دیجیے تو اس کا عام طبعی مزاج بھی فلسفیانہ سرگرانی سے خالی نہیں ملے گا۔ مذہب اور روحانیات کی دنیا میں تو زہدِ خشک اور طبعِ خناک کی اتنی گرم بازاری ہوئی کہ اب زہد مزاجی اور حق آگاہی کے ساتھ کسی ہنستے ہوئے چہرے کا تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا۔ دینداری اور ثقالتِ طبع تقریباً مرادف لفظ بن گئے ہیں یہاں تک کہ قاآنی کو کہنا پڑا تھا:

اسبابِ طرب را ببر از مجلس بیرون
زاں پیش کہ ناگاہ ثقیلے رسد از در

آپ جانتے ہیں کہ اہلِ ذوق کی مجلسِ طرب تنگ دلوں کے گوشۂ خاطر کی طرح تنگ نہیں ہوتی۔ اس کی وسعت میں بڑی سمائی ہے۔ نظامی گنجوی نے اس کی تصویر کھینچی تھی:

ہر چہ در جملہ یہ آفاق دریں جا حاضر
مومن و ارمنی و گبر و نصارا و یہود!

لیکن اتنی سمائی ہونے پر بھی اگر کسی چیز کی وہاں گنجائش نہ نکل سکی تو وہ زاہدانِ خشک

کے ضخیم اور گنبد نما عمامے تھے۔ ایک عمامہ بھی پہنچ جاتا ہے تو پوری مجلس تنگ ہو جاتی ہے۔ اسی لیے بعض یارانِ بے تکلف کو کہنا پڑا تھا:

در مجلسِ ما زاہد! زنہار تکلف نیست
البتہ تو می گنجی، عمامہ نمی گنجد!

یہ سچ ہے کہ جن مسئلوں کو دُنیا سینکڑوں برس کی کاوشوں سے بھی حل نہ کر سکی، آج ہم اپنی خوش طبعی کے چند لطیفوں سے انھیں حل نہیں کر دے سکتے۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ یہاں ایک حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک فلسفی، ایک زاہد، ایک سادھو کا خشک چہرہ بنا کر ہم اُس مرقع میں کھپ نہیں سکتے جو نقاشِ فطرت کے مُوقلم نے یہاں کھینچ دیا ہے۔ جس مرقع میں سُورج کی چمکتی ہوئی پیشانی، چاند کا ہنستا ہوا چہرہ، ستاروں کی چشمک، درختوں کا رقص، پرندوں کا نغمہ، آبِ رواں کا ترنم اور پھولوں کی رنگین ادائیں اپنی اپنی جلوہ طرازیاں رکھتی ہوں اُس میں ہم ایک بجھے ہوئے دل اور سوکھے ہوئے چہرے کے ساتھ جگہ پانے کے یقیناً مستحق نہیں ہو سکتے۔ فطرت کی اس بزمِ نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے جو ایک دہکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر رکھتی ہو اور چاندنی میں چاند کی طرح نکھر کر، ستاروں کی چھاؤں میں ستاروں کی طرح چمک کر، پھولوں کی صف میں پھولوں کی طرح کھِل کر اپنی جگہ نکال لے سکتی ہو۔ صائب کیا خوب کہہ گیا ہے:

دریں دو ہفتہ کہ چوں گل دریں گلستانی
کشادہ روئے تر از رازِ مستاں باش!
تمیزِ نیک و بدِ روزگار کارِ تو نیست
چو چشمِ آئنہ، در خوب و زشت حیراں باش!

ابوالکلام

مکتوب

قلعہ احمد نگر
۲۹ اگست ۱۹۴۲ء

این رسم و راہِ تازہ ز حرمانِ عہدِ ماست
عنقا بہ روزگار کسے نامہ بر نہ بود

صدیقِ مکرم!

وہی چار بجے صبح کا جانفزا وقت ہے۔ چائے کا فنجان سامنے دھرا ہے اور طبیعت درازنفسی کے لیے بہانے ڈھونڈھ رہی ہے۔ جانتا ہوں کہ میری صدائیں آپ تک نہیں پہنچ سکیں گی۔ تاہم طبعِ نالہ سنج کو کیا کروں کہ فریاد و شیون کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آپ سُن رہے ہوں، یا نہ سُن رہے ہوں، میرے ذوقِ مخاطبت کے لئے یہ خیال بس کرتا ہے کہ روئے سخن آپ کی طرف ہے:

اگر نہ دیدی تپیدنِ دل، شنیدنی بود نالۂ ما!

بانسری اندر سے خالی ہوتی ہے مگر فریادوں سے بھری ہوتی ہے۔ یہی حال میرا ہے:

بہ فسانۂ ہوسِ طرب، تہی از خودیم و پُر از طلب
چہ دہد ز صنعتِ صفرِ نے[1] بجز اینکہ نالہ فزوں کند

قید و بند کے جتنے تجربے اس وقت تک ہوئے تھے، موجودہ تجربہ اُن سب سے کئی باتوں میں نئی قسم کا ہُوا۔ اب تک یہ صورت رہتی تھی کہ قید خانے کے قواعد کے ماتحت عزیزوں اور دوستوں سے ملنے کا موقع مل جایا کرتا تھا۔ نیز خط و کتابت روکی نہیں جاتی تھی۔ اخبارات دئیے جاتے تھے اور اپنے خرچ سے منگوانے کی بھی اجازت

---

[1] بانسری میں جو سوراخ بنائے جاتے ہیں اُنھیں فارسی میں "صفرِ نے" کہتے ہیں۔ یعنی بانسری کے نقطے۔

ہوتی تھی۔ خاص خاص حالتوں میں اس سے بھی زیادہ دروازہ کھلا رہتا تھا چنانچہ جہاں تک خط و کتابت اور ملاقاتوں کا تعلق ہے۔ مجھے ہمیشہ زیادہ سہولتیں حاصل رہیں۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا کہ گو ہاتھوں میں زنجیریں اور پاؤں میں بیڑیاں پڑ جاتی تھیں لیکن کان بند نہیں ہو جاتے تھے اور آنکھوں پہ پٹیاں نہیں بندھتی تھیں۔ قید و بند کی ساری روکاوٹوں کے ساتھ بھی آدمی محسوس کرتا تھا کہ ابھی تک اسی دُنیا میں بس رہا ہے۔ جہاں گرفتاری سے پہلے رہا کرتا تھا:

زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا!

کھانے پینے اور ساز و سامان کی تکلیفیں اُن لوگوں کو پریشان نہیں کر سکتیں جو جسم کی جگہ دماغ کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ آدمی اپنے آپ کو احساسات کی عام سطح سے ذرا بھی اُونچا کرے تو پھر جسم کی آسائشوں کا فقدان اُسے پریشان نہیں کر سکے گا۔ ہر طرح کی جسمانی راحتوں سے محروم رہ کر بھی ایک مطمئن زندگی بسر کی جا سکتی ہے اور زندگی بہر حال بسر ہو ہی جاتی ہے:

رغبتِ جاہ چہ و نفرتِ اسباب کدام؟
زیں ہوس ہا بگذر یا نہ گزر، می گزرد!

یہ حالت انقطاع و تجرد کا ایک نقشہ بناتی تھی مگر نقشہ ادھورا ہوتا تھا کیونکہ نہ تو باہر کے علاقے پوری طرح منقطع ہو جاتے تھے۔ نہ باہر کی صداؤں کو زنداں کی دیواریں روک سکتی تھیں:

قید میں بھی ترے وحشی کو رہی زُلف کی یاد
ہاں کچھ اِک رنجِ گرانباریِ زنجیر بھی تھا

لیکن اس مرتبہ جو حالت پیش ہوئی۔ اُس نے ایک دوسری ہی طرح کا نقشہ کھینچ دیا۔ باہر کی نہ صرف تمام صورتیں ہی یک قلم نظروں سے اوجھل ہو گئیں بلکہ صدائیں بھی بیک دفعہ رُک گئیں۔ اصحاب کہف کی نسبت کہا گیا ہے کہ فضربنا علیٰ اذانہم

فِی الْکَھْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا، تو ایسی ہی ضرب علی الاذان کی حالت ہم پر بھی طاری ہو گئی گویا جس دُنیا میں بستے تھے وہ دُنیا ہی نہ رہی :

کان لم یکن بین الحجون الی الصّفا
انیس، و لم یسمر بمکۃ سامر!

اچانک ایک نئی دُنیا میں لا کر بند کر دیے گئے جس کا پُورا جغرافیہ ایک سو گز سے زیادہ پھیلاؤ نہیں رکھتا اور جس کی ساری مردم شماری پندرہ زندہ شکلوں سے زیادہ نہیں۔ اسی دنیا میں ہر صبح کی روشنی طلوع ہونے لگی۔ اسی میں ہر شام کی تاریکی پھیلنے لگی :

گویا نہ وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں ہے اب!

اگر کہوں کہ اس ناگہانی صورتِ حال سے طبیعت کا سکون متاثر نہیں ہوا تو یہ صریح بناوٹ ہو گی۔ واقعہ یہ ہے کہ طبیعت متاثر ہوئی اور تیزی اور شدت کے ساتھ ہوئی، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس حالت کی عمر چند گھنٹوں سے زیادہ نہ تھی۔ چنانچہ گرفتاری کے دوسرے ہی دن جب حسبِ معمول علی الصباح اُٹھا اور جام و مینا کا دور گردش میں آیا تو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے طبیعت کا سارا انقباض اچانک دُور ہو رہا تھا اور افسردگی و تنگی کی جگہ انشراح و شگفتگی دل کے دروازے پر دستک دے رہی ہو۔ مخلص خاں عالمگیری نے کیا خوب لف و نشر مرتب کیا ہے۔ اس ذوقِ سخن میں میرا ساتھ دیجیے :

خمارِ ما و درِ توبہ و دلِ ساقی
بیک تبسمِ مینا شکست و بست و کشاد!

اب معلوم ہوا کہ اگرچہ نگاہوں اور کانوں کی ایک محدود دُنیا کھو گئی ہے مگر فکر و تصور کی کتنی ہی نئی دُنیائیں اپنی ساری پہنائیوں اور بے کناریوں کے ساتھ سامنے اُکھڑی ہوئی ہیں۔ اگر ایک دروازے کے بند ہونے پر اتنے دروازے کُھل جا سکتے ہیں تو کون ایسا زیانِ عقل ہو گا جو اس سودے پر گلہ مند ہو :

نقصاں نہیں جنوں میں، بلا سے ہو گھر خراب
دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں!

باقی رہی قید و بند کی تنہائی اور علائق کا انقطاع، تو حقیقت یہ ہے کہ یہ حالت کبھی میرے لیے موجبِ شکایت نہ ہو سکی۔ میں اس سے گریزاں نہیں رہتا، اس کا آرزومند رہتا ہوں۔ تنہائی خواہ کسی حالت میں آئے اور کسی شکل میں، میرے دل کا دروازہ ہمیشہ کھلا پائے گی۔ باطنه فيه الرحمة وظاهره من قبلة العذاب۔

ابتدا ہی سے طبیعت کی افتاد کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی مشغولیتوں کے تقاضے اس طرح وحشت سرشت کے ساتھ نبھائے نہیں جا سکتے۔ اس لئے بہ تکلف خود کو انجمن آرائیوں کا خوگر بنانا پڑتا ہے مگر دل کی طلب ہمیشہ بہانے ڈھونڈتی رہتی ہے۔ جونہی ضرورت کے تقاضوں سے مہلت ملی اور وہ اپنی کامجوئیوں میں لگ گئی:

در خرابا تم نہ دیدستی خراب　　　باده پنداری که پنهاں می زنم

لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں مگر بارہ تیرہ برس کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتاب لے کر کسی گوشے میں جا بیٹھتا اور کوشش کرتا کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں۔ کلکتہ میں آپ نے ڈلہوزی اسکوئر ضرور دیکھا ہو گا۔ جنرل پوسٹ آفس کے سامنے واقع ہے۔ اسے عام طور پر "لال ڈگی" کہا کرتے تھے۔ اس میں درختوں کا ایک جھنڈ تھا کہ باہر سے دیکھیے تو درخت ہی درخت ہیں۔ اندر جائیے تو اچھی خاصی جگہ ہے اور ایک بنچ بھی بچھی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں اب بھی یہ جھنڈ ہے کہ نہیں۔ میں جب سیر کے لیے نکلتا تو کتاب ساتھ لے جاتا اور اس جھنڈ کے اندر بیٹھ کر مطالعے میں غرق ہو جاتا۔ والد مرحوم کے خادمِ خاص حافظ ولی اللہ مرحوم ساتھ ہوا کرتے تھے۔ وہ باہر ٹہلتے رہتے اور جھنجلا جھنجلا کر کہتے: "اگر تجھے کتاب ہی پڑھنی تھی تو گھر سے نکلا کیوں؟" یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور اُن کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔ دریا کے کنارے ایڈن گارڈن میں بھی اس طرح کے کئی جھنڈ تھے۔ ایک جھنڈ، جو برمی پگوڈا کے پاس مصنوعی نہر کے کنارے تھا اور شاید اب بھی ہو، میں نے چُن لیا تھا کیونکہ اس طرف لوگوں کا گزر بہت

کم ہوتا تھا۔ اکثر سہ پہر کے وقت کتاب لے کر نکل جاتا اور شام تک اُس کے اندر گم رہتا۔ اب وہ زمانہ یاد آجاتا ہے تو دل کا عجیب حال ہوتا ہے:

عالمِ بے خبری طرفہ بہشتے بود است
حیف صد حیف کہ ما دیر خبردار شدیم!

کچھ یہ بات نہ تھی کہ کھیل کود اور سیر و تفریح کے وسائل کی کمی ہو۔ میرے چاروں طرف ان کی ترغیبات پھیلی ہوئی تھیں اور کلکتہ جیسا ہنگامہ گرم کُن شہر تھا لیکن میں طبیعت ہی کچھ ایسی لے کر آیا تھا کہ کھیل کود کی طرف رُخ ہی نہیں کرتی تھی،

ہمہ شہر پُر ز خوباں منم و خیالِ ماہے
چہ کُنم کہ چشمِ بدخو نہ کُند بہ کس نگاہے

والد مرحوم میرے اس شوقِ علم سے خوش ہوتے مگر فرماتے۔ یہ لڑکا اپنی تندرستی بگاڑ دے گا۔ معلوم نہیں جسم کی تندرستی بگڑی یا سنوری مگر دل کو تو ایسا روگ لگ گیا کہ پھر کبھی پنپ نہ سکا:

کہ گفتہ بود کہ : ردش دوا پذیر مباد!

میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی جو علم و مشیخت کی بزرگی اور مرجعیت رکھتا تھا اس لیے خلقت کا جو ہجوم و احترام آج کل سیاسی لیڈری کے عروج کا کمال مرتبہ سمجھا جاتا ہے وہ مجھے مذہبی عقیدت مندیوں کی شکل میں بغیر طلب و سعی کے مل گیا تھا۔ میں نے ابھی ہوش نہیں سنبھالا تھا کہ لوگ پیرزادہ سمجھ کر میرے ہاتھ پاؤں چومتے تھے اور ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے رہتے تھے۔ خاندانی پیشوائی و مشیخت کی اس حالت میں نوعمر طبیعتوں کے لیے بڑی ہی آزمائش ہوتی ہے۔ اکثر حالتوں میں ایسا ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے طبیعتیں خود رَو و غلط ہو جاتی ہیں اور نسلی غرور اور پیدائشی خود پرستی کا وہی روگ لگ جاتا ہے جو خاندانی امیر زادوں کی تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ ممکن ہے، اس کے کچھ نہ کچھ اثرات میرے حصہ میں بھی آئے ہوں کیونکہ اپنی چوریاں پکڑنے کے لیے خود اپنے کمین میں

بیٹھنا، جیسا کہ عرفی نے کہا ہے آسان نہیں :

خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا
یک دم منافقانہ نشیں در کمین خویش !

لیکن جہاں تک اپنی حالت کا جائزہ لے سکتا ہوں، مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ میری طبیعت کی قدرتی افتاد مجھے بالکل ہی دوسری طرف لے جا رہی تھی۔ میں خاندانی مریدوں کی ان عقیدت مندانہ پرستاریوں سے خوش نہیں ہوتا تھا بلکہ طبیعت میں ایک طرح کا انقباض اور توحش رہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ اس فضا سے بالکل الگ ہو جاؤں اور کوئی آدمی آکر میرے ہاتھ پاؤں نہ چومے۔ لوگ یہ کمیاب جنس ڈھونڈتے ہیں اور ملتی نہیں، مجھے گھر بیٹھے ملی اور اس کا قدر شناس نہ ہو سکا :

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں !

البتہ سوچتا ہوں تو یہ معاملہ بھی فائدے سے خالی نہ تھا اور یہاں کا کونسا معاملہ ہے جو فائدے سے خالی ہوتا ہے؟ یہی فائدہ کیا کم ہے کہ جس غذا کے لیئے دنیا کی طبیعتیں للچاتی رہتی ہیں، اس سے پہلے ہی دن اپنا جی سیر ہو گیا اور طبیعت میں للچاہٹ باقی نہ رہی۔ فیضی نے ایک شعر ایسا کہا ہے کہ اگر اور کچھ نہ کہتا جب بھی فیضی تھا :

کعبہ را ویراں مکن اے عشق، کانجا یک نفس
گہ گہے پس ماندگان راہ منزل مے کنند !

طبیعت کی اس افتاد نے بڑا کام یہ دیا کہ زمانے کے بہت سے حربے میرے لیے بیکار ہو گئے۔ لوگ اگر میری طرف سے رُخ پھیرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ دل گلہ مند ہو اور زیادہ منت گزار ہوتے لگتا ہے کیونکہ ان کا جو ہجوم لوگوں کو خوشحال کرتا ہے میرے لیئے بسا اوقات ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ میں اگر عوام کا رجوع و ہجوم گوارا کرتا ہوں تو یہ میرے اختیار کی پسند نہیں ہوتی، اضطرار و تکلف کی مجبوری ہوتی ہے۔

میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈا تھا، سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈ نکالا، میرا معاملہ سیاسی زندگی کے ساتھ وہ ہوا جو غالبؔ کا شاعری کے ساتھ ہوا

مانہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

اِسی طرح اگر حالات کی رفتار قید و بند کا باعث ہوتی ہے تو اس حالت کی جو رکاوٹیں اور پابندیاں دوسروں کے لیئے اذیت کا موجب ہوتی ہیں، میرے لیے یکسوئی اور بخود مشغولی کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور کسی طرح بھی طبیعت کو افسردہ نہیں کر سکتیں۔ میں جب کبھی قید خانے میں سُنا کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو قیدِ تنہائی کی سزا دی گئی ہے تو حیران رہ جاتا ہوں کہ تنہائی کی حالت آدمی کے لیئے سزا کیسے ہو سکتی ہے؟ اگر دنیا اسی کو سزا سمجھتی ہے تو کاش ایسی سزائیں عمر بھر کے لیے حاصل کی جا سکیں:

حسد بتہمتِ آزادی سروم بگداخت
کیں مراد نیست کہ بر تہمتِ آں ہم حسد ست!

ایک مرتبہ قید کی حالت میں ایسا ہوا کہ ایک صاحب نے، جو میرے آرام و راحت کا بہت خیال رکھنا چاہتے تھے، مجھے ایک کوٹھڑی میں تنہا دیکھ کر سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت کی۔ سپرنٹنڈنٹ فوراً طیار ہو گیا کہ مجھے ایسی جگہ رکھے جہاں اور لوگ بھی رکھے جا سکیں اور تنہائی کی حالت باقی نہ رہے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے ان حضرت سے کہا "آپ نے مجھے راحت پہنچانی چاہی مگر آپ کو معلوم نہیں کہ جو تھوڑی سی راحت یہاں حاصل تھی وہ بھی آپ کی وجہ سے اب چھنی جا رہی ہے" یہ تو وہی غالبؔ والا معاملہ ہوا کہ:

کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اُس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے!

میں اپنی طبیعت کی اس افتاد سے خوش نہیں ہوں، نہ اسے حسن و خوبی کی کوئی بات سمجھتا ہوں۔ یہ ایک نقص ہے کہ آدمی بزم و انجمن کا حریف نہ ہو اور صحبت و اجتماع کی جگہ

خلوت و تنہائی میں راحت محسوس کرے،

حریفِ صافی و دردی نۂ، خطا اینجاست
تمیز ناخوش و خوش می کنی، بلا اینجاست

لیکن اب طبیعت کا سانچا اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ اُسے توڑا جا سکتا ہے، مگر موڑا نہیں جا سکتا:

قطرہ از تشویشِ موج آخر نہاں شد در صدف
گوشہ گیری ہائے خلق از انفعالِ صحبت ست

اس افتادِ طبیعت کے ہاتھوں ہمیشہ طرح طرح کی بدگمانیوں کا مورد رہتا ہوں اور لوگوں کو حقیقتِ حال سمجھا نہیں سکتا۔ لوگ اس حالت کو غرور و پندار پر محمول کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں میں دوسروں کو بکسر تصور کرتا ہوں اس لیئے ان کی طرف بڑھتا نہیں، حالانکہ خود مجھے اپنا ہی بوجھ اٹھنے نہیں دیتا، دوسروں کی فکر میں کہاں رہ سکتا ہوں؟ غنی کشمیری نے ایک شعر کیا خوب کہا ہے:

طاقتِ برخاستن از گردِ منسا کم نہ ماند
خلق پندارد کہ مے خورد ست مست افتادہ است

سرخوش نے کلمات الشعرا میں جو شعر نقل کیا ہے۔ اس میں 'خلق می داند' ہے مگر میں خیال کرتا ہوں، یہ محل 'دانستن' کا نہیں ہے 'پنداشتن' کا ہے۔ اس لیئے 'پندارد' زیادہ موزوں ہوگا اور عجب نہیں اصل میں ایسا ہی ہو۔

بہرحال جو صورتِ حال پیش آئی ہے۔ اس سے جو کچھ بھی انقباضِ خاطر ہوا تھا وہ صرف اس لیئے ہوا تھا کہ باہر کے علائق اچانک یک قلم قطع ہو گئے اور ریڈیو سٹ اور اخبار تک روک دیئے گئے ورنہ قید و بند کی تنہائی کا کوئی شکوہ نہ پہلے ہوا تھا نہ اب ہے:

دماغ عطر پیراہن نہیں ہے
غم آوارگی ہائے صبا کیا؟

اور پھر جو کچھ بھی زبانِ قلم پر طاری ہُوا۔ صورتِ حال کی حکایت تھی، شکایت نہ تھی کیونکہ اس راہ میں شکوہ و شکایت کی تو گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اگر ہمیں اختیار ہے کہ اپنا سر ٹکراتے رہیں تو دوسرے کو بھی اختیار ہے کہ نئی نئی دیواریں چنتا رہے بیدل کا یہ شعر موجودہ صورتِ حال پر کیا چسپاں ہُوا ہے:

دوری وصلش طلسمِ اعتبارِ ما شکست

ورنہ ایں عجز سے کہ می بینی، غبارِ ناز بود

اگرچہ یہاں تنہا نہیں ہوں، گیارہ رفیق ساتھ ہیں لیکن چونکہ اُن میں سے ہر شخص ازراہِ عنایت میرے معمولات کا لحاظ رکھتا ہے۔ اس لئے حسبِ دل خواہ یکسوئی اور مشغولیت کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ دن بھر میں صرف چار مرتبہ کمرے سے نکلنا پڑتا ہے۔ کیونکہ کھانے کا کمرہ قطار کا آخری کمرہ ہے اور چائے اور کھانے کے اوقات میں وہاں جانا ضروری ہُوا باقی تمام اوقات کی تنہائی اور خود مشغولی بغیر کسی خلل کے جاری رہتی ہے:

خوش فرشِ بوریاؤ گدائی و خوابِ امن

کیں عیش نیست در خورِ اورنگِ خسروی!

زندگی کی مشغولیتوں کا وہ تمام سامان، جو اپنے وجود سے باہر تھا، اگر چھن گیا ہے تو کیا مضائقہ؟ وہ تمام سامان، جو اپنے اندر تھا اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا سینے میں چھپائے ساتھ لایا ہوں، اسے سجاتا ہوں اور اس کے سیر و نظارہ میں محو رہتا ہوں:

آئینہ نقش بندِ طلسمِ خیال نیست

تصویرِ خود بہ لوحِ دگر می کشیم ما!

گرفتاری چونکہ سفر کی حالت میں ہوئی تھی اس لیے مطالعے کا کوئی سامان ساتھ نہ تھا صرف دو کتابیں میرے ساتھ گئی تھیں جو سفر میں دیکھنے کے لیے رکھ لی تھیں۔ اسی طرح دو چار کتابیں بعض ساتھیوں کے ساتھ آئیں۔ یہ ذخیرہ بہت جلد ختم ہو گیا اور مزید کتابوں کے منگوانے کی کوئی راہ نہیں نکلی۔ لیکن اگر پڑھنے کے سامنے کا فقدان ہُوا، تو

لکھنے کے سامان کی کوئی کمی نہیں ہوئی، کاغذ کا ڈھیر میرے ساتھ ہے اور روشنائی کی احمد نگر کے بازار میں کمی نہیں۔ تمام وقت خامہ فرسائی میں خرچ ہوتا ہے:

در جنوں بیکار نہ تواں زیستن
آتشم تیز ست و داماں می زنم

جب تھک جاتا ہوں تو کچھ دیر کے لیے برآمدے میں نکل کر بیٹھ جاتا ہوں۔ یا صحن میں ٹہلنے لگتا ہوں:

بیکاریِ جنوں میں ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

میں نے جو خط انسپکٹر جنرل کو لکھا تھا، اُس نے گورنمنٹ کو بھیج دیا تھا۔ کل اس کا جواب ملا۔ اب نئے احکام ہمارے لیے یہ ہیں کہ اخبار دیے جائیں گے، قریبی رشتہ داروں کو خط لکھا جا سکتا، لیکن ملاقات کسی سے نہیں کی جا سکتی۔ چیتہ خاں نے یہاں کے فوجی مس (Mess) سے "ٹائمز آف انڈیا" کا تازہ پرچہ منگوا لیا تھا۔ وہ اُس نے خط کے ساتھ حوالے کیا۔ اخبار کا ہاتھ میں لینا تھا کہ تین ہفتہ پہلے کی دُنیا، جو ہمارے لیے معدوم ہو چکی تھی، پھر سامنے آکھڑی ہوئی۔ معلوم ہُوا کہ ہمارے گرفتار ہو جانے سے ملک میں امن چین نہیں ہو گیا بلکہ نئے ہنگاموں نے نئے غلغلے برپا کیے:

ہے ایک خلق کا خونِ اشک خوں فشاں پہ میرے
سکھائی طرز اُسے دامن اُٹھا کے آنے کی

میں نے چیتہ خاں سے کہا کہ اگر ۹ اگست سے ۷ تک کے پچھلے پرچے کہیں سے مل سکیں تو منگوا دے۔ اُس نے ڈھونڈوایا تو بہت سے پرچے مل گئے۔ رات دیر تک اُنھیں دیکھتا رہا:

دیوانگاں ہزار گریباں دریدہ اند   دستِ طلب بہ دامنِ صحرا نہ می رسد

مگر مجھے یہ قصّہ یہاں نہیں چھیڑنا چاہیے۔ میری آپ کی مجلس آرائی اس افسانہ سرائی کے لیے نہیں ہُوا کرتی:

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

میری دکانِ سخن میں ایک ہی طرح کی جنس نہیں رہتی، لیکن آپ کے لیے کچھ نکالتا ہوں تو احتیاط کی چھلنی میں اچھی طرح چھان لیا کرتا ہوں کہ کسی طرح کی سیاسی ملاوٹ باقی نہ رہے۔ دیکھیے، اس چھان لینے کے مضمون کو شریف خاں شیرازی نے کہ جہانگیر کے عہد میں امیر الامراء ہُوا، کیا خوب باندھا ہے:

شررِ نالہ بہ غربالِ ادب می بیزم
کہ بگوشِ تو مبادا رسد آوازہ درشت

یہ وہی امیر الامراء ہے جس کے حسب ذیل شعر پر جہانگیر نے شعراء دربار سے غزلیں لکھوائی تھیں اور خود بھی طبع آزمائی کی تھی:

بگذر مسیح از سرِ ما کشتگانِ عشق
یک زندہ کردنِ تو بہ صد خوں برابر است

ابوالکلام

مکتوب

قلعہ احمد نگر
۱۲ر اکتوبر ۱۹۴۲ء

صدیقِ مکرم

آج غالباً صبح عید ہے۔ عید کی تبریک آپ تک پہنچا نہیں سکتا۔ البتہ آپ کو مخاطب تصور کر کے صفحۂ کاغذ پر نقش کر سکتا ہوں:

اے غائب از نظر کہ شدی ہمنشینِ دل
می گویمت دعا و ثنا می فرستمت
در راہِ دوست مرحلۂ قُرب و بُعد نیست
می بینمت عیان و دُعا می فرستمت

اپنی حالت کیا لکھوں؟

خمیازہ سنج تہمت عیش رسیدہ ایم
مے آں قدر نہ بُود کہ رنج خمار بُرد!

معلوم نہیں کہ ایک خاص طرح کے ذہنی واردہ کی حالت کا آپ کو تجربہ ہوا ہے یا نہیں؟ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات برسوں تک حافظے میں تازہ نہیں ہوتی۔ گویا کسی کونے میں سو رہی ہے۔ پھر کسی وقت اچانک اس طرح جاگ اُٹھے گی جیسے اُسی وقت دماغ نے کواڑ کھول کر اندر لے لیا ہو۔ اشعار و مطالب کی یادداشت میں اس طرح کی واردات اکثر پیش آتی رہتی ہیں۔ تیس چالیس برس پیشتر کے مطالعے کے نقوش کبھی اچانک اس طرح اُبھر آئیں گے کہ معلوم ہوگا کہ ابھی کتاب دیکھ کر اُٹھا ہوں۔ مضمون کے ساتھ کتاب یاد آجاتی ہے۔ کتاب کے ساتھ جلد، جلد کے ساتھ صفحہ اور صفحے کے ساتھ یہ تعین کہ مضمون ابتدائی سطروں میں تھا، یا درمیانی سطروں

میں، یا آخری سطروں میں، نیز صفحے کا رُخ کہ دہنی طرف کا تھا یا بائیں طرف کا، ابھی تھوڑی دیر ہوئی، حسبِ معمول سو کر اُٹھا تو بغیر کسی ظاہری مناسبت اور تحریک کے یہ شعر خود بخود زبان پر طاری تھا:

کم لذّتم و قیمتم افزوں ز شمار ست
گوئی ثمرِ پیشترِ از باغِ وجودم!

ساتھ ہی یاد آگیا کہ شعر حکیم صدرائے شیرازی کا ہے۔ جو اواخر عہدِ اکبری میں ہندوستان آیا اور شاہ جہان کے عہد تک زندہ رہا، اور آفتاب عالم تاب میں نظر سے گزرا تھا، غالباً بائیں طرف کے صفحے میں اور صفحے کی ابتدائی سطروں میں۔ آفتاب عالم تاب دیکھے ہوئے کم سے کم تیس برس ہو گئے ہوں گے، پھر اتفاق نہیں ہوا کہ اسے کھولا ہو۔

غور فرمائیے۔ کیا عمدہ مثال دی ہے، آپ نے اکثر بے فصل کے میوے کھائے ہوں گے، مثلاً جاڑوں میں آم چونکہ بے فصل کی چیز ہوتی ہے، نایاب اور تحفہ سمجھی جاتی ہے۔ لوگ بڑی بڑی قیمتیں دے کر خریدتے ہیں اور دوستوں کو بطور تحفہ کے بھیجتے ہیں۔ لیکن جو علت اس کی تحفگی اور گرانی کی ہوئی۔ وہی بے لذتی کی بھی ہو گئی۔ کھائیے تو مزہ نہیں ملتا اور مزہ ملے تو کیسے ملے؟ جو موسم ابھی نہیں آیا، اس کا میوہ ناوقت پیدا ہو گیا۔ یہ زمین کی غلط اندیشی تھی کہ وقت کی پابندی بھول گئی اور اس غلط اندیشی کی پاداش ضروری ہے کہ میوے کے حصے میں آئے، تاہم چونکہ چیز کمیاب ہوتی ہے اس لیے بے مزہ ہونے پر بھی بے قدر نہیں ہو جاتی۔ کھانے والوں کو مزہ نہیں ملتا۔ پھر بھی زیادہ سے زیادہ قیمت دے کر خریدیں گے اور کہیں گے، بہ جنس نایاب جتنی بھی گراں ہو، ارزاں ہے!

غور کیجیے تو انسان کے افکار و اعمال کی دنیا کا بھی یہی حال ہے۔ یہاں صرف موسم کے درخت ہی نہیں اُگتے، موسم کے دماغ بھی اُگا کرتے ہیں اور پھر جس طرح

یہاں کا ہر فضائی موسم اپنے مزاج کی ایک خاص نوعیت رکھتا ہے اور اسی کے مطابق اس کی تمام پیداوار ظہور میں آتی رہتی ہیں۔ اسی طرح وقت کا ہر دماغی موسم بھی اپنا ایک خاص معنوی مزاج رکھتا ہے اور ضروری ہے کہ اسی کے مطابق طبیعتیں اور ذہنیتیں ظہور میں آئیں۔ لیکن چونکہ یہاں فطرت کی یکسانیوں اور ہم آہنگیوں کی طرح اس کی گاہ گاہ کی ناہمواریاں بھی ہوئیں اور یہاں کا کوئی قانون اپنے فلتات اور شواذ سے خالی نہیں اس لیے کبھی کبھی ایسا بھی ہونے لگتا ہے کہ ناوقت کے پھلوں کی طرح ناوقت کی طبیعتیں ظہور میں آجاتی ہیں۔ اسے کارخانۂ نشوونما کے کاروبار کا نقص کہیے یا زمانے کی غلط اندیشی وقت Anachronism لیکن بہر حال ایسا ہوتا ضرور ہے۔ ایسی ناوقت کی طبیعتیں جب کبھی ظہور میں آئیں گی تو ناوقت کے پھلوں کی طرح موسم کے لیے اجنبی ہوں گی۔ نہ تو وہ وقت کا ساتھ دے سکیں گی، نہ وقت ان کے ساتھ میل کھا سکے گا۔ تاہم چونکہ ان کی نمود میں ایک طرح کی غرابت ہوتی ہے اس لیے ناوقت کی چیز ہونے پر بھی بے قدر نہیں ہو جاتیں۔ لوگوں کو مزہ ملے یا نہ ملے لیکن ان کی گراں قیمتی کا اعتراف ضرور کریں گے۔ صدرائے شیرازی کی دقتِ تخیل نے اسی صورتِ حال کا سراغ لگایا اور دو مصرعوں میں ایک بڑی کہانی سنادی۔

یہ شعر دہراتے ہوئے مجھے خیال ہوا، میرا اور زمانے کا باہمی معاملہ بھی شاید کچھ ایسی ہی نوعیت کا ہوا۔ طبیعت کی بے میل افتاد فکر و عمل کے کسی گوشے میں بھی وقت اور موسم کے پیچھے چل نہ سکی۔ اسے وجود کا نقص کہیے، لیکن یہ ایک ایسا نقص تھا، جو اول روز سے طبیعت اپنے ساتھ لائی تھی اور اس لیے وقت کی کوئی خارجی تاثیر اسے بدل نہیں سکتی تھی۔ زمانہ، جو قدرتی طور پر موسمی چیزوں کا دلدادہ ہوتا ہے، اس ناوقت کے پھل میں کیا لذت پا سکتا تھا؟ لوگ کھاتے ہیں تو مزہ نہیں ملتا۔ تاہم اس بے مزگی پر بھی اپنی قیمت ہمیشہ گراں ہی رہی۔ لوگ جانتے ہیں کہ مزہ ملے نہ ملے،

مگر یہ جنس ارزاں نہیں ہو سکتی :

متاعِ من کہ نصیبش مبـاد ارزانی !

بازار میں ہمیشہ وہی جنس رکھی جاتی ہے جس کی مانگ ہوتی ہے اور چونکہ مانگ ہوتی ہے۔ اس لیے ہر ہاتھ اُس کی طرف بڑھتا ہے اور ہر آنکھ اُسے قبول کرتی ہے۔ مگر میرا معاملہ اس سے بالکل اُلٹا رہا۔ جس جنس کی عام مانگ ہوئی میری دکان میں جگہ نہ پا سکی۔ لوگ زمانے کے بازار میں روز ایسی چیزیں ڈھونڈ کر لائیں گے جن کا رواج عام ہو۔ میں نے ہمیشہ ایسی جنس ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کی جس کا کہیں رواج نہ ہو۔ اوروں کے لیئے پسند و انتخاب کی جو علت ہوئی۔ وہی میرے لیئے ترک و اعراض کی علت بن گئی۔ اُنھوں نے دکانوں میں ایسا سامان سجایا، جس کے لیئے سب کے ہاتھ بڑھیں۔ میں نے کوئی چیز ایسی رکھی ہی نہیں جس کے لیے سب کے ہاتھ بڑھ سکیں :

قماش دست زدِ شہر و دہ زمن مطلب

متاعِ من ہمہ دریائی ست یا کانی !

لوگ بازار میں دکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر لگاتے ہیں جہاں خریداروں کی بھیڑ لگتی ہو۔ میں نے جس دن اپنی دکان لگائی تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر لگائی جہاں کم سے کم گاہکوں کا گزر ہو سکے :

در کوئے ما شکستہ دلی می خرند و بس

بازار خود فروشی ازاں سوئے دیگر ست !

مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں، جس طرف بھی نکلنا پڑا، اکیلا ہی نکلنا پڑا، کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا :

با رفیقاں ز خود رفتہ سفر دست نہ داد

میر صحرائے جنوں حیف کہ تنہا کردیم !

جس راہ میں بھی قدم اُٹھایا، وقت کی منزلوں سے آشنا دُور ہوتا گیا کہ جب مڑ کے دیکھا تو گردِ راہ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا، اور یہ گرد بھی اپنی تیز رفتاری کی اڑائی ہوئی تھی:

آں نیست کہ من ہم نفساں را بگزارم
با آبلہ پایاں چہ کنم؟ قافلہ تیز ست!

اس تیز رفتاری سے تلووں میں چھالے پڑ گئے لیکن عجب نہیں، راہ کے کچھ خس و خاشاک صاف بھی ہو گئے ہوں:

خارہا از اثرِ گرمیِ رفتارم سوخت
منّتے بر قدمِ راہرواں ہست مرا!

اب اس وقت رشتۂ فکر کی راہ کھل گئی ہے تو یہ توقع نہ رکھیے کہ اسے جلد لپیٹ سکوں گا:

ایں رشتہ بہ انگشت نہ پیچی کہ دراز ست!

زندگی میں بہت سے حالات ایسے پیش آئے جو عام حالات میں کم پیش آتے ہیں لیکن معاملے کا ایک پہلو ایسا ہے جو ہمیشہ میرے لیے ایک معمّا رہا اور شاید دوسروں کے لیئے بھی رہے۔ انسان اپنی ساری باتوں میں حالات کی مخلوق اور گرد و پیش کے مؤثرات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ مؤثرات اکثر صورتوں میں آشکارا ہوتے ہیں اور سطح پر سے دیکھ لیئے جا سکتے ہیں، بعض صورتوں میں مخفی ہوتے ہیں اور تہ میں اتر کر اُنھیں ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ تاہم سُراغ ہر حال میں مل جاتا ہے۔ نسل، خاندان، صحبت، تعلیم و تربیت ان مؤثرات کے عنصری سرچشمے ہیں:

عن المرء لا تسئل وسل عن قرینہ

لیکن اس اعتبار سے اپنی زندگی کے ابتدائی حالات پر نظر ڈالتا ہوں تو بڑی حیرانی میں پڑ جاتا ہوں۔ فکر و طبیعت کی کتنی ہی بنیادی تبدیلیاں ہیں جن کا کوئی خارجی سرچشمہ

دکھائی نہیں دیتا اور جو گرد و پیش کے تمام مؤثرات سے کسی طرح بھی جوڑے نہیں جاسکتے کتنی ہی باتیں ہیں جو حالات و مؤثرات کے خلاف ظہور میں آئیں، کتنی ہی ہیں کہ ان کا ظہور سر تا سر متضاد شکلوں میں ہوا، دونوں صورتوں میں معاملہ ایک عجیب افسانے سے کم نہیں:

فریادِ حافظ ایں ہمہ آخر بہ ہرزہ نیست
ہم قصۂ عجیب و حدیثے غریب ہست

جہاں تک طبیعت کی سیرت اور عادات و خصائل کا تعلق ہے میں اپنی خاندانی اور نسلی وراثت سے بے خبر نہیں ہوں۔ ہر انسان کی اخلاقی اور معاشرتی صورت کا قالب نسل و خاندان کی مٹی سے بنتا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ میری عادات و خصائل کی مورتی بھی اسی مٹی سے بنی۔ ہر خاندان اپنی روایتی زندگی کی ایک انفرادیت پیدا کر لیتا ہے اور وہ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ میں صاف محسوس کرتا ہوں کہ اس روایتی زندگی کے اثرات میرے خمیر میں رچ گئے ہیں اور میں ان کی پکڑ سے باہر نہیں جا سکتا۔ میری عادات و خصائل، چال ڈھال، طور طریقہ، امیال و اذواق، سب کے اندر خاندان کا ہاتھ صاف صاف دکھائی دے رہا ہے۔ یہ خاندانی زندگی کی روایتیں مجھے میرے ددھیال اور ننھیال دونوں سلسلوں سے ملیں اور دونوں پر ہمدلیوں کی قدامت اور تسلسل کی مُہریں لگی ہوئی تھیں۔ وہ بہرحال میرے حصے میں آئی تھیں۔ ان کے قبول کرنے یا نہ کرنے میں میری خواہش اور پسند کو کوئی دخل نہ تھا لیکن یہاں سوال عادات و خصائل کا نہیں ہے۔ افکار و عقائد کا ہے اور جب اس اعتبار سے اپنی حالت کا جائزہ لیتا ہوں تو خاندان، تعلیم، ابتدائی گرد و پیش کوئی گوشہ بھی میل کھاتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ فکری مؤثرات کے جتنے بھی احوال و ظروف Environment ہو سکتے ہیں ان میں سے ایک ایک کو اپنے سامنے لاتا ہوں اور ان میں اپنے آپ کو ڈھونڈتا ہوں۔

مگر مجھے اپنا سُراغ کہیں نہیں ملتا!

میں نے ہوش سنبھالتے ہی ایسے بزرگوں کو اپنے سامنے پایا جو عقائد و افکار میں اپنا ایک خاص مسلک رکھتے تھے اور اس میں اس درجہ سخت اور بے لچک تھے کہ بال برابر بھی اِدھر اُدھر ہونا کفر و زندقہ تصور کرتے تھے۔ میں نے بچپن سے اپنے خاندان کی جو روایتیں سُنیں وہ بھی سر تا سر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں، اور میرا دماغی ورثہ اس تصلّب اور جمود سے بوجھل تھا۔ میری تعلیم ایسے گرد و پیش میں ہوئی جو چاروں طرف سے قدامت پرستی اور تقلید کی چاردیواری میں گھرا ہوا تھا اور باہر کی مخالف ہواؤں کا وہاں تک گزر ہی نہ تھا۔ والد مرحوم کے علاوہ جن اساتذہ سے تحصیل کا اتفاق ہوا وہ بھی وہی تھے جنھیں والد مرحوم نے پہلے اچھی طرح ٹھونک بجا کے دیکھ لیا تھا کہ اُن کے معیارِ عقائد و فکر پہ پُورے پُورے اُتر سکتے ہیں اور یہ معیار اس درجہ تنگ اور سخت تھا کہ اُن کے معاصروں میں سے خال خال اشخاص ہی کی وہاں تک رسائی ہوسکتی تھی۔ پس ظاہر ہے کہ اس دروازے سے بھی کسی نئی ہوا کے گزرنے کا امکان نہ تھا۔ جہاں تک زمانے کے فکری انقلابات کا تعلق ہے، میرے خاندان کی دُنیا وقت کی راہوں سے اس درجہ دُور واقع ہوئی تھی کہ اُن راہوں کی کوئی صدا وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی اور اس اعتبار سے گویا سو برس پہلے کے ہندوستان میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ ابتدائی صحبتوں کو انسانی دماغ کا سانچا ڈھالنے میں بہت دخل ہوتا ہے لیکن میری سوسائٹی اوائل عمر میں گھر کی چاردیواری کے اندر محدود رہی اور گھر کے عزیزوں اور بزرگوں کے علاوہ اگر کوئی دوسرا گروہ ملا بھی تو وہ خاندان کے معتقدوں اور مریدوں کا گروہ تھا۔ وہ میرے ہاتھ پاؤں چومتے اور ہاتھ باندھے کھڑے رہتے یا رجعتِ قہقری کر کے پیچھے ہٹتے اور دُور مؤدب ہو کر بیٹھ رہتے۔ یہ فضا صورتِ حال میں تبدیلی پیدا کرنے کی جگہ اور زیادہ اُسے گہری کرتی رہتی۔ والد مرحوم کے مریدوں میں ایک بڑی تعداد علماء اور انگریزی

تعلیم یافتہ اشخاص کی بھی تھی۔ دیوان خانے میں اکثر ان کا مجمع رہتا۔ مگر یہ پورا مجمع بھی سرتاسر اسی خاندانی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ کسی دوسرے کی وہاں جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

علاوہ بریں مرید اور معتقد جب کبھی مجھ سے ملتے تھے تو مجھے مرشد زادہ سمجھ کر منتظر رہتے تھے کہ مجھ سے کچھ سنیں۔ وہ مجھے کچھ سنانے کی گستاخانہ جرأت کب کر سکتے تھے؟

انگریزی تعلیم کی ضرورت کا تو یہاں کسی کو وہم و گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا لیکن کم از کم یہ تو ہو سکتا تھا کہ قدیم تعلیم کے مدرسوں میں سے کسی مدرسے سے واسطہ پڑتا۔ مدرسے کی تعلیمی زندگی بہر حال گھر کی چار دیواری کے گوشۂ تنگ سے زیادہ وسعت رکھتی ہے اور اس لیے طبیعت کو کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقع مل جاتا ہے لیکن والد مرحوم یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ کلکتہ کے سرکاری مدرسہ یعنی مدرسۂ عالیہ کی تعلیم ان کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی اور فی الحقیقت قابلِ وقعت تھی بھی نہیں اور کلکتہ سے باہر بھیجنا انھیں گوارا نہ تھا۔ انھوں نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ خود تعلیم دیں یا بعض خاص اساتذہ کے قیام کا انتظام کر کے ان سے تعلیم دلائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں تک تعلیمی زمانے کا تعلق ہے، گھر کی چار دیواری سے باہر قدم نکالنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بلا شبہ اس کے بعد قدم کھلے اور ہندوستان سے باہر تک پہنچے، لیکن یہ بعد کے واقعات ہیں جبکہ طالب علمی کا زمانہ بسر ہو چکا تھا اور میں نے اپنی نئی راہیں ڈھونڈ نکالی تھیں۔ میری عمر کا وہ زمانہ، جسے باقاعدہ طالب علمی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے چودہ پندرہ برس کی عمر سے آگے نہیں بڑھا۔

پھر خود اس تعلیم کا حال کیا تھا جس کی تحصیل میں تمام ابتدائی زمانہ بسر ہوا؟ اس کا جواب اگر اختصار کے ساتھ بھی دیا جائے تو صفحوں کے صفحے سیاہ ہو جائیں اور آپ کے لیے تفصیل ضروری نہیں۔ ایک ایسا فرسودہ نظامِ تعلیم، جسے فنِ تعلیم کے جس زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے، سرتاسر عقیم ہو چکا ہے۔ طریقِ تعلیم کے اعتبار سے ناقص، مضامین

کے اعتبار سے ناقص، انتخابِ کتب کے اعتبار سے ناقص، درس و املا کے اسلوب کے اعتبار سے ناقص، اگر فنونِ عالیہ کو الگ کر دیا جائے تو درس نظامیہ میں بنیادی موضوع دو ہی رہ جاتے ہیں، علوم دینیہ اور معقولات۔ علوم دینیہ کی تعلیم جن کتابوں کے درس میں منحصر رہ گئی ہے۔ اس سے اُن کتابوں کے مطالب و عبارت کا علم حاصل ہو جاتا ہو لیکن خود اُن علوم میں کوئی مجتہدانہ بصیرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ معقولات سے اگر منطق الگ کر دی جائے تو پھر جو کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ اس کی علمی قدر و قیمت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ تاریخِ فلسفۂ قدیم کے ایک خاص عہد کی ذہنی کاوشوں کی یادگار ہے۔ حالانکہ علم کی دُنیا اُس عہد سے صدیوں آگے بڑھ چکی۔ فنونِ ریاضیہ جس قدر پڑھائے جاتے ہیں۔ وہ موجودہ عہد کی ریاضیات کے مقابلے میں بمنزلہ صفر کے ہیں اور وہ بھی عام طور پر پڑھائے نہیں جاتے۔ میں نے اپنے شوق سے پڑھا تھا۔ جامع ازہر قاہرہ کے نصابِ تعلیم کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ ہندوستان میں متاخرین کی کتبِ معقولات کو فروغ ہوا، وہاں اتنی وسعت بھی پیدا نہ ہو سکی :

اے طبلِ بلند بانگ، در باطن ہیچ

سیّد جمال الدین اسد آبادی نے جب مصر میں کتبِ حکمت کا درس دینا شروع کیا تھا تو بڑی جستجو سے چند کتابیں وہاں مل سکی تھیں اور علماءِ ازہر اُن کتابوں کے ناموں سے بھی آشنا نہ تھے۔ بلاشبہ اب ازہر کا نظامِ تعلیم بہت کچھ اصلاح پا چکا ہے لیکن جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اُس وقت تک اصلاح کی کوئی سعی کامیاب نہیں ہوئی تھی اور شیخ محمد عبدہ مرحوم نے مایوس ہو کر ایک نئی سرکاری درس گاہ دارالعلوم کی بنیاد ڈالی تھی۔

فرض کیجیے میرے قدم اسی منزل پر رُک گئے ہوتے اور علم و نظر کی جو راہیں آگے چل کر ڈھونڈی گئیں ان کی لگن پیدا نہ ہوئی ہوتی تو میرا کیا حال ہوتا؟ ظاہر ہے کہ تعلیم کا یہ ابتدائی سرمایہ مجھے ایک جامد اور ناآشنائے حقیقت دماغ سے زیادہ اور

کچھ نہیں دے سکتا تھا۔

تعلیم کی جو رفتار عام طور پر رہا کرتی ہے۔ میرا معاملہ اس سے مختلف رہا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سنہ ۱۹۰۱ئہ میں جب میری عمر بارہ تیرہ برس سے زیادہ نہ تھی، میں فارسی کی تعلیم سے فارغ اور عربی کی مبادیات سے گزر چکا تھا اور شرح مُلّا اور قطبی وغیرہ کے دَور میں تھا۔ میرے ساتھیوں میں میرے مرحوم بھائی مجھ سے عمر میں دو برس بڑے تھے۔ باقی اور جتنے تھے اُن کی عمریں اکیس بیس برس سے کم نہ ہوں گی۔ والد مرحوم کا طریق تعلیم تھا کہ ہر علم میں پہلے کوئی ایک مختصر متن حفظ کرلینا ضروری سمجھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ شاہ ولی اللہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے خاندان کا طریق تعلیم ایسا ہی تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں میں نے فقہ اکبر، تہذیب، خلاصہ کیدانی وغیرہا بر زبان حفظ کرلی تھیں اور اپنے بروقت استحضار اور اقتباسات سے نہ صرف طالب علموں کو بلکہ مولویوں کو بھی حیران کردیا کرتا تھا۔ وہ مجھے گیارہ بارہ برس کا لڑکا سمجھ کر بہت تو میزان و منشعب کے سوالات کرتے۔ میں انھیں منطق کے ذہنیّوں اور اصول کی تعریفوں میں لے جاکر ہکّا بکّا کردیتا۔ اس طریقے کے فائدے میں کلام نہیں۔ آج تک اُن متون کا ایک ایک لفظ حافظے میں محفوظ ہے۔ خلاصہ کیدانی کی لوح کا شعر تک بھولا نہیں کسی افغانی مُلّا نے "کے دانی اور کیدانی" کی تک بندی کی تھی:

تو طریق صلوٰۃ کے دانی
گر نہ خوانی خلاصہ کیدانی

کتابوں کی درسی تحصیل کی مدت بھی عام رفتار سے بہت کم رہا کرتی تھی۔ اساتذہ میری تیز رفتاریوں سے پہلے جھنجلاتے پھر پریشان ہوتے۔ پھر مہربان ہوکر جرأت افزائی کرنے لگتے۔ جب کسی کتاب کا نیا دور شروع ہوتا تو باہر کے چند طلبہ بھی شریک ہوجاتے، لیکن ابھی چند دن بھی نہ گزرنے پاتے کہ میرا سبق دوسروں سے آگے ہوجاتا کیونکہ وہ میری رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ میرے معقولات کے ایک اُستاد لوگوں سے

کہا کرتے تھے: "یہ چھوٹے حضرت مجھے آج کل صدرا سنایا کرتے ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مجھ سے درس لیتے ہیں۔"

۱۹۰۳ء میں کہ عمر کا پندرھواں سال شروع ہوا تھا، میں درسِ نظامیہ کی تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا اور والد مرحوم کے ایما سے چند مزید کتابیں بھی نکال لی تھیں چونکہ تعلیم کے باب میں قدیم خیال یہ تھا کہ جب تک پڑھا ہوا پڑھایا نہ جائے، استعداد پختہ نہیں ہوتی اس لیے فاتحۂ فراغ کی مجلس ہی میں طلبہ کا ایک حلقہ میرے سپرد کر دیا گیا اور اُن کے مصارفِ قیام کے والد مرحوم کفیل ہو گئے۔ میں نے تکمیلِ فنون کے لیے طب شروع کر دی تھی خود قانون پڑھتا تھا اور طلبہ کو مطوّل، میر زاہد اور ہدایا وغیرہ کا درس دیتا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا تھا اور شک و شبہ کے کانٹے دل میں چبھنے لگے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو آوازیں چاروں طرف سنائی دے رہی ہیں، اُن کے علاوہ بھی کچھ اور ہونا چاہیے اور علم و حقیقت کی دُنیا صرف اتنی ہی نہیں ہے جتنی سامنے آکھڑی ہوئی ہے۔ یہ چبھن عمر کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتی گئی یہاں تک کہ چند برسوں کے اندر افکار و عقائد کی وہ تمام بنیادیں جو خاندان، تعلیم اور گرد و پیش نے چنی تھیں، یہ یک دفعہ متزلزل ہو گئیں اور پھر وہ وقت آیا کہ اس ہلتی ہوئی دیوار کو خود اپنے ہاتھوں ڈھا کر اس کی جگہ نئی دیواریں چننی پڑیں:

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نہ داشت
دانہ می چیدم دراں روزے کہ خرمن داشتم!

انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک اُس کے تقلیدی عقائد ہیں، اُسے کوئی طاقت اس طرح جکڑ بند نہیں کر دے سکتی جس طرح تقلیدی عقائد کی زنجیریں کر دیا کرتی ہیں۔ وہ اُن زنجیروں کو توڑ نہیں سکتا اس لیے کہ توڑنا چاہتا ہی نہیں۔ وہ

اُنھیں زیور کی طرح محبوب رکھتا ہے۔ ہر عقیدہ، ہر عمل، ہر نقطۂ نگاہ، جو اسے خاندانی روایات اور ابتدائی تعلیم و صحبت کے ہاتھوں مل گیا ہے۔ اس کے لیئے ایک مقدس ورثہ ہے، وہ اُس ورثے کی حفاظت کرے گا مگر اُسے چھونے کی جرأت نہیں کرے گا۔ بسا اوقات موروثی عقائد کی پکڑ اتنی سخت ہوتی ہے کہ تعلیم اور گرد و پیش کا اثر بھی اُسے ڈھیلا نہیں کر سکتا۔ تعلیم دماغ پر ایک نیا رنگ چڑھا دے گی لیکن اس کی بناوٹ کے اندر نہیں اترے گی۔ بناوٹ کے اندر ہمیشہ نسل، خاندان اور صدیوں کی متوارث روایات ہی کا ہاتھ کام کرتا رہے گا۔

میری تعلیم خاندان کے موروثی عقائد کے خلاف نہ تھی کہ اس راہ سے کوئی کشمکش پیدا ہوتی۔ وہ سر تا سر اُسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی جو موثرات نسل اور خاندان نے مہیا کر دیئے تھے۔ تعلیم نے اُنھیں اور زیادہ تیز کرنا چاہا اور گرد و پیش نے انھیں اور زیادہ سہارے دیئے، تاہم یہ کیا بات ہے کہ شک کا سب سے پہلا کانٹا جو خود بخود دل میں چُبھا، وہ اسی تقلید کے خلاف تھا؟ میں نہیں جانتا تھا کہ کیوں مگر بار بار یہی سوال سامنے اُبھرنے لگا تھا کہ اعتقاد کی بنیاد علم و نظر پر ہونی چاہیئے، تقلید اور توارث پر کیوں ہو؟ یہ گویا دیوار کی بنیادی اینٹوں کا ہل جانا تھا کیونکہ موروثی اور روایتی عقائد کی پوری دیوار صرف تقلید ہی کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے جب بنیاد ہل گئی تو پھر دیوار کب کھڑی رہ سکتی تھی؟ کچھ دنوں تک طبیعت کی درماندگیاں سہارے دیتی رہیں لیکن بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اب کوئی سہارا بھی اس گرتی ہوئی دیوار کو سنبھال نہیں سکتا:

از اں کہ پیروئِ خلق گمرہی آرد
نمی رویم براہے کہ کارواں رفتست

شک کی یہی چُبھن تھی جو تمام آنے والے یقینوں کے لیے دلیلِ راہ بنی۔ بلاشبہ اُس نے پچھلے سرمایوں سے تہی دست کر دیا تھا مگر نئے سرمایوں کے حصول کی لگن بھی لگا دی تھی، اور بالآخر اسی کی رہنمائی تھی جس نے یقین اور طمانیت کی منزلِ مقصود تک پہنچا دیا،

گویا جس علّت نے بیمار کیا تھا، وہی بالآخر دارُوئے شفا بھی ثابت ہُوئی:

دردہا دادی و درمانی ہنوز

ہرچند سُراغ لگانا چاہتا ہوں کہ یہ کانٹا کہاں سے اُڑا تھا کہ تیر کی طرح دل میں ترازو ہو گیا، مگر کوئی پتہ نہیں لگتا، کوئی تعلیل کام نہیں دیتی:

چہ مستی ست ندانم کہ رو بما آورد
کہ بود ساقی و ایں بادہ از کجا آورد

بلاشبہ آگے چل کر کئی حالات ایسے پیش آئے جنھوں نے اس کانٹے کی چبھن اور زیادہ گہری کر دی لیکن اس وقت تک تو کسی خارجی محرک کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی تھی اور ہوش و آگہی کی عمر ہی نہ تھی کہ باہر کے مؤثرات کے لیئے دل و دماغ کے دروازے کھل سکتے۔ یہ تو وہ حال ہُوا کہ:

اتانی ھواھا، قبل ان اعرف الھویٰ
فصادف قلبا فارغاً فتمکنا!

یہی زمانہ ہے جب پیرزادگی اور نسلی بزرگی کی زندگی بھی مجھے خود بخود چبھنے لگی اور معتقدوں اور مریدوں کی پرستاریوں سے طبیعت کو ایک گونہ توحش ہونے لگا۔ میں اس کی کوئی خاص وجہ اُس وقت محسوس نہیں کرتا تھا مگر طبیعت کا ایک قُدرتی تقاضا تھا جو ان باتوں کے خلاف لے جا رہا تھا:

بسے آں دود کہ امسال بہمسایہ رسید
زآتشے بود کہ در خانۂ من پار گرفت!

سوال یہ ہے کہ تمام حالات اور مؤثرات کے خلاف طبیعت کی یہ افتاد کیونکر بنی اور کہاں سے آئی؟ خاندان عقائد و افکار کا جو سانچا ڈھالنا چاہتا تھا، نہ ڈھال سکا۔ تعلیم جس طرف لے جانا چاہتی تھی، نہ لے جا سکی۔ حلقۂ صحبت و اثرات کا جو تقاضا تھا، پورا نہ ہُوا۔ اس عالمِ اسباب میں ہر حالت کا دامن کسی نہ کسی علّت سے بندھا ہوتا

ہے۔ آخر اس رشتے کا بھی کوئی تو سرا ملنا چاہیئے؟ واقعہ یہ ہے کہ نہیں ملتا۔ ممکن ہے یہ میری نظر کی کوتاہی ہو اور کوئی دوسری دقیقہ سنج نگاہ حالات کا مطالعہ کرے تو کوئی نہ کوئی محرک ڈھونڈ نکالے، مگر مجھے تو تھک کر دوسری ہی طرف دیکھنا پڑا:

کارِ زُلفِ تست مشک افشانی، اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند!

جس نامراد ہستی کو چودہ برس کی عمر میں زمانے کی آغوش سے اس طرح چھین لیا گیا ہو، وہ اگر کچھ عرصے کے لیے شاہراہِ عام سے گم ہو کر آوارۂ دشت وحشت نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا؟ ایک عرصے تک طرح طرح کی سرگردانیوں میں نشانِ راہ گم رہا۔ نہ مقصد کی خبر لی نہ منزل کی:

سگِ آستانم، اما ہمہ شب قلادہ خایم
کہ سرِ شکار دارم نہ ہوائے پاسبانی
عجب است گر نہ باشد خضرے بہ جستجویم
کہ فتادہ ام بہ ظلمت چو زلالِ زندگانی

لیکن جس ہاتھ نے زمانے کی آغوش سے کھینچا، بالآخر اُسی نے دشت نوردیوں کی تمام بے راہ رویوں میں رہنمائی بھی کی اور اگرچہ قدم قدم پر ٹھوکروں سے دوچار ہونا پڑا اور پیچ پیچ پر رکاوٹوں سے اُلجھنا پڑا مگر طلب ہمیشہ آگے ہی کی طرف بڑھائے لیے گئی اور جستجو نے کبھی گوارا نہیں کیا کہ درمیانی منزلوں میں رُک کر دم لے لے۔ بالآخر دم لیا تو اُس وقت لیا، جب منزلِ مقصود سامنے جلوہ گر تھی اور اس کی راہ سے چشمِ تمنّائی روشن ہو رہی تھی:

بہ وصلش تا رسم صد بار بر خاک افگند شوقم
کہ نو پروازم و شاخِ بلندے آشیاں دارم

چوبیس برس کی عمر میں، جبکہ لوگ عشرتِ شباب کی سرمستیوں کا سفر شروع کرتے ہیں،

میں اپنی دشت نوردیاں ختم کرکے تلووں کے کانٹے چن رہا تھا:

دربیاباں گر بہ شوقِ کعبہ خواہی زد قدم
سرزنش ہا گر کند خارِ مغیلاں، غم مخور!

گویا اس معاملے میں بھی اپنی چال زمانے سے اُلٹی ہی رہی۔ لوگ زندگی کے جس مرحلے میں کمر باندھتے ہیں، میں کھول رہا تھا:

کام تھے عشق میں بہت، پہ میرؔ
ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے

اُس وقت سے لے کر آج تک کہ کاروانِ باد رفتارِ عمر منزلِ خمسین سے بھی گزر چکا ہے فکر و عمل کے بہت سے میدان نمودار ہوئے اور اپنی راہ پیمائیوں کے نقوش جا بجا بنانے پڑے، وقت یا تو اُنھیں مٹا دے گا جیسا کہ ہمیشہ مٹاتا رہا ہے، یا محفوظ رکھے گا جیسا کہ ہمیشہ محفوظ رکھتا آیا ہے:

آئینہ نقش بند طلسمِ خیال نیست
تصویرِ خود بلوحِ دگر می کشیم ما!

یہاں زندگی بسر کرنے کے دو ہی طریقے تھے جنھیں ابو طالب کلیم نے دو مصرعوں میں بتلا دیا ہے:

طبعے بہم رساں کہ بسازی بعالمے
یا ہمتے کہ از سرِ عالم تواں گزشت

پہلا طریقہ اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اُس کی طبیعت ہی نہیں لایا تھا۔ ناچار دوسرا اختیار کرنا پڑا:

کارِ مشکل بود، ما بہ خویش آساں کردہ ایم!

جو نامراد یہ دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہیں وہ نہ تو راہ کی مشکلوں اور رکاوٹوں سے ناآشنا ہوتے ہیں نہ اپنی ناتوانیوں اور درماندگیوں سے بے خبر ہوتے ہیں تاہم

وہ قدم اُٹھا دیتے ہیں۔ کیونکہ قدم اُٹھائے بغیر رہ نہیں سکتے۔ زمانہ اپنی ساری نامرافقتوں اور بے اعتنائیوں کے ساتھ بار بار اُن کے سامنے آتا ہے اور طبیعت کی خلقی درماندگیاں قدم قدم پر دامنِ عزم و ہمت سے اُلجھنا چاہتی ہیں۔ تاہم اُن کا سفر جاری رہتا ہے۔ وہ زمانے کے پیچھے نہیں چل سکتے تھے لیکن زمانے کے اُوپر سے گزر جاسکتے تھے اور بالآخر بے نیازانہ گزر جاتے ہیں:

وقتِ عراقی خوش، کہ نہ کشود تدگر در بہ رخش
بر درِ نکشودہ ساکن شُد، درِ دیگر نہ زد!

اب صبحِ عید نے اپنے چہرے سے صبحِ صادق کا ہلکا نقاب بھی اُلٹ دیا ہے اور بے حجابانہ مُسکرا رہی ہے:

اِک نگارِ آتشیں رُخ، سر کھُلا!

میں اب آپ کو اور زیادہ اپنی طرف متوجہ رکھنے کی کوشش نہیں کروں گا کیونکہ صبحِ عید کی اس جلوہ نمائی کا آپ کو جواب دینا ہے۔ کئی سال ہوئے، ایک مکتوبِ گرامی میں شب ہائے رمضان کی "عنبریں جائے" کا ذکر آیا تھا۔ بے محل نہ ہوگا اگر اس کے جُرعہ ہائے پیہم سے قبلِ صلوٰۃِ عید افطار کیجئے کہ عید الفطر میں تعجیل مسنون ہوئی اور عید الضحےٰ میں تاخیر:

عید ست، و نشاط و طرب و زمزمہ عام ست
مے نوش، گنہ بر من اگر بادہ حرام ست
از روزہ اگر کوفتۂ، بادہ روا گیر
ایں مسئلہ حل گشت ز ساقی کہ امام ست

ابوالکلام

مکتوب

قلعۂ احمد نگر
۱۶ اکتوبر ۱۹۴۲ء

از ہر چہ گویم ہست، از خود خبرم چوں نیست
در ہر چہ گویم نیست، با او نظرے چوں ہست!

صدیقِ مکرّم!

صبح کے ساڑھے تین بجے ہیں۔ اس وقت لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو معلوم ہوا سیاہی ختم ہو رہی ہے۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ سیاہی کی شیشی خالی ہو چکی تھی، نئی شیشی منگوانی تھی مگر منگوانا بھول گیا۔ میں نے سوچا، تھوڑا سا پانی کیوں نہ ڈال دوں؟ یکایک چائے دانی پر نظر پڑی۔ میں نے تھوڑی سی چائے فنجان میں انڈیلی اور قلم کا منہ اس میں ڈبو کر پچکاری چلا دی۔ پھر اسے اچھی طرح ہلا دیا کہ روشنائی کی دھوئیں پوری طرح نکل آئے اور اب دیکھیے روشنائی کی جگہ چائے کے تند و گرم عرق سے اپنے نغمہائے سرد صفحۂ قرطاس پر نقش کر رہا ہوں:

می کشد شعلہ سرے از دلِ صد پارۂ ما
جوشِ آتش بود امروز بہ فوارۂ ما!

طبیعت افسردہ ہوتی ہے تو الفاظ بھی افسردہ نکلتے ہیں۔ میں طبیعت کی افسردگیوں کا چائے کے گرم جاموں سے علاج کیا کرتا ہوں، آج قلم کو بھی ایک گھونٹ پلا دیا:

ایں کہ در جام و سبو دارم مہیّا آتش ست!

آپ اس طریقِ کار پر متعجب نہ ہوں، آج سے ساڑھے تین سو برس پہلے فیضی کو بھی یہی طریقہ کام میں لانا پڑا۔ نل دمن میں اس نے ہمیں خبر دی ہے:

تا تازہ و تر زنم رقم را   در بادہ کشیدہ ام قلم را

آج بھی جام وہی ہے جو روز گردش میں آتا ہے لیکن جام میں جو کچھ انڈیل رہا ہوں اُس کی کیفیتیں کچھ بدلی ہوئی پائیے گا:

ازمئے دوشیں قدرے تند تر!

بار ہا مجھے خیال ہوا کہ ہم خدا کی ہستی کا اقرار کرنے پر اس لیے بھی مجبور ہیں کہ اگر نہ کریں تو کارخانۂ ہستی کے معمّے کا کوئی حل باقی نہیں رہتا اور ہمارے اندر ایک حل کی طلب ہے جو ہمیں مضطرب رکھتی ہے:

آں کہ ایں نامۂ سربستہ نوشتہ است نخست
گرہے سخت بہ سر رشتۂ مضمون زدہ است!

اگر ایک الجھا ہوا معاملہ ہمارے سامنے آتا ہے اور ہمیں اُس کے حل کی جستجو ہوتی ہے تو ہم کیا کرتے ہیں؟ ہمارے اندر بالطبع یہ بات موجود ہے اور منطق اور ریاضی نے اُسے راہ پر لگا دیا ہے کہ ہم الجھاؤ پر غور کریں گے۔ ہر الجھاؤ اپنے حل کے لیے ایک خاص طرح کے تقاضے کا جواب چاہتا ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ ایک کے بعد ایک طرح طرح کے حل سامنے لائیں اور دیکھیں اس تقاضا کا جواب ملتا ہے یا نہیں؟ پھر جونہی ایک حل ایسا نکل آئے گا جو الجھاؤ کے سارے تقاضوں کا جواب دے دیگا اور معاملے کی ساری کلیں ٹھیک ٹھیک بیٹھ جائیں گی، ہمیں پورا یقین ہو جائے گا کہ الجھاؤ کا صحیح حل نکل آیا اور صورتِ حال کی یہ اندرونی شہادت ہمیں اس درجہ مطمئن کر دے گی کہ پھر کسی بیرونی شہادت کی احتیاج باقی نہیں رہے گی، اب اگر کوئی ہزار شبہے نکالے، ہمارا یقین متزلزل ہونے والا نہیں۔

فرض کیجیے، کپڑے کے تھان کا ایک ٹکڑا کسی نے پھاڑ لیا ہو اور ٹکڑا پھٹا ہو اس طرح ٹیڑھا ترچھا اور دندانہ دار ہو کہ جب تک ویسے ہی اُلجھاؤ کا ایک ٹکڑا وہاں آکر بیٹھتا نہیں، تھان کی خالی جگہ بھرتی نہیں۔ اب اُسی کپڑے کے بہت سے ٹکڑے ہمیں مل جاتے ہیں اور ہر ٹکڑا وہاں بٹھا کر ہم دیکھتے ہیں کہ اس خلا کی نوعیت کا تقاضا

پُورا ہوتا ہے یا نہیں مگر کوئی ٹکڑا ٹھیک بیٹھتا نہیں۔ اگر ایک گوشہ میل کھاتا ہے تو دوسرے گوشے جُڑنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اچانک ایک ٹکڑا ایسا نکل آتا ہے کہ ٹیڑھے ترچھے کٹاؤ کے سارے تقاضے پُورے کر دیتا ہے اور صاف نظر آجاتا ہے کہ صرف اسی ٹکڑے سے یہ خلا بھرا جا سکتا ہے۔ اب اگرچہ اس کی تائید میں کوئی خارجی شہادت موجود نہ ہو لیکن ہمیں پُورا یقین ہو جائے گا کہ یہی ٹکڑا یہاں سے پھاڑ گیا تھا اور اس درجے کا یقین ہو جائے گا کہ "لوکشف الغطاء لما ازددت یقینا"!

اس مثال سے ایک قدم اور آگے بڑھائیے اور گورکھ دھندے کی مثال سامنے لائیے۔ بے شمار طریقوں سے ہم اسے مرتب کرنا چاہتے ہیں مگر ہوتا نہیں۔ بالآخر ایک خاص ترتیب ایسی نکل آتی ہے کہ اُس کے ہر جز کا تقاضا پُورا ہو جاتا ہے اور اُس کی چُول ٹھیک ٹھیک بیٹھ جاتی ہے۔ اب اگر خارجی دلیل اُس ترتیب کی صحت کی موجود نہ ہو لیکن یہ بات کہ صرف اسی ایک ترتیب سے اُس کا الجھاؤ دور ہو سکتا ہے بجائے خود ایک ایسی فیصلہ کُن دلیل بن جائے گی کہ پھر ہمیں کسی اور دلیل کی احتیاج باقی ہی نہیں رہے گی۔ الجھاؤ کا دُور ہو جانا اور ایک نقش کا نقش بن جانا بجائے خود ہزاروں دلیلوں کی ایک دلیل ہے!

اب علم و تحقیق کی راہ میں ایک قدم اور آگے بڑھائیے اور ایک تیسری مثال سامنے لائیے۔ آپ نے حرفوں کی ترتیب سے کُھلنے والے قفل دیکھے ہوں گے۔ انھیں پہلے قفلِ ابجد کے نام سے پکارتے تھے۔ ایک خاص لفظ کے بننے سے وہ کُھلتا ہے اور وہ ہمیں معلوم نہیں۔ اب ہم طرح طرح کے الفاظ بناتے جائیں گے اور دیکھیں گے کہ کُھلتا ہے یا نہیں؟ فرض کیجیے ایک خاص لفظ کے بنتے ہی کُھل گیا۔ اب کیا ہمیں اس بات کا یقین نہیں ہو جائے گا کہ اسی لفظ میں اس قفل کی کنجی پوشیدہ تھی؟ جستجو جس حل کی تھی۔ وہ قفل کا کُھلنا تھا جب ایک لفظ نے قفل کھول دیا تو پھر اس کے بعد باقی کیا رہا، جس کی مزید جستجو ہو۔

ان مثالوں کو سامنے رکھ کر اس طلسمِ ہستی کے معمّے پر غور کیجیے جو خود ہمارے اندر اور

ہمارے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ انسان نے جب سے ہوش و آگہی کی آنکھیں کھولی ہیں، اس معمّے کا حل ڈھونڈ رہا ہے لیکن اس پرانی کتاب کا پہلا اور آخری ورق کچھ اس طرح کھویا گیا ہے کہ نہ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ شروع کیسے ہوئی تھی نہ اسی کا کچھ سراغ ملتا ہے کہ ختم کہاں جاکر ہوئی اور کیونکر ہوگی؟

اوّل و آخرِ ایں کہنہ کتاب افتادست!

زندگی اور حرکت کا یہ کارخانہ کیا ہے اور کیوں ہے؟ اس کی کوئی ابتدا بھی ہے یا نہیں؟ یہ کہیں جاکر ختم بھی ہوگا یا نہیں؟ خود انسان کیا ہے؟ یہ جو ہم سوچ رہے ہیں کہ "انسان کیا ہے؟" تو خود یہ سوچ اور سمجھ کیا چیز ہے؟ اور پھر حیرت اور زندگی کے ان تمام پردوں کے پیچھے کچھ ہے بھی یا نہیں؟

مُردم در انتظار و دریں پردہ را نیست
یا ہست، و پردہ دار نشانم نمی دہد!

اُس وقت سے لے کر جبکہ ابتدائی عہد کا انسان پہاڑوں کے غاروں سے سر نکال نکال کر سورج کو طلوع و غروب ہوتے دیکھتا تھا، آج تک جبکہ وہ علم کی تجربہ گاہوں سے سر نکال کر فطرت کے بے شمار چہرے بے نقاب دیکھ رہا ہے، انسان کے فکر و عمل کی ہزاروں باتیں بدل گئیں مگر یہ معمّا معمّا ہی رہا۔

اسرارِ ازل را نہ تو دانی و نہ من
ویں حرفِ معمّا نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پسِ پردہ گفتگوئے من و تو
چوں پردہ بر افتد نہ تو مانی و نہ من

ہم اس اُلجھاؤ کو نئے نئے حل نکال کر سلجھانے کی جتنی کوششیں کرتے ہیں وہ اور زیادہ اُلجھتا جاتا ہے۔ ایک پردہ سامنے دکھائی دیتا ہے اُسے ہٹانے میں نسلوں کی نسلیں گزار دیتے ہیں لیکن جب وہ ہٹتا ہے تو معلوم ہوتا ہے۔ سو پردے اور اس کے پیچھے پڑے

تھے اور جو پردہ ہٹتا تھا، وہ فی الحقیقت پردے کا ہٹنا نہ تھا بلکہ نئے نئے پردوں کا نکل آنا تھا۔ ایک سوال کا جواب ابھی حل نہیں چکتا کہ دس نئے نئے سوال سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔ ایک راز ابھی حل نہیں ہو چکتا کہ سو نئے راز چشمک کرنے لگتے ہیں:

دریں میدان پُر نیرنگ حیران ست دانائی
کہ یک ہنگامہ آرائی، و صد کشور تماشائی

آئنسٹائن (Einstein) نے اپنی ایک کتاب[1] میں سائنس کی جستجوئے حقیقت کی سرگرمیوں کو شرلاک ہومز کی سراغ رسانیوں سے تشبیہ دی ہے اور اس میں شک نہیں کہ نہایت معنی خیز تشبیہ دی ہے۔ علم کی یہ سراغ رسانی فطرت کی غیر معلوم گذرگاہوں کا کھوج لگانا چاہتی تھی مگر قدم قدم پر نئے نئے مرحلوں اور نئی نئی دشواریوں سے دوچار ہوتی رہی۔ ذی مقراطیس (Democritus) کے زمانے سے لے کر جس نے چار سو برس قبل مسیح مادہ کے سالمات (Atoms) کی نقش آرائی کی تھی، آج تک جب کہ نظریہ تصاور عنصری (Quantum Theory) کی رہنمائی میں ہم سالمات کا از سرِ نو تعاقب کر رہے ہیں، علم کی ساری کدوکاوش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلا کہ پچھلی گتھیاں سلجھتی گئیں، نئی نئی گتھیاں پیدا ہوتی گئیں۔ اس ڈھائی ہزار برس کی مسافرت میں ہم نے بہت سی نئی منزلوں کا سُراغ پالیا جو ناآشنائے سفر میں نمودار ہوتی رہیں لیکن حقیقت کی وہ آخری منزلِ مقصود، جس کے سُراغ میں علم کا مسافر نکلا تھا آج بھی اسی طرح غیر معلوم ہے جس طرح ڈھائی ہزار برس پہلے تھی، ہم جس قدر اس سے قریب ہونا چاہتے ہیں اتنا ہی وہ دُور ہوتی جاتی ہے:

با من آویزشِ او الفتِ موج ست و کنار
دمبدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من!

---

[1] "دی ایولیوشن آف فزکس" جس کی ترتیب میں لیوپولڈ انفلیڈ بھی شریک تھا۔

دوسری طرف ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے اندر ایک نہ بجھنے والی پیاس کھول رہی ہے جو اس معمائے ہستی کا کوئی حل چاہتی ہے۔ ہم کتنا ہی اُسے دبانا چاہیں مگر اُس کی تپش لبوں پہ آہی جائے گی۔ ہم بغیر ایک حل کے سکونِ قلب نہیں پا سکتے۔ بسا اوقات ہم اس دھوکے میں پڑ جاتے ہیں کہ کسی تشفی بخش حل کی ہمیں ضرورت نہیں لیکن یہ محض ایک بناوٹی تخیل ہوتا ہے اور جونہی زندگی کے قدرتی تقاضوں سے ٹکراتا ہے پاش پاش ہو کر رہ جاتا ہے۔

یورپ اور امریکہ کے مفکروں کے تازہ ترین مآثر کا مطالعہ کیجیے اور دیکھیے موجودہ جنگ نے اُن تمام دماغوں میں، جو کل تک کے اپنے آپ کو مطمئن تصور کرنے کی کوشش کرتے تھے، کیسا تہلکہ مچا رکھا ہے؟ ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ پروفیسر جوڈ (Joad) کا ایک مقالہ میری نظر سے گزرا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ اُن تمام فیصلوں پر، جو ہم نے مذہب اور خدا کی ہستی کے بارے میں کیے تھے، از سرِ نو غور کرنا چاہیے۔ یہ پروفیسر جوڈ کا بعد از جنگ کا اعلان ہے لیکن پروفیسر جوڈ کے قبل از جنگ اعلانات کس درجہ اس سے مختلف تھے؟ برٹرنڈ رسل Bertrand Russell نے بھی گزشتہ سال ایک مطول مقالے میں، جو بعض امریکی رسائل میں شائع ہوا۔ ایسی ہی رائے ظاہر کی تھی۔

مگر جس وقت یہ معما انسانی دماغ کے سامنے نیا نیا اُبھرا تھا اُسی وقت اس کا حل بھی اُبھر آیا تھا۔ ہم اُس حل کی جگہ دوسرا حل ڈھونڈنا چاہتے ہیں اور یہیں سے ہماری تمام بے حاصلیاں سر اُٹھانا شروع کر دیتی ہیں۔

اچھا، اب غور کیجیے، اس معمے کے حل کی کاوش بالآخر ہمیں کہاں لے جا کر کھڑا کر دیتی ہے؟ یہ پورا کارخانۂ ہستی اپنے ہر گوشہ اور اپنی ہر نمود میں سرتاسر ایک سوال ہے۔ سورج سے لے کر اس کی روشنی کے ذرّوں تک کوئی نہیں جو ایک قلم پرسش و تقاضا نہ ہو یہ سب کچھ کیا ہے؟ یہ سب کچھ کیوں ہے؟ یہ سب کچھ کس لیے ہے؟ ہم عقل کا سہارا لیتے ہیں اور

اِس روشنی میں، جسے ہم نے علم کے نام سے پکارا ہے، جہاں تک راہ ملتی ہے چلتے چلے جاتے ہیں لیکن ہمیں کوئی حل ملتا نہیں جو اس اُلجھاؤ کے تقاضوں کی پیاس بجھا سکے؛ روشنی گُل ہو جاتی ہے۔ آنکھیں پتھرا جاتی ہیں اور عقل و ادراک کے سارے سہارے جواب دے دیتے ہیں۔ لیکن پھر جونہی ہم پُرانے حل کی طرف لوٹتے ہیں اور اپنی معلومات میں صرف اتنی بات بڑھا دیتے ہیں کہ "ایک صاحبِ ادراک و ارادہ قوت پس پردہ موجود ہے" تو اچانک صورتِ حال یک قلم منقلب ہو جاتی ہے اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے اندھیرے سے نکل کر یکایک اُجالے میں آکھڑے ہوئے۔ اب جس طرف بھی دیکھتے ہیں، روشنی ہی روشنی ہے۔ ہر سوال نے اپنا جواب پا لیا ہے۔ ہر تقاضے کی طلب پُوری ہو گئی، ہر پیاس کو سیرابی مل گئی، گویا یہ سارا الجھاؤ ایک قفل تھا جو اس کنجی کے چُھوتے ہی کُھل گیا:

چنداں کہ دست و پا زدم، آشفتہ تر شدم
ساکن شدم، میانۂ دریا کنار شد!

اگر ایک ذی عقل ارادہ پس پردہ موجود ہے تو یہاں جو کچھ ہے، کسی ارادے کا نتیجہ ہے اور کسی معین اور طے شدہ مقصد کے لیے ہے۔ جُونہی یہ حل سامنے رکھ کر ہم اس گورکھ دھندے کو ترتیب دیتے ہیں، معاً اس کی ہر کج پیچ نکل جاتی ہے اور ساری گُتھیاں اپنی اپنی جگہ ٹھیک آکر بیٹھ جاتی ہیں کیونکہ "کیا ہے" اور "کیوں ہے" کو ایک معنی خیز جواب مل جاتا ہے۔ گویا اس معمّے کے حل کی ساری رُوح ان چند لفظوں کے اندر سمٹی ہوئی تھی۔ جُونہی یہ سامنے آئے معمّا نہ رہا۔ ایک معنی خیز داستان بن گیا۔ پھر جُونہی یہ الفاظ سامنے سے ہٹنے لگتے ہیں، تمام معانی و اشارات غائب ہو جاتے ہیں اور ایک خشک اور بے جان چیستان باقی رہ جاتی ہے۔

اگر جسم میں رُوح بولتی ہے اور لفظ میں معنی اُبھرتا ہے تو حقائقِ ہستی کے اجسام بھی اپنے اندر کوئی رُوحِ معنی رکھتے ہیں۔ یہ حقیقت کہ معمّائے ہستی کے بے جان اور بے معنی جسم میں صرف اسی ایک حل سے رُوحِ معنی پیدا ہو سکتی ہے، ہمیں مجبور کر دیتی ہے کہ اس حل کو حل تسلیم

کر لیں۔

اگر کوئی ارادہ اور مقصد پردے کے پیچھے نہیں ہے تو یہاں تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن اگر ایک ارادہ اور مقصد کام کر رہا ہے تو پھر جو کچھ بھی ہے روشنی ہی روشنی ہے۔ ہماری فطرت میں روشنی کی طلب ہے۔ ہم اندھیرے میں کھوئے جانے کی جگہ روشنی میں چلنے کی طلب رکھتے ہیں اور ہمیں یہاں روشنی کی راہ صرف اسی ایک حل سے مل سکتی ہے۔

فطرتِ کائنات ہیں ایک مکمل مثال (Pattern) کی نمو داری ہے۔ ایسی مثال جو عظیم بھی ہے اور جمالی (Aesthetic) بھی، اس کی عظمت ہمیں مرعوب کرتی ہے، اس کا جمال ہم میں محویت پیدا کرتا ہے۔ پھر کیا ہم فرض کر لیں کہ فطرت کی یہ نمود بغیر کسی مدرک (Intelligence) قوت کے کام کر رہی ہے؟ ہم چاہتے ہیں کہ فرض کر لیں مگر نہیں کر سکتے۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ایسا فرض کر لینا ہماری دماغی خودکشی ہوگی۔

اگر غور کیجئے تو اس حل پر یقین کرتے ہوئے ہم اسی طریقِ نظر سے کام لینا چاہتے ہیں جو ریاضیات کے اعدادی اور پیمائشی حقائق سے ہمارے دماغوں میں کام کرتا رہتا ہے ہم کسی عددی اور پیمائشی الجھاؤ کا حل صرف اسی حل کو تسلیم کریں گے جس کے ملتے ہی الجھاؤ دور ہو جائے۔ الجھاؤ کا دور ہو جانا ہی حل کی صحت کی اٹل دلیل ہوتی ہے۔ بلا شبہہ دونوں صورتوں میں الجھاؤ اور حل کی نوعیت ایک طرح کی نہیں ہوتی، اعدادی مسائل میں الجھاؤ عددی ہوتا ہے یہاں عقلی ہے۔ وہاں عددی حل عددی حقائق کا یقین پیدا کرتا ہے یہاں عقلی حل عقلی اذعان کی طرف رہنمائی کرتا ہے، تاہم طریقِ نظر کا سانچا دونوں جگہ ایک ہی طرح کا ہوا۔ دونوں راہیں ایک ہی طرح کھلتی اور ایک ہی طرح بند ہوتی ہیں۔

اگر کہا جائے، حل کی طلب ہم اس لیے محسوس کرتے ہیں کہ اپنے محسوسات و تعقل کے محدود دائرے میں اس کے عادی ہو گئے ہیں اور اگر اس حل کے سوا اور کسی حل سے ہمیں تشفی نہیں ملتی تو یہ بھی اسی لیے ہے کہ ہم حقیقت تولنے کے لیے اپنے محسوسات ہی کا ترازو ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں تو اس کا جواب بھی صاف ہے۔ ہم اپنے آپ کو اپنے فکر و نظر کے

دائرے سے باہر نہیں لے جا سکتے۔ ہم مجبور ہیں کہ اسی کے اندر رہ کر سوچیں اور حکم لگائیں اور یہ جو ہم کہہ رہے ہیں کہ "ہم مجبور ہیں کہ سوچیں اور حکم لگائیں" تو :

این سخن نیز بہ اندازۂ ادراکِ من است!

مسئلے کا ایک اور پہلو بھی ہے جو اگر غور کریں تو فوراً ہمارے سامنے نمایاں ہو جائے گا۔ انسان کے حیوانی وجود نے مرتبۂ انسانیت میں پہنچ کر نشو و ارتقا کی تمام پچھلی منزلیں بہت پیچھے چھوڑ دی ہیں اور بلندی کے ایک ایسے ارفع مقام پر پہنچ گیا ہے جو اسے کرۂ ارضی کی تمام مخلوقات سے الگ اور ممتاز کر دیتا ہے۔ اب اسے اپنی لامحدود ترقیوں کے لیے ایک لامحدود بلندی کا نصب العین چاہیے جو اسے برابر اُوپر ہی کی طرف کھینچتا رہے۔ اس کے اندر بلند سے بلند تر ہوتے رہنے کی طلب ہمیشہ اُبلتی رہتی ہے۔ اور وہ اونچی سے اونچی بلندی تک اڑ کر بھی رُکنا نہیں چاہتی۔ اس کی نگاہیں ہمیشہ اوپر ہی کی طرف لگی رہتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ لامحدود بلندیوں کا نصب العین کیا ہو سکتا ہے؟ ہمیں بلا تامل تسلیم کر لینا پڑے گا کہ خدا کی ہستی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ ہستی اس کے سامنے سے ہٹ جائے تو پھر اس کے لیے اُوپر کی طرف دیکھنے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔

کرۂ ارضی کی موجودات میں جتنی چیزیں ہیں، سب انسان سے پچھلے درجے کی ہیں، وہ ان کی طرف نظر نہیں اُٹھا سکتا۔ اس کے اوپر اجرامِ سماوی کی موجودات پھیلی ہوئی ہیں لیکن ان میں بھی کوئی ہستی ایسی نہیں جو اس کے لیے نصب العین بن سکے۔ وہ سورج کو اپنا نصب العین نہیں بنا سکتا۔ وہ چمکتے ہوئے تاروں سے عشق نہیں کر سکتا۔ سورج اس کے جسم کو گرمی بخشتا ہے لیکن اس کی مخفی قوتوں کی اُمنگوں کو گرم نہیں کر سکتا۔ تارے اس کی اندھیری راتوں میں قندیلیں روشن کر دیتے ہیں لیکن اس کے دل و دماغ کے نہاں خانے کو روشن نہیں کر سکتے۔ پھر وہ کونسی ہستی ہے جس کی طرف وہ اپنی بلند پروازیوں کے لیے نظر اُٹھا سکتا ہے؟ یہاں اس کے چاروں طرف پستیاں ہی پستیاں ہیں جو اسے انسانیت کی بلندی سے حیوانیت کی پستیوں کی طرف کھینچنا چاہتی ہیں حالانکہ وہ اوپر کی طرف اڑنا چاہتا ہے۔ وہ عناصر

کے درجہ سے بلند ہو کر نباتاتی زندگی کے درجے میں آیا۔ نباتات سے بلند تر ہو کر حیوانی زندگی کے درجہ میں پہنچا۔ پھر حیوانی مرتبے سے اُڑ کر انسانیت کی شاخِ بلند پر اپنا آشیانہ بنایا۔ اب وہ اس بلندی سے پھر نیچے کی طرف نہیں دیکھ سکتا۔ اگرچہ حیوانیت کی پستی اسے برابر نیچے ہی کی طرف کھینچتی رہتی ہے۔ وہ فضا کی لاانتہا بلندیوں کی طرف آنکھ اُٹھاتا ہے:

نہ باندازۂ بازوست کمندم ہیہات
ورنہ باگوشۂ بامیم سروکارے ہست!

اُسے بلندیوں، لامحدود بلندیوں کا ایک بامِ رفعت چاہیے جس کی طرف وہ برابر دیکھتا رہے اور جو اسے ہر دم بلند سے بلند تر ہوتے رہنے کا اشارہ کرتا رہے:

ترا ز کنگرۂ عرش می زنند صفیر
ندانمت کہ دریں دامگہ چہ افتادست!

اسی حقیقت کو ایک جرمن فلسفی زیل Riehl نے ان لفظوں میں ادا کیا تھا۔

"انسان تن کر سیدھا کھڑا نہیں رہ سکتا جب تک کوئی ایسی چیز اس کے سامنے موجود نہ ہو جو خود اس سے بلند تر ہے۔ وہ کسی بلند چیز کے دیکھنے ہی کے لئے سر اوپر کر سکتا ہے"

بلندی کا یہ نصب العین خدا کی ہستی کے تصور کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اگر یہ بلندی اس کے سامنے سے ہٹ جائے تو پھر اُسے نیچے کی طرف دیکھنے کے لیے جھکنا پڑے گا اور جونہی اس نے نیچے کی طرف دیکھا۔ انسانیت کی بلندی پستی میں گرنے لگی۔

یہی صورتِ حال ہے جو ہمیں یقین دلاتی ہے کہ خدا کی ہستی کا عقیدہ انسان کی ایک فطری احتیاج کے تقاضے کا جواب ہے، اور چونکہ فطری تقاضے کا جواب ہے اس لیئے اس کی جگہ انسان کے اندر پہلے سے موجود ہونی چاہیئے بعد کی بنائی ہوئی بات نہیں ہوئی۔

زندگی کے ہر گوشے میں انسان کے فطری تقاضے ہیں۔ فطرت نے فطری تقاضوں کے فطری جواب دیئے ہیں۔ ان دونوں کا دامن اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا ہے کہ اب اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں میں سے کون پہلے ظہور میں آیا تھا۔ تقاضے پہلے پیدا

ہوئے تھے، یا اُن کے جوابوں نے پہلے سر اُٹھایا تھا؟ چنانچہ جب کبھی ہم کوئی فطری تقاضا محسوس کرتے ہیں، تو ہمیں پورا پورا الیقین ہوتا ہے کہ اس کا فطری جواب بھی ضرور موجود ہوگا۔ اس حقیقت میں ہمیں کبھی شبہ نہیں ہوتا۔

مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے بچے کی دماغی نشوونما اور اس کی قوتِ محاکات کے اُبھرنے کے لیے مثالوں اور نمونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ مثالوں اور نمونوں کے بغیر اپنی فطری قوتوں کو ان کی اصلی چال چلا نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ بات کرنا بھی نہیں سیکھ سکتا جو اس کے مرتبۂ انسانیت کا امتیازی وصف ہے اور چونکہ یہ اس کی ایک فطری طلب ہے اس لیے ضروری تھا کہ خود فطرت ہی نے اوّل روز سے اس کا جواب بھی مہیا کر دیا ہوتا۔ چنانچہ یہ جواب پہلے ماں کی ہستی میں اُبھرتا ہے۔ پھر باپ کے نمونے میں اپنا سر اُٹھاتا ہے پھر روز بروز اپنا دامن پھیلاتا جاتا ہے۔ اب غور کیجیے کہ اس صورتِ حال کا یقین کس طرح ہمارے دماغوں میں بسا ہوا ہے؟ ہم کبھی اس میں شک کر ہی نہیں سکتے۔ ہمارے دماغوں میں یہ سوال اُٹھتا ہی نہیں کہ بچے کے لیے والدین کا نمونہ ابتدا سے کام دیتا آیا ہے یا بعد کو انسانی بناوٹ نے پیدا کیا ہے؟ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ ایک فطری مطالبہ ہے اور فطرت کے تمام مطالبے جبھی سر اُٹھاتے ہیں جب ان کے جواب کا بھی سرو سامان مہیا ہو لیتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح اگر ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی دماغ کی نشوونما ایک خاص درجے تک پہنچ کر ان تمام نمونوں سے آگے بڑھ جاتی ہے جو اُس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور اپنے عروج و ارتقا کی پرواز جاری رکھنے کے لیے اوپر کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتی ہے تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ یہ اس کی ہستی کا ایک فطری مطالبہ ہے اور اگر فطری مطالبہ ہے تو ضروری ہے کہ اس کا فطری جواب بھی خود اُس کی ہستی کے اندر ہی موجود ہو اور اس کے ہوش و خرد نے آنکھیں کھولتے ہی اُسے اپنے سامنے دیکھ لیا ہو، یہ جواب کیا ہو سکتا ہے؟ جس قدر جستجو کرتے ہیں، خدا کی ہستی کے سوا اور کوئی دکھائی نہیں دیتا۔

آسٹریلیا کے وحشی قبائل سے لے کر تاریخی عہد کے متمدن انسانوں تک کوئی بھی اس

تصوّر کی اُمنگ سے خالی نہیں رہا۔ رگ وید کے زمزموں کا فکری مواد اس وقت بننا شروع ہُوا تھا جب تاریخ کی صبح بھی پُوری طرح طلوع نہیں ہُوئی تھی اور حِتّیوں نے Hittites اور عیلامیوں نے جب اپنے تعبّدانہ تصوّرات کے نقش و نگار بنائے تھے تو انسانی تمدّن کی طفولیّت نے ابھی ابھی آنکھیں کھولی تھیں۔ مصریوں نے ولادتِ مسیح سے ہزاروں سال پہلے اپنے خدا کو طرح طرح کے ناموں سے پکارا اور کالڈیا کے صنعت گروں نے مٹّی کی پکی ہُوئی اینٹوں پر حمد و ثنا کے وہ ترانے کندہ کیے جو گزری ہُوئی قوموں سے انھیں ورثے میں ملے تھے:

در ہیچ پردہ نیست نہ باشد نوائے تو
عالم پُر است از تو وُ خالیست جائے تو

ابوالفضل نے عبادت گاہِ کشمیر کے لیے کیا خوب کتبہ تجویز کیا تھا: "الٰہی بہ ہر خانہ کہ می نگرم جویائے تواند، و بہر زباں کہ می شنوم، گویائے تو۔"

اے تیرِ غمت را دلِ عشاق نشانہ خلقے بتو مشغول تو غائب زمیانہ
گہ معتکفِ دیرم و گہ ساکنِ کعبہ یعنے کہ ترا می طلبم خانہ بخانہ!

ابوالکلام

مکتوب

قلعۂ احمد نگر
۱۸ اکتوبر ۱۹۴۲ء

صدیقِ مکرم

کل کا مکتوب کاغذ پر ختم ہو چکا تھا۔ لیکن دماغ میں ختم نہیں ہوا تھا۔ اس وقت قلم اٹھایا تو پھر خیالات اسی رُخ پر بڑھنے لگے۔

غور و فکر کی یہی منزل ہے جو ہمیں ایک دوسری حقیقت کی طرف بھی متوجہ کر دیتی ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ انسان خدا کے ماورائے تعقل اور غیر شخصی تصور پر قانع نہ رہ سکا اور کسی نہ کسی شکل میں اپنے فکر و احساسات کے مطابق ایک شخصی تصور پیدا کرتا رہا؟ میں "شخصی" تصور یہاں اُس معنی میں بول رہا ہوں جس معنی میں "پرسنل گاڈ" Personal God کی اصطلاح بولی جاتی ہے۔ شخصی تصور کے مختلف مدارج ہیں۔ ابتدائی درجہ تو تشخص محض کا ہوتا ہے جو صرف شخصیت کا اثبات کرتا ہے، لیکن پھر آگے چل کر یہ شخصیت خاص خاص صفتوں اور فعالیتوں کا جامہ پہن لیتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ جامہ ناگزیر کیوں ہوا؟ اس کی علت بھی یہی ہے کہ انسان کی فطرت کو بلندی کے ایک نصب العین کی ضرورت ہے اور اس ضرورت کی پیاس بغیر ایک متشخص اور علائق نواز تصور کے بجھ نہیں سکتی۔ حقیقت کچھ ہی ہو، لیکن یہ تصور جب کبھی اُس کے سامنے آئے گا تو تشخص کی ایک نقاب چہرے پر ضرور ڈال لے گا۔ یہ نقاب کبھی بھاری رہی، کبھی ہلکی ہو گئی، کبھی ڈرانے والی رہی، کبھی لبھانے والی بن گئی، لیکن چہرے سے اتری کبھی نہیں اور یہیں سے ہمارے دیدۂ صورت پرست کی ساری درماندگیاں شروع ہو گئیں:

بہ چہرۂ حقیقت اگر ماند پردۂ
جرمِ نگاہِ دیدۂ صورت پرستِ ماست!

دنیا میں وحدت الوجود Pantheism کے عقیدے کا سب سے قدیم سرچشمہ ہندوستان ہے۔ غالباً یونان اور اسکندریہ میں بھی یہیں سے یہ عقیدہ پہنچا اور مذہب افلاطون جدید Neoplatonism نے (جسے غلطی سے عربوں نے افلاطون کا مذہب خیال کیا تھا) اس پر اپنی اشراقی عمارتیں استوار کیں۔ یہ عقیدہ حقیقت کے تصور کو ہر طرح کے تصوری تشخصات سے منزہ کر کے ایک کامل مطلق اور بحت تصور قائم کر دیتا ہے۔ اس تصور کے ساتھ صفات متشکل نہیں ہو سکتیں اور اگر ہوتی بھی ہیں تو تعینات اور مظاہر کے اعتبار سے۔ نہ کہ ذاتِ مطلق کی ہستی کے اعتبار سے اس عقیدے کا روشناس اس کی ذات کے بارے میں بجز اس کے کہ ہے اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہاں تک کہ اشارہ بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اگر ہم اپنے اشارات کی پرچھائیں بھی اس پر پڑنے دیتے ہیں تو ذاتِ مطلق، مطلق نہیں رہتی۔ تشخص اور حدود کے غبار سے آلودہ ہو جاتی ہے بابا فغانی نے دو مصرعوں کے اندر سب کچھ کہہ دیا ہے:

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عینِ اوست
اما نہ می تواں کہ اشارت باو کنند!

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے اوپنیشدوں نے نفی صفات کی راہ اختیار کی اور تنزیہ کی "نیتی نیتی" کو بہت دور تک لے گئے۔ لیکن پھر دیکھیے، اسی ہندوستان کو اپنی پیاس اس طرح بجھانی پڑی کہ نہ صرف برہما (ذاتِ مطلق) کو ایشور (ذاتِ متصف و متشخص) کی نمود میں دیکھنے لگے بلکہ پتھر کی مورتیاں بھی تراش کر سامنے رکھ لیں کہ دل کے اٹکاؤ کا کوئی ٹھکانا تو سامنے رہے:

کرے کیا کعبے میں جو سر بتخانہ سے آگہ ہے
یہاں تو کوئی صورت بھی ہے واں اللہ ہی اللہ ہے

یہودیوں نے خدا کو ایک قاہر و جابر شہنشاہ کی صورت میں دیکھا اور اسرائیل کے گھرانے سے اس کا رشتہ ایسا ہوا۔ جیسا ایک غیور شوہر کا اپنی چہیتی بیوی کے

ساتھ ہوتا ہے۔ شوہر اپنی بیوی کی ساری خطائیں معاف کر دے گا مگر اُس کی بے وفائی کبھی معاف نہیں کرے گا۔ کیونکہ اُس کی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ اُس کی محبت کے ساتھ کسی دوسرے کی محبت بھی شریک ہو۔ ان اللّٰہ لایغفر ان یشرک بہ، ویغفر ما دون ذالک لمن یشاء۔ چنانچہ تورات کے احکامِ عشرہ میں ایک حکم یہ تھا "تو کسی چیز کی مورتی نہ بنائیو۔ نہ اس کے آگے جھکیو۔ کیونکہ میں خداوند تیرا خدا ایک غیور خدا ہوں" لیکن پھر زمانہ جوں جوں بڑھتا گیا۔ یہ تصور بھی زیادہ وسعت اور رفعت پیدا کرتا گیا۔ یہاں تک کہ یسعیا (؟) ثانی[1] کے زمانے میں اُس تصور کی بنیادیں پڑنے لگیں جو آگے چل کر مسیحی تصور کی شکل اختیار کرنے والا تھا۔ چنانچہ مسیحیت نے شوہر کی جگہ باپ[2] کو دیکھا۔ کیونکہ باپ اپنے بچوں کے لیے سرتاسر رحم و شفقت اور یک قلم عفو و درگزر ہوتا ہے:

من بد کنم و تو بد مکافات دہی
پس فرق میانِ من و تو چیست بگو!

اسلام نے اپنے عقیدے کی بنیاد سرتاسر تنزیہ پر رکھی لیس کمثلہ شیٔ

---

[1] انیسویں صدی میں بائبل کے نقد و نظر کا جو مسلک "انتقادِ اعلیٰ" کے نام سے اختیار کیا گیا تھا اس کے بعض فیصلے آج تک طے شدہ سمجھے جاتے ہیں۔ از آن جملہ یہ کہ یسعیاہ نبی کے نام سے جو صحیفہ موجود ہے۔ وہ تین مختلف مصنفوں نے تین مختلف زمانوں میں مرتب کیا ہوگا۔ باب اوّل سے باب ۳۹ تک ایک مصنف کا کلام ہے۔ باب ۴۰ سے باب ۵۵ آیت ۱۳ تک دوسرے مصنف کا۔ اور اس کے بعد کا آخری حصہ تیسرے کا۔ ان تینوں مصنفوں کو امتیاز کے لیے یسعیا اوّل، ثانی اور ثالث سے موسوم کیا جاتا ہے۔

[2] ہندو تصور نے باپ کی جگہ ماں کی تمثیل اختیار کی تھی۔ کیونکہ ماں کی محبت باپ کی محبت سے بھی زیادہ گہری اور غیر متزلزل ہوتی ہے۔

میں تشبیہ کی ایسی عام اور قطعی نفی کر دی کہ ہمارے تصوری تشخص کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔ لا تضربوا للّٰہِ الامثال نے تمثیلوں کے سارے دروازے بند کر دیئے۔ لا تدرکہ الابصار اور لن ترانی ولاکن انظر الی الجبل نے ادراکِ حقیقت کی کوئی امید باقی نہ چھوڑی۔

زباں ببند و نظر باز کن کہ منعِ کلیم
اشارت از ادب آموزیِ تقاضاست!

تاہم انسان کے نظارۂ تصور کے لیے اُسے بھی صفات کی ایک صورت آرائی کرنی ہی پڑی اور تنزیہِ مطلق نے صفاتی تشخص کا جامہ پہن لیا۔ وَلِلّٰہِ الاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی فادعوہ بھا۔ اور پھر صرف اتنے ہی پر معاملہ نہیں رکا، جا بجا مجازات کے جھروکے بھی کھولنے پڑے۔ بل یداہ مبسوطتان اور ید اللہ فوق ایدیھم اور ما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ اور الرحمن علی العرش استویٰ اور ان ربک لبالمرصاد اور کل یوم ھو فی شان:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر!

اس سے معلوم ہوا کہ بلندی کے ایک نصب العین کی طلب انسان کی فطرت کی طلب ہے اور وہ بغیر کسی ایسے تصور کے پوری نہیں ہو سکتی جو کسی نہ کسی شکل میں اس کے سامنے آئے اور سامنے تبھی آسکتا ہے کہ اس کے مطلق اور غیر متشخص چہرے پہ کوئی نہ کوئی نقابِ تشخص کی پڑ گئی ہو:

آہ ازاں حوصلۂ تنگ و ازاں حسنِ بلند
کہ دلم را گلہ از حسرتِ دیدارِ تو نیست!

غیر صفاتی تصور کو انسانی دماغ پکڑ نہیں سکتا اور طلب اُسے ایسے مطلوب کی ہوتی جو اس کی پکڑ میں آسکے۔ وہ ایک ایسا جلوۂ محبوبی چاہتا ہے جس پر اس کا دل

اٹک سکے جس کے حُسنِ گریزاں کے پیچھے والہانہ دوڑ سکے، جس کا دامنِ کبریائی پکڑنے کے لیے اپنا دستِ عجز و نیاز بڑھا سکے، جس کے ساتھ راز و نیازِ محبت کی راتیں بسر کر سکے، جو اگرچہ زیادہ سے زیادہ بلندی پر ہو، لیکن پھر بھی اُسے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہو کہ انّ ربّک لبالمرصاد[1] اور واذا سئلک عبادی عنّی فانی قریبٌ اجیب دعوة الداع اذا دعان[2]۔

در پردهٔ و بر همه کس پرده می دری
با ہر کسی و با تو کسے را وصال نیست!

غیر صفاتی تصوّر محض نفی و سلب ہوتا ہے، مگر صفاتی تصوّر نفی تشبیہ کے ساتھ ایک ایجابی صورت بھی متشکل کر دیتا ہے۔ اسی لیے یہاں صفات کی نقش آرائیاں ناگزیر ہوئیں اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں علماء سلف اور اصحابِ حدیث نے تفویض کا مسلک اختیار کیا اور تاویلِ صفات سے گریزاں رہے اور اسی بنا پر انھوں نے جہمیہ کے انکارِ صفات کو تعطّل سے تعبیر کیا اور معتزلہ و متکلمین کی تاویلوں میں بھی تعطیل کی بُو سونگھنے لگے۔ متکلمین نے اصحابِ حدیث کو تشبّہ اور تجسیم Anthropomorphism کا الزام دیا تھا مگر وہ کہتے تھے، تمھارے تعطّل سے تو ہمارا نام نہاد تشبّہ ہی بہتر ہے کیونکہ یہاں تصوّر کے لیے ایک ٹھکانا تو باقی رہتا ہے، تمھاری سلب و نفی کی کاوشوں کے بعد تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

ہندوستان کے اوپنیشدوں نے ذاتِ مطلق کی ذاتِ متصّف میں اُتارتے ہوئے، جن تنزلات کا نقشہ کھینچا ہے، مسلمان صوفیوں نے اس کی تعبیر "احدیت" اور "واحدیت"

---

[1] بلاشبہ تیرا پروردگار تجھے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہے۔

[2] اے پیغمبر! جب میری نسبت میرے بندے تجھ سے دریافت کریں تو اُن سے کہہ دے میں ان سے دُور کب ہوں؟ میں تو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔

کے مراتب میں دیکھی۔ "احدیّت" کا مرتبہ یکتائی محض کا ہوا۔ لیکن "واحدیت" کی جگہ اوّل کی ہوئی اور اوّلیت کا مرتبہ چاہتا ہے کہ دوسرا، تیسرا، چوتھا بھی ہو۔ "کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف، فخلقت الخلق۔" حدیث قدسی نہیں ہے، مگر جس کسی کا بھی قول ہے اس میں شک نہیں کہ ایک بڑے ہی گہرے تفکر کی خبر دیتا ہے:

دل کشتۂ یکتائی حسن ست، وگرنہ
در پیشِ تو آئینہ شکستن ہنرے بود!

ترجمان القرآن جلد اوّل میں بہ ضمنِ تفسیر سورۂ فاتحہ اور جلد دوم میں بہ ضمن تفسیر وَلَا تَضْرِبُوا لِلّٰهِ الْاَمْثَال اس مبحث کی طرف اشارات کیے گئے ہیں اور مبحث ایسا ہے کہ اگر پھیلایا جائے تو بہت دُور تک پھیل سکتا ہے:

تلقینِ درسِ اہل نظر یک اشارت ست
کردم اشارتے و مکرّر نمی کنم!

اس سلسلے میں ایک اور مقام بھی نمایاں ہوتا ہے اور اس کی وسعت بھی ہمیں دُور دُور تک پہنچا دیتی ہے۔ اگر یہاں مادہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو پھر مرتبۂ انسانی میں اُبھرنے والی وہ قوت جسے ہم فکر و ادراک کے نام سے پکارتے ہیں کیا ہے؟ کس انگیٹھی سے یہ چنگاری اُڑی؟ یہ کیا ہے جو ہم میں یہ جوہر پیدا کر دیتی ہے کہ ہم خود مادہ کی حقیقت میں غور و خوض کرنے لگتے ہیں اور اس پر طرح طرح کے احکام لگاتے ہیں؟ یہ سچ ہے کہ موجودات کی ہر چیز کی طرح یہ جوہر بھی بتدریج اس درجے تک پہنچا۔ وہ عرصے تک نباتات میں سوتا رہا، حیوانات میں کروٹ بدلنے لگا اور پھر انسانیت کے مرتبے میں پہنچ کر جاگ اُٹھا لیکن صورتِ حال کا یہ علم ہمیں اس گتھی کے سلجھانے میں کچھ مدد نہیں دیتا۔ یہ بیج فوراً برگ و بار لے آیا ہو، یا مدتوں کے نشو و ارتقا کے بعد اس درجے تک پہنچا ہو، بہرحال مرتبۂ انسانیت کا جوہر و خلاصہ ہے اور اپنی نمود و حقیقت میں تمام مجمع موجودات سے اپنی جگہ الگ اور بالاتر رکھتا ہے۔ یہی مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان

حیوانیت کی پچھلی کڑیوں سے جدا ہو گیا اور کسی آئندہ کڑی تک مرتفع ہونے کی استعداد اس کے اندر سر اٹھانے لگی ۔ وہ زمین کی حکمرانی کے تخت پر بیٹھ کر جب اوپر کی طرف نظر اٹھاتا ہے تو فضا کے تمام اجرام اسے اس طرح دکھائی دینے لگتے ہیں، جیسے وہ بھی صرف اسی کی کار برآریوں کے لیے بنائے گئے ہوں ۔ وہ اُن کی پیمایش بھی کرتا ہے ۔ اور اُن کے خواص و افعال پر بھی حکم لگاتا ہے ۔ اُسے کارخانۂ قدرت کی لا انتہائیوں کے مقابلے میں اپنی درماندگیوں کا قدم قدم پر اعتراف کرنا پڑتا ہے لیکن درماندگیوں کے اس احساس سے اس کی سعی و طلب کی اُمنگیں پژمردہ نہیں ہو جاتیں بلکہ اور زیادہ شگفتگیوں کے ساتھ اُبھرنے لگتی ہیں، اور اُسے اور زیادہ بلندیوں کی طرف اڑا لے جانا چاہتی ہیں ۔ سوال یہ ہے کہ فکر و ادراک کی فضا لا متناہی جو انسان کو اپنی آغوش پرواز میں لیئے اُڑ رہی ہے، کیا ہے ؟ کیا اس کے جواب میں اس قدر کہہ دینا کافی ہو گا کہ یہ محض ایک اندھی بہری قوت ہے جو اپنے طبعی خواص اور طبعی احوال و ظروف سے ترقی کی ہوئی فکر و ادراک کا شعلۂ جوالہ بن گئی ؟ جو لوگ مادیت کے دائرے سے باہر دیکھنے کے عادی نہیں ہیں وہ بھی اس کی جرأت بہت کم کر سکے کہ اس سوال کا جواب بلا تامل اثبات میں دے دیں ۔

میں ابھی اُس انقلاب کی طرف اشارہ کرنا نہیں چاہتا جو انیسویں صدی کے آخر میں رونما ہونا شروع ہوا اور جس نے بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی کلاسیکل طبعیات کے تمام بنیادی مسلمات یک قلم متزلزل کر دیے ۔ میں ابھی اس سے الگ رہ کر ایک عام نقطۂ نگاہ سے مسئلے کا مطالعہ کر رہا ہوں ۔

اور پھر خود وہ صورت حال جسے ہم نشو و ارتقاء Evolution سے تعبیر کرتے ہیں، کیا ہے ؟ اور کیوں ہے ؟ کیا وہ ایک خاص رُخ کی طرف انگلی اٹھائے اشارہ نہیں کر رہی ہے ؟ ہم نے سینکڑوں برس کی سراغ رسانیوں کے بعد یہ حقیقت معلوم کی کہ تمام موجوداتِ ہستی آج جس شکل و نوعیت میں پائی جاتی ہیں، یہ یک دفعہ ظہور میں نہیں آ گئیں ۔

یعنی کسی براہِ راست تخلیقی عمل نے یکایک یہ تشکل و نوعیت نہیں دے دی بلکہ ایک تدریجی تغیر کا عالمگیر قانون یہاں کام کرتا رہا ہے اور اس کی اطاعت و انقیاد میں ہر چیز درجہ بدرجہ بدلتی رہتی ہے اور ایک ایسی آہستہ چال سے، جسے ہم فلکی اعداد و شمار کی مدتوں سے بھی بمشکل اندازے میں لا سکتے ہیں، نیچے سے اوپر کی طرف بڑھتی چلی آتی ہے۔ ذرات سے لے کر اجرامِ سماوی تک، سب نے اسی قانون تغیر و تحول کے ماتحت اپنی موجودہ تشکل و نوعیت کا جامہ پہنا ہے۔ یہی نیچے سے اوپر کی طرف چڑھتی ہوئی رفتارِ فطرت ہے جسے ہم "نشوءِ ارتقا" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں یعنی ایک معین طے شدہ، ہم آہنگ اور منظم، ارتقائی تقاضا ہے جو تمام کارخانۂ ہستی پر چھایا ہوا ہے اور اُسے کسی خاص رُخ کی طرف اُٹھائے اور بڑھائے لے جا رہا ہے۔ ہر نچلی کڑی بتدریج اپنے سے اوپر کی کڑی کا درجہ پیدا کرے گی اور ہر اوپر کا درجہ نچلے درجے کی رفتارِ حال پر ایک خاص طرح کا اثر ڈالتے ہوئے اُسے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا رہے گا۔ یہ ارتقائی صورتِ حال خود توضیح Self explanatory نہیں ہے یہ اپنی ایک توضیح چاہتی ہے لیکن کوئی مادی توضیح ہمیں ملتی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیوں صورتِ حال ایسی ہی ہوئی کہ یہاں ایک ارتقائی تقاضا موجود ہو اور وہ ہر تخلیقی ظہور کو نچلی حالتوں سے اُٹھاتا ہوا بلند تر درجوں کی طرف بڑھائے لے جائے؟ کیوں فطرتِ وجود میں رفعت طلبیوں کا ایسا تقاضا پیدا ہوا کہ سلسلۂ اجسام کی ایک مرتب سیڑھی نیچے سے اُوپر تک اُٹھتی ہوئی چلی گئی، جس کا ہر درجہ اپنے مابعد سے اوپر مگر اپنے ماسبق سے نیچے واقع ہوا ہے؟ کیا یہ صورتِ حال بغیر کسی معنی اور حقیقت کے ہے؟ کیا یہ سیڑھی بغیر کسی بالا خانے کی موجودگی کے بن گئی اور یہاں کوئی بامِ رفعت نہیں جس تک یہ ہمیں پہنچانا چاہتی ہو؟

یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست

زمانۂ حال کے علماء علم الحیات میں پروفیسر لائیڈ مارگن Lloyd Morgan

نے اس مسئلے کا علم الحیاتی Biological نقطۂ خیال سے گہرا مطالعہ کیا ہے لیکن بالآخر اسے بھی اسی نتیجے تک پہنچنا پڑا کہ اس صورتِ حال کی کوئی مادی توضیح نہیں کی جاسکتی۔ وہ لکھتا ہے کہ جو حاصلات Resultants یہاں کام کر رہی ہیں۔ ہم ان کی توضیح اس اعتبار سے تو کرسکتے ہیں کہ انھیں موجودہ احوال و ظروف کا نتیجہ قرار دیں لیکن ارتقائی تقاضے کا فجائی ظہور (Emergence) جس طرح ابھرتا رہا ہے۔ مثلاً زندگی کی نمود، ذہن و ادراک کی جلوہ طرازی، ذہنی شخصیت اور معنوی انفرادیت کا ڈھلاؤ، ان کی کوئی توضیح بغیر اس کے نہیں کی جاسکتی کہ ایک الٰہی قوت کی کارفرمائی یہاں تسلیم کرلی جائے۔ ہمیں یہ صورتِ حال بالآخر مجبور کر دیتی ہے کہ فطرت کائنات میں ایک تخلیقی اصل (Creative principle) کی کارفرمائی کے اعتقاد سے گریز نہ کریں۔ ایک ایسی تخلیقی اصل، جو اس کارخانۂ ظرف و زمان میں ایک لازمانی Time Less حقیقت ہے۔

حقائقِ ہستی کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ایک خاص بات فوراً ہمارے سامنے ابھرنے لگتی ہے۔ یہاں فطرت کا ہر نظام کچھ اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ جب تک اسے اس کی سطح سے بلند ہو کر نہ دیکھا جائے، اُس کی حقیقت بے نقاب نہیں ہوسکتی یعنی فطرت کے ہر نظم کو دیکھنے کے لیے ہمیں ایک ایسا مقامِ نظر پیدا کرنا پڑتا ہے۔ جو خود اُس سے بلند تر جگہ پر واقع ہے۔ عالمِ طبیعیات کے غوامض علم الحیاتی Biological عالم میں کھلتے ہیں۔ علم الحیاتی غوامض نفسیاتی Psychological عالم میں نمایاں ہوتے ہیں۔ نفسیاتی غوامض کے لیے ہمیں منطقی بحث و تحلیل کے عالم میں آنا پڑتا ہے۔ لیکن منطقی بحث و تحلیل کے معموں کو کس مقام سے دیکھا جائے؟ اس سے اوپر بھی کوئی مقامِ نظر ہے یا نہیں جو حقیقت کی کسی آخری منزل تک ہمیں پہنچا سکتا ہو؟

ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ اس سے اوپر بھی ایک مقامِ نظر ہے۔ لیکن وہ اس سے

بلند تر ہے کہ عقلی نظر و تحلیل سے اُس کی نقش آرائی کی جا سکے۔ وہ ماورا محسوسات Super Sensible ہے اگرچہ محسوسات سے معارض نہیں۔ وہ ایک ایسی آگ ہے جو دیکھی نہیں جا سکتی۔ البتہ اس کی گرمی سے ہاتھ تاپ لیے جا سکتے ہیں۔ ومن لم یذق، لم یدر:

تو نظر باز نہ، ورنہ تغافل نگہ ست
تو زباں فہم نہ، ورنہ خموشی سخن ست

کائنات ساکن نہیں ہے متحرک ہے اور ایک خاص رُخ پر بنتی اور سنورتی ہوئی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا اندرونی تقاضا ہر گوشے میں تعمیر و تکمیل ہے۔ اگر کائنات کی اس عالمگیر ارتقائی رفتار کی کوئی مادی توجیح ہمیں نہیں ملتی تو ہم غلطی پر نہیں ہو سکتے اگر اس معمے کا حل روحانی حقائق میں ڈھونڈنا چاہتے ہیں۔

اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ مادے کی نوعیت کے بارے میں اٹھارھویں اور انیسویں صدی نے جو عقائد پیدا کیے تھے۔ وہ اس صدی کے شروع ہوتے ہی ہلنا شروع ہو گئے اور اب یکسر منہدم ہو چکے ہیں۔ اب ٹھوس مادہ کی جگہ مجرد قوت نے لے لی ہے اور الکٹرون Electron کے خواص و افعال اور سالمات کے اعدادی و شماری انضباط کے مباحث نے معاملے کو سائنس کے دائرے سے نکال کر پھر فلسفے کے صحرا میں گم کر دیا ہے۔ سائنس کو اپنی خارجیت Objective کے علم و انضباط کا جو یقین تھا۔ وہ اب یکسر متزلزل ہو چکا اور پھر داخلی ذہنیت (Subjective) کے اُسی ذہنی اور کلیاتی مقام پر واپس لوٹ رہا ہے۔ جہاں سے نشاۃ جدیدہ کے دور کے بعد اس نے نئی مسافرت کے قدم اُٹھائے تھے لیکن میں ابھی یہ داستان نہیں چھیڑوں گا کیونکہ بجائے خود ایک مستقل مبحث ہے۔

یہ سچ ہے کہ یہ راہ محض استدلالی ذریعۂ علم سے طے نہیں کی جا سکتی۔ یہاں کی

اصلی روشنی کیف و مشاہدہ کی روشنی ہے۔ لیکن اگر ہم کشف و مشاہدہ کے عالم کی خبر نہیں رکھنی چاہتے جب بھی حقیقت کی نشانیاں اپنے چاروں طرف دیکھ سکتے ہیں، اور اگر غور کریں تو خود ہماری ہستی ہی سرتاسر نشانِ راہ ہے۔ ولقد احسن من قال:

خلقے نشانِ دوست طلب می کنند و باز
از دوست غافل اند بہ چندیں نشاں کہ ہست!

ابوالکلام

مکتوب

قلعہ احمد نگر

۵ ردسمبر ۱۹۴۲ء

صدیقِ مکرّم!

پانچویں صلیبی حملے کی سرگزشت ایک فرانسیسی مجاہد Crusader ژے آن دہ ژواین ویل Jean De Jaine Ville نامی نے بطورِ یادداشت کے قلمبند کی تھی۔ اس کے کئی انگریزی ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ زیادہ متداول نسخہ ایوری مینس لائبریری کا ہے۔

پانچواں صلیبی حملہ سینٹ لوئس St. Louis شاہِ فرانس نے براہِ راست مصر پر کیا تھا۔ دمیاط Demeitta کا عارضی قبضہ، قاہرہ کی طرف اقدام، ساحلِ نیل کی لڑائی، صلیبیوں کی شکست، خود سینٹ لوئس کی گرفتاری اور زرِ فدیہ کے معاہدے پر رہائی، تاریخ کے مشہور واقعات ہیں اور عرب مؤرخوں نے ان کی تمام تفصیلات قلمبند کی ہیں۔ لوئس رہائی کے بعد عکّہ Acra آیا جو چند دوسرے مقامات کے ساتھ صلیبیوں کے قبضے میں باقی رہ گیا تھا اور کئی سال تک وہاں مقیم رہا۔ ژواین ویل نے یہ تمام زمانہ لوئس کی ہمراہی میں بسر کیا تھا۔ مصر اور عکّہ کے تمام واقعات اس کے چشم دید واقعات ہیں۔

لوئس ۱۲۴۸ء میں فرانس سے روانہ ہوا۔ دوسرے سال دمیاط پہنچا۔ تیسرے سال عکّہ۔ پھر ۱۲۵۴ء میں فرانس واپس ہوا۔ یہ سنین اگر ہجری سنین کے مطابق کیے جائیں تو تقریباً ۶۴۶ھ اور ۶۵۲ھ ہوتے ہیں۔

ژواین ویل جب لوئس کے ہمراہ فرانس سے روانہ ہوا تو اس کی عمر چوبیس برس کی تھی۔ لیکن یہ یادداشت اس نے بہت عرصے کے بعد اپنی زندگی کے آخری سالوں

میں لکھی۔ یعنی ۱۳۰۹ء (۷۰۸ھ) میں جب اُس کی عمر خود اُس کی تصریح کے مطابق پچاسی برس کی ہو چکی تھی اور صلیبی حملے کے واقعات پر نصف صدی کی مدت گزر چکی تھی۔ اس کی کوئی تصریح موجود نہیں جس کی بنا پر یہ خیال کیا جا سکے کہ مصر اور فلسطین کے قیام کے زمانے میں وہ اہم واقعات قلمبند کر لیا کرتا تھا۔ پس جو کچھ اُس نے لکھا ہے وہ پچاسی برس پیشتر کے حوادث کی ایک ایسی روایت ہے جو اُس کے حافظے نے محفوظ رکھ لی تھی۔ بایں ہمہ اس کے بیانات، جہاں تک واقعاتِ جنگ کا تعلق ہے، عام طور پر قابلِ وثوق تسلیم کیے گئے ہیں۔

مسلمانوں کے دینی عقائد و اعمال اور اخلاق و عادات کی نسبت اس کی معلومات ازمنۂ وسطیٰ کی عام فرنگی معلومات سے چنداں مختلف نہیں، تاہم درجے کا فرق ضرور ہے۔ چونکہ اب یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے باہمی تعلقات پر، جو صلیبی لڑائیوں کے سائے میں نشو و نما پاتے رہے تھے، تقریباً ڈیڑھ سو برس کا زمانہ گزر چکا تھا اور فلسطین کے نوآبادی صلیبی مجاہد اب مسلمانوں کو زیادہ قریب ہو کر دیکھنے لگے تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر ژواین ویل کے ذہنی تاثرات کی نوعیت اُن تاثرات کی نوعیت سے مختلف دکھائی دیتی ہے جو ابتدائی عہد کے صلیبیوں کے رہ چکے ہیں۔ مسلمان کافر ہیں، ہیدین Heathen ہیں، پے نیم Panim ہیں، پے گن Pagan ہیں۔ مسیح کے دشمن ہیں۔ تاہم کچھ اچھی باتیں بھی اُن کی نسبت خیال میں لائی جا سکتی ہیں اور اُن کے طور طریقے میں تمام باتیں بُری ہی نہیں ہیں۔ مصری حکومت اور اُس کے ملکی اور فوجی نظام کے بارے میں اُس نے جو کچھ لکھا ہے وہ ستر فی صدی کے قریب صحیح ہے۔ لیکن مسلمانوں کے دینی عقائد و اعمال کے بیانات میں پچیس فی صدی سے زیادہ صحت نہیں۔ پہلی معلومات غالباً اُس کی ذاتی ہیں، اس لیے صحت سے قریب تر ہیں۔ دوسری معلومات زیادہ تر فلسطین کے کلیسائی حلقوں سے حاصل کی گئی ہیں، اس لیے تعصب و نفرت پر مبنی ہیں۔ اُس عہد کی عام فضا دیکھتے

ہوئے یہ صورتِ حال چنداں تعجب انگیز نہیں۔

ایک عرصے کے بعد مجھے اس کتاب کے دیکھنے کا یہاں پھر اتفاق ہوا۔ ایک رفیقِ زنداں نے ایوری مینس لائبریری کی کچھ کتابیں منگوائی تھیں۔ اُن میں یہ بھی آگئی۔ اس سلسلے میں دو واقعات خصوصیت کے ساتھ قابلِ غور ہیں۔

قیامِ عکّہ کے زمانے میں لوئس نے ایک سفیر سلطان دمشق کے پاس بھیجا تھا جس کے ساتھ ایک شخص ایوے لابریتاں Yevolabretan بطور مترجم کے گیا تھا۔ یہ شخص مسیحی واعظوں کے ایک حلقے سے تعلق رکھتا تھا اور مسلمانوں کی زبان سے واقف تھا۔ مسلمانوں کی زبان سے مقصود یقیناً عربی زبان ہے۔ ژوآین ویل اس سفارت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"جب سفیر اپنی قیام گاہ سے سُلدان (سلطان) کے محل کی طرف جا رہا تھا تو لابریتاں کو راستے میں ایک مسلمان بڑھیا عورت ملی۔ اُس کے دہنے ہاتھ میں ایک برتن آگ کا تھا۔ بائیں ہاتھ میں پانی کی صراحی تھی۔ لابریتاں نے اس عورت سے پوچھا "یہ چیزیں کیوں اور کہاں لے جا رہی ہو؟" عورت نے کہا "میں چاہتی ہوں اس آگ سے جنّت کو جلا دوں اور پانی سے جہنم کی آگ بجھا دوں تاکہ پھر دونوں کا نام و نشان باقی نہ رہے۔" لابریتاں نے کہا "تم ایسا کیوں کرنا چاہتی ہو؟" اُس نے جواب دیا "اس لیے تاکہ کسی انسان کے لیے اس کا موقع باقی نہ رہے کہ جنّت کے لالچ اور جہنّم کے ڈر سے نیک کام کرے، پھر وہ جو کچھ کرے گا، صرف خدا کی محبت کے لیے کرے گا!"

240: Memoirs of the Crusades

اس روایت کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ بجنسہٖ یہی عمل اور یہی قول حضرت رابعہ بصریّہ سے منقول ہے۔ اس وقت کتابیں یہاں موجود نہیں لیکن حافظہ سے مدد لے کر کہہ سکتا ہوں کہ قشیری، ابوطالب مکّی، فریدالدین عطار، صاحب عرائس المجالس، صاحب رُوح البیان اور شعرانی، سب نے یہ مقولہ نقل کیا ہے اور اسے رابعہ بصریہ کے فضائل

مقالات میں سے قرار دیا ہے۔

رابعہ بصریہ پہلے طبقے کی کبار صوفیہ میں شمار کی گئی ہیں۔ دوسری صدی ہجری یعنی آٹھویں صدی مسیحی میں اُن کا انتقال ہُوا۔ ان کے حالات میں سب لکھتے ہیں کہ ایک دن اس عالم میں گھر سے نکلیں کہ ایک ہاتھ میں آگ کا برتن تھا، دوسرے میں پانی کا کوزہ۔ لوگوں نے پوچھا۔ کہاں جا رہی ہو، جواب میں بجنسہٖ وہی بات کہی جو لا بریتان نے دمشق کی عورت کی زبانی نقل کی ہے: "آگ سے جنّت کو جلا دینا چاہتی ہوں۔ پانی سے دوزخ کی آگ بجھا دینا چاہتی ہوں تاکہ دونوں ختم ہو جائیں اور پھر لوگ خدا کی عبادت صرف خُدا کے لیے کریں۔ جنّت اور دوزخ کے طمع و خوف سے نہ کریں۔"

قدرتی طور پر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوسری صدی ہجری کی رابعہ بصریہ کا مقولہ کس طرح ساتویں صدی ہجری کی ایک زبان پر طاری ہو گیا جو دمشق کی سڑک سے گزر رہی تھی؟ یہ کیا بات ہے کہ تعبیرِ معارف کی ایک خاص تمثیل (پارٹ) جو پانچ سو برس پہلے بصرہ کے ایک کوچے میں دکھائی گئی تھی۔ بعینہٖ اب دمشق کی ایک شاہراہ پر دہرائی جا رہی ہے؟ کیا یہ محض افکار و احوال کا توارد ہے یا تکرار اور نقالی ہے؟ یا پھر راوی کی ایک افسانہ تراشی؟

ہر توجیہ کے لئے قرائن موجود ہیں اور معاملہ مختلف پہلوؤں میں سامنے آتا ہے۔

(۱) یہ وہ زمانہ تھا جب صلیبی جماعتوں کی قوت فلسطین میں پاش پاش ہو چکی تھی۔ ساحل کی ایک چھوٹی سی دھجّی کے سوا اُن کے قبضہ میں اور کچھ باقی نہیں رہا تھا اور وہاں بھی امن اور چین کی زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے۔ رات دن کے لگاتار حملوں اور محاصروں سے پامال ہوتے رہتے تھے۔ لوئس اُن کی اعانت کے لیے آیا لیکن وہ خود اعانت کا محتاج ہو گیا۔ جنگی قوت کے افلاس سے کہیں زیادہ اُن کا اخلاقی افلاس اُنھیں تباہ کر رہا تھا۔ ابتدائی عہد کا مجنونانہ مذہبی جوش و خروش جو تمام یورپ کو بہالے گیا تھا، اب ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور اُس کی جگہ ذاتی خود غرضیاں

اور صلیبی حلقہ بندیوں کی باہمی رقابتیں کام کرنے لگی تھیں۔ پے در پے شکستوں اور ناکامیوں سے جب ہمتیں پست ہوئیں تو اصل مقصد کی کشش بھی کمزور پڑ گئی۔ اور بدعملیوں اور ہوس رانیوں کا بازار گرم ہوگیا۔ مذہبی پیشواؤں کی حالت امراء اور عوام سے بھی بدتر تھی۔ دینداری کے اخلاص کی جگہ ریاکاری اور نمائش ان کا سرمایۂ پیشوائی تھے۔ ایسے افراد بہت کم تھے جو واقعی مخلص اور پاک عمل ہوں۔

جب اس عہد کے مسلمانوں کی زندگی سے اس صورتِ حال کا مقابلہ کیا جاتا تھا تو مسیحی زندگی کی مذہبی اور اخلاقی پستی اور زیادہ نمایاں ہونے لگتی تھی۔ مسلمان اب صلیبیوں کے ہمسائے میں تھے اور التوائے جنگ کے بڑے بڑے وقفوں نے باہمی میل جول کے دروازے دونوں پر کھول دیے تھے۔ صلیبیوں میں جو لوگ پڑھے لکھے تھے ان میں سے بعض نے شامی عیسائیوں کی مدد سے مسلمانوں کی زبان بھی سیکھ لی تھی اور ان کے مذہبی اور اخلاقی افکار و عقائد سے واقفیت پیدا کرنے لگے تھے۔ کلیسائی واعظوں کے جو حلقے یہاں کام کر رہے تھے۔ ان میں بھی بعض متجسس طبیعتیں ایسی پیدا ہوگئی تھیں جو مسلمان عالموں اور صوفیوں سے ملتیں اور دینی اور اخلاقی مسائل پر مذاکرے کرتیں۔ اس عہد کے متعدد عالموں اور صوفیوں کے حالات میں ایسی تصریحات ملتی ہیں کہ صلیبی قسیس اور رہبان ان کے پاس آتے اور باہمدگر سوال و جواب ہوتے۔ بعض مسلمان علماء جو صلیبیوں کے ہاتھ گرفتار ہوگئے تھے۔ عرصہ تک ان میں رہے اور ان کے مذہبی پیشواؤں سے مذہبی مباحثے کیے۔ شیخ سعدی شیرازی کو اسی عہد میں صلیبیوں نے گرفتار کر لیا تھا اور انھیں عرصے تک طرابلس میں گرفتاری کے دن کاٹنے پڑے تھے۔

اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ صلیبیوں میں جو لوگ مخلص اور اثر پذیر طبیعتیں رکھتے تھے۔ وہ اپنے گروہ کی حالت کا مسلمانوں کی حالت سے مقابلہ کرتے۔ وہ مسلمانوں کا مذہبی اور اخلاقی تفوق دکھا کر عیسائیوں کو غیرت دلاتے کہ اپنی نفس پرستیوں

اور بدعملیوں سے باز آئیں اور مسلمانوں کی دین دارانہ زندگی سے عبرت پکڑیں۔ چنانچہ خود ژوائن ویل کی سرگزشت میں جا بجا اس ذہنی انفعال کی جھلک اُبھرتی رہتی ہے۔ متعدد مقام ایسے ملتے ہیں جہاں وہ مسلمانوں کی زبانی اس طرح کے اقوال نقل کرتا ہے جس سے عیسائیوں کے لیے عبرت اور تنبہ کا پہلو نکلتا ہے۔ اسی دمشق کی سفارت کے سلسلے میں اُس نے جان دی آرمینین John the Armenian کے سفرِ دمشق کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ یہ شخص دمشق اس لیے گیا تھا کہ کمانیں بنانے کے لیے سینگ اور سریش خرید کرے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے دمشق میں ایک عمر رسیدہ مسلمان ملا۔ جس نے میری وضع قطع دیکھ کر پوچھا۔ "کیا تم مسیحی ہو؟" میں نے کہا۔ "ہاں"۔ مسلمان شیخ نے کہا۔ "تم مسیحی آپس میں ایک دوسرے سے اب نفرت کرنے لگے ہو، اسی لیے ذلیل و خوار ہو رہے ہو۔ ایک زمانہ وہ تھا جب میں نے یروشلم کے صلیبی بادشاہ بالڈوین Baldwin کو دیکھا تھا۔ وہ کوڑھی تھا اور اس کے ساتھ مسلّح آدمی صرف تین سو تھے۔ پھر بھی اُس نے اپنے جوش و ہمت سے سالادین (صلاح الدین) کو پریشان کر دیا تھا لیکن اب تم اپنے گناہوں کی بدولت اتنے گر چکے ہو کہ ہم جنگلی جانوروں کی طرح تمھیں رات دن شکار کرتے رہتے ہیں"

پس ممکن ہے کہ لابرتیان ایسے ہی لوگوں میں سے ہو جنھیں مسلمان صوفیوں کے اعمال و اقوال سے یک گونہ واقفیت حاصل ہو گئی ہو اور وہ وقت کے ہر معاملے کو عیسائیوں کی عبرت پذیری کے لیے کام میں لانا چاہتا ہو۔ لابرتیان کی نسبت ہمیں بتایا گیا ہے کہ مسیحی واعظوں کے حلقے سے وابستگی رکھتا تھا اور عربی زبان سے واقف تھا۔ کچھ بعید نہیں کہ اُسے اُن خیالات سے واقفیت کا موقع ملا ہو جو اُس کے عہد کے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں عام طور پر پائے جاتے تھے۔ چونکہ رابعہ بصریہ کا یہ مقولہ عام طور پر مشہور تھا اور مسلمانوں کے میل جول سے اُس کے علم میں آچکا تھا۔ اس لیے سفرِ دمشق کے موقع سے فائدہ اُٹھا کر اُس نے ایک عبرت انگیز کہانی گھڑ لی۔

مقصود یہ تھا کہ عیسائیوں کو دین کے اخلاصِ عمل کی ترغیب دلائی جائے اور دکھایا جائے کہ مسلمانوں میں ایک بڑھیا عورت کے اخلاصِ عمل کا جو درجہ ہے وہ اُس تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ خود ژواآین ویل کے علم میں یہ مقولہ آیا ہو اور اُس نے لابیتان کی طرف منسوب کر کے اُسے دمشق کے ایک بروقت واقعے کی شکل دے دی گئی ہو

ہمیں معلوم ہے کہ انیسویں صدی کے نقادوں نے ژواآین ویل کو صلیبی عہد کا ایک ثقہ راوی قرار دیا ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ وہ بظاہر ایک دیندار اور مخلص مسیحی تھا جیسا کہ اُس کی تحریر سے جا بجا مترشح ہوتا ہے تاہم یہ ضروری نہیں کہ ایک دین دار راوی میں دینی اور اخلاقی اغراض سے مفید مقصد روایتیں گھڑنے کی استعداد نہ رہی ہو۔ فن روایت کی گہرائیوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ نیک سے نیک انسان بھی بعض اوقات جعل صناعت کے تقاضوں سے اپنی نگرانی نہیں کر سکتے۔ وہ اس دھوکے میں پڑ جاتے ہیں کہ اگر کسی نیک مقصد کے لیے ایک مصلحت آمیز جعلی روایت گھڑ لی جائے تو کوئی بُرائی کی بات نہیں۔ مسیحی مذہب کے ابتدائی عہدوں میں جن لوگوں نے حواریوں کے نام سے طرح طرح کے نوشتے گھڑے تھے اور جنھیں آگے چل کر کلیسا نے غیر معروف و مدفون Apocrypha نوشتوں میں شمار کیا تھا۔ وہ یقیناً بڑے ہی دیندار اور مقدس آدمی تھے۔ تاہم یہ دینداری انھیں اس بات سے نہ روک سکی کہ حواریوں کے نام سے جعلی نوشتے طیار کر لیں۔

تاریخِ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جن لوگوں نے بے شمار جھوٹی حدیثیں بنائیں ان میں ایک گروہ دیندار واعظوں اور مقدس زاہدوں کا بھی تھا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ لوگوں میں دینداری اور نیک عملی کا شوق پیدا کرنے کے لیے جھوٹی حدیثیں گھڑ کر سُنانا کوئی بُرائی کی بات نہیں۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل کو کہنا پڑا کہ حدیث کے واضعوں میں سب سے زیادہ خطرناک گروہ ایسے ہی لوگوں کا ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ یہ زمانہ یعنی ساتویں صدی ہجری کا زمانہ صوفیانہ افکار و اعمال کے شیوع و احاطہ کا زمانہ تھا۔ تمام عالمِ اسلامی خصوصاً بلادِ مصر و شام میں وقت کی مذہبی زندگی کا عام رجحان تصوّف اور تصوف آمیز خیالات کی طرف جا رہا تھا۔ ہر جگہ کثرت کے ساتھ خانقاہیں بن گئی تھیں اور عوام اور امرا دونوں کی عقیدت مندیاں انھیں حاصل تھیں۔ تصوّف کی اکثر متداول مصنفات تقریباً اُسی صدی اور اُس کے بعد کی صدی میں مدوّن ہوئیں۔ حافظ ذہبی، جنھوں نے اس زمانے سے ساٹھ ستّر برس بعد اپنی مشہور تاریخ لکھی ہے، لکھتے ہیں کہ اس عہد کے تمام ملوک اور امرا مسلمان صوفیوں کے زیرِ اثر تھے۔ مقریزی نے تاریخ مصر میں جن خانقاہوں کا حال لکھا ہے ان کی بڑی تعداد تقریباً اسی عہد کی پیداوار ہے۔ ایسی حالت میں یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں کہ جن صلیبیوں کو مسلمانوں کے خیالات سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا ہو وہ مسلمان صوفیوں کے اقوال پر مطلع ہو گئے ہوں کیونکہ وقت کا عام رنگ یہی تھا۔

(۲) یہ بھی ممکن ہے کہ لابرتیان ایسے لوگوں میں سے ہو جن میں افسانہ سرائی اور حکایت سازی کا ایک قدرتی تقاضا پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ بغیر کسی مقصد کے بھی محض سامعین کا ذوق و استعجاب حاصل کرنے کے لیے فرضی واقعات گھڑ لیا کرتے ہیں۔ دُنیا میں فنِ روایت کی آدھی غلط بیانیاں راویوں کے اسی جذبۂ داستان سرائی سے پیدا ہوئیں۔ مسلمانوں میں وعاظ و قصاص کا گروہ یعنی واعظوں اور قصّہ گویوں کا گروہ محض سامعین کے استعجاب و توجہ کی تحریک کے لیے سیکڑوں روایتیں برجستہ گھڑ لیا کرتا تھا اور پھر وہی روایتیں قیدِ کتابت میں آ کر ایک طرح کے نیم تاریخی مواد کی نوعیت پیدا کر لیتی تھیں۔ ملّا معین واعظ کاشفی وغیرہ کی مصنفات ایسے قصّوں سے بھری ہوئی ہیں۔

(۳) یہ بھی ممکن ہے کہ واقعہ صحیح ہو اور اُس عہد میں ایک ایسی صُوفی عورت

موجود ہو جس نے رابعہ بصریہ والی بات بطور نقل و اتباع کے یا واقعی اپنے استغراقِ حال کی بنا پر دُہرا دی ہو۔

افکار و احوال کے اشباہ و امثال ہمیشہ مختلف وقتوں اور مختلف شخصیتوں میں سر اُٹھاتے رہتے ہیں اور فکر و نظر کے میدان سے کہیں زیادہ احوال و واردات کا میدان اپنی یک رنگیاں اور ہم آہنگیاں رکھتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ساتویں صدی کی ایک صاحبِ حال عورت کی زبان سے بھی اخلاصِ عمل اور عشقِ الٰہی کی وہی تعبیر نکل گئی ہو جو دوسری صدی کی رابعۂ بصریہ کی زبان سے نکلی تھی۔ افسوس ہے کہ یہاں کتابیں موجود نہیں۔ ورنہ ممکن تھا کہ اس عہد کے صوفیۂ دمشق کے حالات میں کوئی سراغ مل جاتا۔ ساتویں صدی کا دمشق تصوف و اصحابِ تصوف کا دمشق ہے۔

یہ یاد رہے کہ تذکروں میں ایک رابعۂ شامیہ کا حال ملتا ہے۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو جامی نے بھی نفحات کے آخر میں ان کا ترجمہ لکھا ہے لیکن ان کا عہد اس سے بہت پیشتر کا ہے۔ اس عہد کے شام میں ان کی موجودگی تصور میں نہیں لائی جا سکتی۔

(۴) آخری امکانی صورت جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اُس میں کوئی نمائش پسند عورت تھی جو بطور نقالی کے صوفیوں کا پارٹ دکھایا کرتی تھی اور وہ لابریتان سے دوچار ہو گئی۔ یا یہ سُن کر کہ عکّہ کی مسیحی سفارت آرہی ہے قصداً اُس کی راہ میں آگئی، مگر یہ سب سے زیادہ بعید اور دُور از قرائن صورت ہے جو ذہن میں آسکتی ہے۔

ژواین ویل نے ایک دوسرا واقعہ "دی اولڈ مین آف دی ماؤنٹین" کی سفارت کا نقل کیا ہے یعنی کوہستانِ الموت کے "شیخ الجبال" کی سفارت کا جیسا کہ آپ کو معلوم ہے "شیخ الجبال" کے لقب سے پہلے حسن بن صباح ملقب ہوا

تھا۔ پھر اُس کا ہر جانشین اسی لقب سے پکارا جانے لگا۔ فرقۂ باطنیہ کی دعوت کا یہ عجیب و غریب نظام تاریخِ عالم کے غرائب حوادث میں سے ہے۔ یہ بغیر کسی بڑی فوجی طاقت کے تقریباً ڈیڑھ سو برس تک قائم رہا اور مغربی ایشیا کی تمام طاقتوں کو اُس کی ہولناکی کے آگے جھکنا پڑا۔ اُس نے یہ اقتدار فوج اور مملکت کے ذریعے حاصل نہیں کیا بلکہ صرف جانفروش فدائیوں کے بے پناہ قاتلانہ حملے تھے۔ جنھوں نے اُسے ایک ناقابلِ تسخیر طاقت کی حیثیت دے دی تھی۔ وقت کا کوئی بادشاہ، کوئی وزیر، کوئی امیر، کوئی سربرآوردہ انسان ایسا نہ تھا جس کے پاس اُس کا پُراسرار خنجر نہ پہنچ جاتا ہو۔ اس خنجر کا پہنچنا اس بات کی علامت تھی کہ اگر شیخ الجبال کی فرمائش کی تعمیل نہیں کی جائے گی تو بلا تامل قتل کر دیے جاؤ گے۔ یہ فدائی تمام شہروں میں پھیلے ہوئے تھے وہ سائے کی طرح پیچھا کرتے اور آسیب کی طرح محفوظ سے محفوظ گوشوں میں پہنچ جاتے۔

صلیبی جنگ آزماؤں کا بھی ان سے سابقہ پڑا۔ کئی ٹمپلر Templar اور ہاسپٹلر Hospitaller فدائیوں کے خنجروں کا نشانہ بنے۔ اور بالآخر مجبور ہو گئے کہ شیخ الجبال کی فرمائشوں کی تعمیل کریں۔ یروشلم (بیت المقدس) جب صلیبیوں نے فتح کیا تھا اور بالڈوین تختِ نشین ہوا تھا تو اُسے بھی ایک سالانہ رقم بطور نذر کے الموت بھیجنی پڑی تھی۔ فریڈرک ثانی جب ۱۲۲۹ء میں سلطانِ مصر کی اجازت لے کر یروشلم کی زیارت کے لیے آیا تو اُس نے بھی اپنا ایک سفیر گراں قدر تحفوں کے ساتھ شیخ الجبال کے پاس بھیجا تھا۔ یورپ میں قلعہ الموت کے عجائب کی حکایتیں انہی صلیبیوں کے ذریعے پھیلیں جو بعد کی مصنفات میں ہمیں طرح طرح کے ناموں سے ملتی ہیں۔ انیسویں صدی کے بعض افسانہ نگاروں نے اسی مواد سے اپنے افسانوں کی نقش آرائیاں کیں اور بعض اس دھوکے میں پڑ گئے کہ شیخ الجبال سے مقصود کوہستانِ شام کا کوئی پُراسرار شیخ تھا جس کا صدر مقام لبنان تھا!

ژوائن ویل لکھتا ہے:

* عکہ میں پادشاہ (لوئس) کے پاس کوہستان کے "اولڈ مین کے ایلچی آئے۔ ایک امیر عمدہ لباس میں ملبوس آگے تھا اور ایک خوش پوش نوجوان اس کے پیچھے۔ نوجوان کی مٹھی میں تین چھریاں تھیں جن کے پھل ایک دوسری کے دستے میں پیوست تھے۔ یہ چھریاں اس غرض سے تھیں کہ اگر پادشاہ امیر کی پیش کردہ تجویز منظور نہ کرے تو انھیں بطور مقابلہ کی علامت کے پیش کر دیا جائے۔ نوجوان کے پیچھے ایک دوسرا نوجوان تھا۔ اس کے بازو پر ایک چادر لپٹی ہوئی تھی۔ یہ اس غرض سے تھی کہ اگر پادشاہ سفارت کا مطالبہ منظور کرنے سے انکار کرے تو یہ چادر اس کے کفن کے لیے پیش کر دی جائے (یعنی اُسے "متنبہ" کر دیا جائے کہ اب اس کی موت ناگزیر ہے)"

امیر نے پادشاہ سے پوچھا "میرے آقا نے مجھے اس لیے بھیجا ہے کہ میں آپ سے پوچھوں کہ آپ انھیں جانتے ہیں یا نہیں؟" پادشاہ نے کہا "میں نے ان کا ذکر سُنا ہے۔" امیر نے کہا "پھر یہ کیا بات ہے کہ آپ نے اس وقت تک انھیں اپنے خزانے کے بہترین تحفے نہیں بھیجے جس طرح جرمنی کے شہنشاہ ہنگری کے پادشاہ، بابل کے سلدان (سلطان) اور دوسرے سلاطین انھیں سال بسال بھیجتے رہتے ہیں؟ ان تمام پادشاہوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ان کی زندگیاں میرے آقا کی مرضی پر موقوف ہیں۔ وہ جب چاہے، ان کی زندگیوں کا خاتمہ کرا دے سکتا ہے۔"

اس مکالمے میں شہنشاہ جرمنی اور شاہِ ہنگری کے سال بسال تحائف و نذور کا حوالہ دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے صرف ایک ہی مرتبہ اپنے زمانۂ ورودِ فلسطین میں تحفے نہیں بھیجے تھے بلکہ ہر سال بھیجتے رہے تھے۔ 'سلدانِ بابل' سے مقصود سلطانِ مصر ہے کیونکہ صلیبی زمانے کے فرنگی عام طور پر قاہرہ کو 'بابل' کے نام سے پکارتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ جس بابل کا ذکر کتبِ مقدسہ میں آیا ہے وہ یہی شہر ہے۔ چنانچہ اس دور کی تمام رزمیہ نظموں میں بار بار 'بابل' کا نام آتا ہے ایک صلیبی نائٹ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ کافروں کو رگیدتا ہوا ایسے

مقام تک چلا گیا جہاں سے "بابل" کے سر بفلک منارے صاف دکھائی دیتے تھے۔

اس کے بعد ژوآین ویل لکھتا ہے کہ اُس زمانے میں شیخ الجبال ٹمپل اور ہاسپٹلر کو ایک سالانہ رقم بطورِ خراج کے دیا کرتا تھا کیونکہ ٹمپلر اور ہاسپٹلر اس کے قاتلانہ حملوں سے بالکل نڈر تھے اور وہ اُنھیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ شیخ الجبال کے سفیر نے کہا: "اگر بادشاہ میرے آقا کی فرمائش کی تعمیل نہیں کرنی چاہتا تو پھر یہی کرے کہ جو خراج ٹمپل کو ادا کیا جاتا ہے۔ اُس سے میرے آقا کو بری الذمہ کرا دے۔" بادشاہ نے یہ پورا معاملہ ٹمپلرس کے حوالے کر دیا۔ ٹمپلرس نے دوسرے دن سفیر کو بلایا اور کہا "تمھارے آقا نے یہ بڑی غلطی کی کہ اس طرح کا گستاخانہ پیغام بادشاہِ فرانس کو بھیجا۔ اگر بادشاہ کے احترام سے ہم مجبور نہ ہوتے جس کی حفاظت تمھیں بہ حیثیت سفیر کے حاصل ہے تو ہم تمھیں پکڑ کے سمندر کی موجوں کے حوالے کر دیتے۔ بہرحال اب ہم تمھیں حکم دیتے ہیں کہ یہاں سے فوراً رخصت ہو جاؤ اور پھر پندرہ دن کے اندر الموت سے واپس آؤ۔ لیکن اس طرح واپس آؤ کہ ہمارے بادشاہ کے نام ایک دوستانہ خط اور قیمتی تحائف تمھارے ساتھ ہوں۔ اس صورت میں بادشاہ تمھارے آقا سے خوشنود ہو جائے گا اور ہمیشہ کے لیے اس کی دوستی تمھیں حاصل ہو جائے گی۔" چنانچہ سفیر اس حکم کی تعمیل میں فوراً رخصت ہو گئے اور ٹھیک پندرہ دن کے اندر شیخ کا دوستانہ خط اور قیمتی تحائف لے کر واپس ہوئے۔

ژوآین ویل کی روایت کا یہ حصّہ محلِ نظر ہے اور عرب مورّخوں کی تصریحات اس کا ساتھ نہیں دیتیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ صلیبی جماعتیں اپنے عروج و اقتدار کے زمانے میں مجبور ہوئی تھیں کہ اپنی جانوں کی سلامتی کے لیے شیخ الجبال کو نذرانے بھیجتی رہیں حتیٰ کہ فریڈرک ثانی نے بھی ضروری سمجھا تھا کہ اس طرح کی رسم و راہ قائم رکھے۔ پھر یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتی کہ ۱۲۵۱ء میں جبکہ صلیبیوں کی تمام طاقت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور فلسطین کے چند ساحلی مقامات میں ایک محصور و مقہور گروہ کی مایوس زندگی بسر کر رہے تھے،

کیوں اچانک صورتِ حال منقلب ہو جائے اور شیخ الجبال ٹمپلروں سے خراج لینے کی جگہ خراج دینے پر مجبور ہو جائے؟ اتنا ہی نہیں بلکہ ان تباہ حال ٹمپلروں سے اس درجہ خوف زدہ ہو کہ ان کے حاکمانہ احکام کی بلا چون وچرا تعمیل کر دے؟

جو بات قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ٹمپلروں اور ہاسپٹلروں کے تعلقات شیخ الجبال سے قدیمی تھے اور اس وابستگی کی وجہ سے ہر طرح کی سازباز اُس کے کارندوں کے ساتھ کرتے رہتے تھے۔ شیخ الجبال نے جب لوئس کی آمد کا حال سُنا اور یہ بھی سُنا کہ اُس نے ایک گراں قدر فدیہ دے کر سلطانِ مصر کی قید سے رہائی حاصل کی ہے تو حسبِ معمول اُسے مرعوب کرنا چاہا اور اپنے سفیر قاتلانہ حملوں کے مرموز پیاموں کے ساتھ بھیجے۔ لوئس کو معلوم ہو چکا تھا کہ ٹمپلروں سے شیخ کے پرانے تعلقات ہیں۔ اُس نے معاملہ ان کے سپرد کر دیا اور اُنھوں نے بیچ میں پڑ کر دونوں کے درمیان دوستانہ علاقہ قائم کرا دیا۔ پھر طرفین سے تحفہ تحائف ایک دوسرے کو بھیجے گئے اور دوستانہ خط وکتابت جاری ہو گئی۔ عرب مورخوں کی تصریحات سے بھی صورتِ حال کا ایسا ہی نقشہ سامنے آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیخ الجبال اور صلیبیوں کے باہمی تعلقات اس درجہ بڑھے ہوئے تھے کہ صلیبیوں نے کئی بار اُس کے فدائیوں کے ذریعے بعض سلاطینِ اسلام کو قتل کرانا چاہا تھا۔

لیکن پھر ژواین ویل کے بیان کی کیا توجیہ کی جائے؟

معاملہ دو حالتوں سے خالی نہیں۔ ممکن ہے کہ ٹمپلروں نے حقیقتِ حال مخفی رکھی ہو اور شیخ الجبال کے طرزِ عمل کی تبدیلی کو اپنے فرضی اقتدار و تحکم کی طرف منسوب کر دیا ہو۔ اس لیے ژواین ویل پر اصلیت نہ کھل سکی اور جو کچھ اُس نے سُنا تھا یادداشت میں لکھ دیا۔ یا پھر ماننا پڑے گا کہ خود ژواین ویل کی دینی اور قومی عصبیت بیانِ حقیقت میں حائل ہو گئی اور اُس نے صلیبیوں کا غیر معمولی تفوق اور اقتدار دکھانے کے لیے اصل واقعے کو یک قلم اُلٹ دیا۔ ژواین ویل نے صلیبیوں کی

شکستوں کی سرگزشت جس بے لاگ صفائی کے ساتھ قلمبند کی ہے، اُسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے غالباً قرینِ صواب پہلی ہی صورت ہوگی۔

اس روایت کی کمزوری اس بات سے بھی نکلتی ہے کہ ٹیلروں کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے سفیروں سے کہا، پندرہ دن کے اندر شیخ کا جواب لے کر واپس ہو، یعنی سات دن جانے میں صرف کرو، سات دن واپس آنے میں۔ یہ ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں عکّہ اور الموت کی باہمی مسافت سات دن کے اندر طے نہیں کی جاسکتی تھی۔ مستوفی نے نزہۃ القلوب میں اُس عہد کی منزلوں کا جو نقشہ کھینچا ہے اُس سے ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ شمالی ایران کے قافلے بیت المقدس تک کی مسافت دو ماہ سے کم میں طے نہیں کرسکتے تھے اور الموت تک پہنچنے کے لیے تو ایران سے بھی آگے کی مزید مسافت طے کرنی پڑتی ہوگی۔ ہاں برید یعنی گھوڑوں کی ڈاک کے ذریعے کم مدّت میں آمد و رفت ممکن ہوگی۔ لیکن سفیروں کا برید کے ذریعے سفر کرنا مستبعد معلوم ہوتا ہے۔

ژوائن ویل لکھتا ہے کہ شیخ الجبال نے لوئس کو جو تحفے بھیجے تھے اُن میں بلّور کا تراشا ہوا ایک ہاتھی اور ایک جی راف (Giraffe) یعنی زرافہ بھی تھا۔ نیز بلور کے سیب اور شطرنج کے مُہرے تھے۔ یہ اُسی طرح کی بلّوری مصنوعات ہوں گی جن کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ الموت کا باغِ بہشت ان سے آراستہ کیا گیا تھا۔ بلّوری مصنوعات مغربی ایشیا میں پہلے چین سے آتی تھیں پھر عرب صنّاع بھی بنانے لگے تھے۔

اس کے بعد اُس سفارت کا حال ملتا ہے جو لوئس نے شیخ الجبال کے پاس بھیجی تھی۔ اس سفارت میں بھی ہمارا پرانا دوست لابرتیان بطور مترجم کے نمایاں ہوتا ہے اور اُس کی زبانی شیخ کا ایک مکالمہ نقل کیا گیا ہے لیکن پورا مکالمہ بعید از قیاس باتوں پر مبنی ہے اور قابلِ اعتنا نہیں۔ بعض حصّے صریح بناوٹی معلوم ہوتے ہیں، یا

سر تا سر غلط فہمیوں سے وجود پذیر ہوئے ہیں۔ مثلاً شیخ الجبال نے سینٹ پیٹر (پطرس) کی تقدیس کی اور کہا "ہابیل کی روح نوح میں آئی۔ نوح کے بعد ابراہیم میں، اور پھر ابراہیم سے پیٹر میں منتقل ہوئی۔ اس وقت جبکہ "خدا زمین پر نازل ہوا تھا" (یعنی حضرت مسیح کا ظہور ہوا تھا)

ممکن ہے شیخ نے یہ بات ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ حضرت مسیح کا منکر نہیں ہے۔ یہ کہا ہو کہ جس وحی الٰہی کا ظہور پچھلے نبیوں میں ہوا تھا اُسی کا ظہور حضرت مسیح میں ہوا اور لابریتان نے اُسے دوسرا رنگ دے دیا۔

ٹروابن ویل شیعہ سُنی اختلاف سے واقف ہے لیکن اس کی تشریح یوں کرتا ہے:

"شیعہ محمدؐ کی شریعت پر نہیں چلتے۔ علیؑ کی شریعت پر چلتے ہیں۔ علیؑ، محمدؐ کا بھتیجا تھا۔ اُسی نے محمدؐ کو عزت کی مسند پر بٹھایا۔ لیکن جب محمدؐ نے قوم کی سرداری حاصل کر لی تو اپنے بھتیجے کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگا اور اس سے الگ ہو گیا۔ یہ حال دیکھ کر علیؑ نے کوشش کی کہ جتنے آدمی اپنے گرد جمع کر سکتا ہے جمع کر لے اور پھر انھیں محمدؐ کے دین کے علاوہ ایک دوسرے دین کی تعلیم دے۔ چنانچہ اس اختلاف کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ اب علیؑ کی شریعت پر عامل ہیں وہ محمدؐ کے ماننے والوں کو بے دین سمجھتے ہیں۔ اسی طرح پیروانِ محمدؐ پیروانِ علیؑ کو بے دین کہتے ہیں۔"

پھر لکھتا ہے "جب لابریتان شیخ الجبال کے پاس گیا تو اُسے معلوم ہوا کہ شیخ محمدؐ پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ علیؑ کی شریعت ماننے والا ہے۔"

ٹروابن ویل کا یہ بیان تمام تر اُن خیالات سے ماخوذ ہے جو اس عہد کے کلیسائی حلقوں میں عام طور پر پھیلے ہوئے تھے اور پھر صدیوں تک یورپ میں نسلاً بعد نسلٍ ان کی اشاعت ہوتی رہی۔ یہ بیانات کتنے ہی غلط ہوں تاہم اُن بیانات سے تو بہر حال غنیمت ہیں جو صلیبی حملے کے ابتدائی دور میں ہر کلیسائی واعظ کی زبان پر تھے

مثلاً یہ بیان کہ "موہامت" Mohamat ایک سونے کا خوفناک بُت ہے جس کی مسلمان پُوجا کرتے ہیں۔ چنانچہ فرانسیسی اور تلیانی (اٹالین) زبان کے قدیم ڈراموں میں ترواگال Tervagant اور Trivigante مسلمانوں کے ایک ہولناک بت کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا۔ یہی لفظ قدیم انگریزی میں آکر ٹرورے گینٹ Tervagant بن گیا اور اب ٹرمے گینٹ Termagant ایسی عورت کے لیے بولنے لگے ہیں جو وحشیانہ اور بے لگام مزاج رکھتی ہو۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ شیخ الجبال کون تھا؟ یہ زمانہ تقریباً ۶۴۹ھ کا زمانہ تھا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد تاتاریوں کی طاقت مغربی ایشیا میں پھیلی اور اُنھوں نے ہمیشہ کے لیے اس پُر اسرار مرکز کا خاتمہ کر دیا۔ پس غالباً یہ آخری شیخ الجبال خور شاہ ہوگا۔ یہاں کتابیں موجود نہیں۔ اس لیے قطعی طور پر نہیں لکھ سکتا۔

صلیبی لڑائیوں نے ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ کو مشرقِ وسطیٰ کے دوش بدوش کھڑا کر دیا تھا۔ یورپ اُس عہد کے مسیحی دماغ کی نمائندگی کرتا تھا، مشرقِ وسطیٰ مسلمانوں کے دماغ کی، اور دونوں کی متقابل حالت سے اُن کی متضاد نوعیتیں آشکارا ہوگئی تھیں۔ یورپ مذہب کے مجنونانہ جوش کا علم بردار تھا، مسلمان علم و دانش کے علم بردار تھے۔ یورپ دعاؤں کے ہتھیار سے لڑنا چاہتا تھا، مسلمان لوہے اور آگ کے ہتھیاروں سے لڑتے تھے۔ یورپ کا اعتماد صرف خدا کی مدد پر تھا، مسلمانوں کا خدا کی مدد پر بھی تھا لیکن خدا کے پیدا کیے ہوئے سروسامان پر بھی تھا۔ ایک صرف روحانی قوتوں کا معتقد تھا، دوسرا روحانی اور مادی دونوں کا۔ پہلے نے معجزوں کے ظہور کا انتظار کیا۔ دوسرے نے نتائجِ عمل کے ظہور کا۔ معجزے ظاہر نہیں ہوئے لیکن نتائجِ عمل نے ظاہر ہو کر فتح و شکست کا فیصلہ کر دیا۔

ژواین ویل کی سرگزشت میں بھی یہ متضاد تقابل ہر جگہ نمایاں ہے۔ جب مصری

فوجوں نے منجنیقوں Petard کے ذریعے آگ کے بان پھینکنے شروع کیے تو فرانسیسی جن کے پاس پرانے دستی ہتھیاروں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ بالکل بے بس ہو گئے۔ ژواین ویل اس سلسلے میں لکھتا ہے:

"ایک رات جب ہم ان برجیوں پر، جو دریا کے راستے کی حفاظت کے لیے بنائی گئی تھیں، پہرہ دے رہے تھے تو اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے ایک انجن جسے پٹریری (یعنی منجنیق) کہتے ہیں، لاکر نصب کر دیا اور اس سے ہم پر آگ پھینکنے لگے۔ یہ حال دیکھ کر لارڈ والٹر نے، جو ایک اچھا نائٹ تھا۔ ہمیں یوں مخاطب کیا، اس وقت ہماری زندگی کا سب سے بڑا خطرہ پیش آگیا ہے کیونکہ اگر ہم نے ان برجیوں کو نہ چھوڑا اور مسلمانوں نے ان میں آگ لگا دی تو ہم بھی برجیوں کے ساتھ جل کر خاک ہو جائیں گے لیکن اگر ہم برجیوں کو چھوڑ کر نکل جاتے ہیں تو پھر ہماری بے عزتی میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ ہم ان کی حفاظت پر مامور کیے گئے تھے۔ ایسی حالت میں خدا کے سوا کوئی نہیں جو ہمارا بچاؤ کر سکے۔ میرا مشورہ آپ سب لوگوں کو یہ ہے کہ جونہی مسلمان آگ کے بان چلائیں ہمیں چاہیے کہ گھٹنے کے بل جھک جائیں اور اپنے نجات دہندہ خداوند سے دعا مانگیں کہ اس مصیبت میں ہماری مدد کرے۔" چنانچہ ہم سب نے ایسا ہی کیا۔ جیسے ہی مسلمانوں کا پہلا بان چلا، ہم گھٹنوں کے بل جھک گئے اور دعا میں مشغول ہو گئے۔ یہ بان اتنے بڑے ہوتے تھے جیسے شراب کے پیپے اور آگ کا شعلہ، جو ان سے نکلتا تھا۔ اس کی دم اتنی لمبی ہوتی تھی جیسے ایک بہت بڑا نیزہ۔ جب یہ آتا تو ایسی آواز نکلتی جیسے بادل گرج رہے ہوں۔ اس کی شکل ایسی دکھائی دیتی تھی جیسے ایک آتشیں اژدہا ہوا میں اڑ رہا ہے۔ اس کی روشنی نہایت تیز تھی۔ چھاؤنی کے تمام حصے اس طرح اجالے میں آجاتے تھے جیسے دن نکل آیا ہو۔"

اس کے بعد خود لوئس کی نسبت لکھتا ہے:

"ہر مرتبہ جب بان چھوٹنے کی آواز ہمارا ولی صفت بادشاہ سنتا تھا تو بستر سے

اُٹھ کھڑا ہوتا تھا اور روتے ہوئے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر ہلاکو سے نجات دہندہ سے التجائیں کرتا۔ "مہربان مولیٰ! میرے آدمیوں کی حفاظت کر! میں یقین کرتا ہوں کہ ہمارے بادشاہ کی اِن دعاؤں نے ہمیں ضرور فائدہ پہنچایا"

لیکن فائدہ کا یہ یقین خود اعتقادانہ وہم سے زیادہ نہ تھا۔ کیونکہ بالآخر کوئی دُعا بھی سُودمند نہ ہُوئی اور آگ کے بانوں نے تمام برجیوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

یہ حال تو تیرھویں صدی مسیحی کا تھا لیکن چند صدیوں کے بعد جب پھر یورپ اور مشرق کا مقابلہ ہُوا تو اب صورتِ حال یکسر اُلٹ چکی تھی۔ اب بھی دونوں جماعتوں کے متضاد خصائص اُسی طرح نمایاں تھے جس طرح صلیبی جنگ کے عہد میں رہ چکے تھے، لیکن اتنی تبدیلی کے ساتھ کہ جو دماغی جگہ پہلے یورپ کی تھی وہ اب مسلمانوں کی ہوگئی تھی اور جو جگہ مسلمانوں کی تھی۔ اُسے اب یورپ نے اختیار کر لیا تھا۔

اٹھارھویں صدی کے اواخر میں جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو مراد بک نے جامع ازہر کے علماء کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ علماءِ ازہر نے بالاتفاق یہ رائے دی تھی کہ جامع ازہر میں صحیح بخاری کا ختم شروع کر دینا چاہیے کہ انجاحِ مقاصد کے لیے تیر بہدف ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا لیکن ابھی صحیح بخاری کا ختم ختم نہیں ہُوا تھا کہ اہرام کی لڑائی نے مصری حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ شیخ عبدالرحمٰن الجبرتی نے اس عہد کے چشم دید حالات قلمبند کیے ہیں اور بڑے ہی عبرت انگیز ہیں۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا محاصرہ کیا تھا تو امیرِ بخارا نے حکم دیا کہ تمام مدرسوں اور مسجدوں میں ختمِ خواجگان پڑھا جائے۔ اُدھر روسیوں کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں اِدھر لوگ ختمِ خواجگان کے حلقوں میں بیٹھے یامقلوب یا محوّل الاحوال کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ بالآخر وہی نتیجہ نکلا جو ایک ایسے مقابلے کا نکلنا تھا جس میں ایک طرف گولہ بارود ہو، دوسری طرف ختمِ خواجگان!

دُعائیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں مگر اُنھی کو پہنچاتی ہیں جو عزم و ہمت رکھتے ہیں۔ بے ہمتوں کے لیے تو وہ ترکِ عمل اور تعطلِ قویٰ کا حیلہ بن جاتی ہیں۔

ژواین ویل نے اس آتش فشانی کو 'یونانی آگ' Greek Fire سے تعبیر کیا ہے اور اسی نام سے اس کی یورپ میں شہرت ہوئی۔ غالباً اس تسمیہ کی وجہ یہ تھی کہ جس مواد سے یہ آگ بھڑکتی تھی وہ قسطنطنیہ میں صلیبیوں نے دیکھا تھا اور اس لیے اُسے یونانی آگ کے نام سے پکارنے لگے تھے۔

آتش فشانی کے لیے روغنِ نفط یعنی مٹی کا تیل کام میں لایا جاتا تھا۔ مٹی کے تیل کا یہ پہلا استعمال ہے جو عربوں نے کیا۔ آذر بائجان کے تیل کے چشمے اس زمانے میں بھی مشہور تھے۔ وہیں سے یہ تیل شام اور مصر میں لایا جاتا تھا۔ ابنِ فضل اللہ اور نویری نے اس کے استعمال کا مفصل حال لکھا ہے۔

آتش فشانی کے لیے دو طرح کی مشینیں کام میں لائی جاتی تھیں۔ ایک تو منجنیق قسم کی تھی جو پتھروں کے پھینکنے کے لیے ایجاد ہوئی تھی۔ دوسری ایک طرح کا آلہ کمان کی شکل کا تھا اور توپ کی بیڑیوں کی طرح زمین میں نصب کر دیا جاتا تھا۔ اس کی مار منجنیق سے بھی زیادہ دُور تک پہنچتی تھی۔ ژواین ویل نے پہلے کو Petard اور دوسرے کو Swivel crossbow سے موسوم کیا ہے۔ 'منجنیق' کا لفظ اُسی یونانی لفظ کی تعریب ہے جس سے انگریزی کا Mechanic فرانسیسی کا Mechanicus اور جرمن کا Machanicum نکلا ہے۔ یہ آلہ عربوں نے رومیوں اور ایرانیوں سے لیا تھا لیکن دوسرا خود عربوں کی ایجاد تھا، چنانچہ اُسے عربی میں 'مدفع' کہتے تھے یعنی پھینکنے والا آلہ۔ یہی 'مدفع' بعد کو توپ کے لیے بولا جانے لگا۔

عربی میں مٹی کے تیل کے لیے 'نفط' کا لفظ مستعمل ہوا۔ یہی لفظ ہے جس نے یورپ کی زبانوں میں Naphthalene, Napth وغیرہا کی شکل اختیار کر لی ہے۔

ابوالکلام

مکتوب

قلعہ احمد نگر

۱۷ دسمبر ۱۹۴۲ء

صدیقِ مکرم

وقت وہی ہے مگر افسوس، وہ چائے نہیں ہے جو طبعِ شورش پسند کو سرمستیوں کی اور فکرِ عالم آشوب کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتی تھی:

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار

رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے!

چینی چائے، جس کا عادی تھا، کئی دن ہوئے ختم ہو گئی اور احمد نگر اور پونا کے بازاروں میں کوئی اس جنسِ گرانمایہ سے آشنا نہیں:

یک نالۂ مستانہ زجائے نہ شنیدیم

ویراں شود آں شہر کہ مے خانہ ندارد!

مجبوراً ہندوستان کی اُسی سیاہ پتی کا جوشاندہ پی رہا ہوں جسے تعبیر و تسمیہ کے اس قاعدے کے بموجب کہ:

برعکس نہند نامِ زنگی کافور!

لوگ چائے کے نام سے پکارتے ہیں اور دُودھ ڈال کر اس کا گرم شربت بنایا کرتے ہیں:

درماندۂ صلاح و فسادیم، الحذر

زیں رسم ہا کہ مردمِ عاقل نہادہ اند!

اِس کارگاہِ سود و زیاں کی کوئی عشرت نہیں کہ کسی حسرت سے پیوستہ نہ ہو۔ ہاں زلالِ صافی کا کوئی جام نہیں بھرا گیا کہ دُردِ کدورت اپنی تہ میں نہ رکھتا ہو۔

بادۂ کامرانی کے تعاقب میں ہمیشہ خمارِ ناکامی لگا رہا اور خندۂ بہار کے پیچھے ہمیشہ گریۂ خزاں کا شیون برپا ہوا۔ ابوالفضل کیا خوب کہہ گیا ہے :

قدحے پُر نہ شد کہ تہی نہ کردند و سفحہ تمام نہ شد کہ ورق بر نہ گردید :

نیکو نہ بود ہیچ مرادے بہ کمال

چوں صفحہ تمام شد ورق بر گردد

اُمید ہے، کہ آپ کی "چینی چائے" کا ذخیرہ جس کا ایک مرتبہ رمضان میں آپ نے ذکر کیا تھا اس نایابی کی گزند سے محفوظ ہو گا :

اُمید کہ چوں بندہ تنک مایہ نہ باشی

مے خوردنِ ہر روزہ زعاداتِ کرم نیست

معلوم نہیں کہ کبھی اس مسئلے کے حقائق و معارف پر بھی آپ کی توجہ مبذول ہوئی ہے یا نہیں؟ اپنی حالت کیا بیان کروں؟ واقعہ یہ ہے کہ وقت کے بہت سے مسائل کی طرح اس معاملے میں بھی طبیعت کچھ سوادِ اعظم کے مسلک سے متفق نہ ہو سکی زمانے کی بے راہ رویوں کا ہمیشہ ماتم گسار رہنا پڑا :

ازاں کہ پیروی خلق گمرہی آرد

نمی رویم براہے کہ کارواں رفتہ ست

چائے کے باب میں ابنائے زمانہ سے میرا اختلاف صرف شاخوں اور پتوں کے معاملے ہی میں نہیں ہوا کہ مفاہمت کی صورت نکل سکتی بلکہ سرے سے جڑ میں ہوا۔ یعنی اختلاف فرع کا نہیں، اصل الاصول کا ہے :

دہن کا ذکر کیا، یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے!

سب سے پہلا سوال چائے کے بارے میں خود چائے کا پیدا ہوتا ہے۔ میں چائے کو چائے کے لیے پیتا ہوں، لوگ شکر اور دودھ کے لیے پیتے ہیں۔ میرے لیے وہ مقاصد میں داخل ہوئی، ان کے لیے رسائل میں۔ غور فرمائیے میرا رُخ کس طرف ہے

اور زمانہ کدھر جارہا ہے ؟

تو و طوبیٰ و ما و قامت یار
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

چائے چین کی پیداوار ہے اور چینیوں کی تصریح کے مطابق پندرہ سو برس سے استعمال کی جا رہی ہے لیکن وہاں کبھی کسی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں گزری کہ اس جوہرِ لطیف کو دودھ کی کثافت سے آلودہ کیا جا سکتا ہے۔ جن جن ملکوں میں چین سے براہِ راست گئی، مثلاً روس، ترکستان، ایران، وہاں بھی کسی کو یہ خیال نہیں گزرا، مگر سترھویں صدی میں جب انگریز اس سے آشنا ہوئے تو نہیں معلوم ان لوگوں کو کیا سوجھی، انھوں نے دودھ ملانے کی بدعت ایجاد کی اور چونکہ ہندوستان میں چائے کا رواج انھی کے ذریعے ہوا اس لیے یہ بدعتِ سیئہ یہاں بھی پھیل گئی۔ رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ لوگ چائے میں دودھ ڈالنے کی جگہ دودھ میں چائے ڈالنے لگے "بنیادِ ظلم در جہاں اندک بود، ہر کہ آمد بران مزید کرد" اب انگریز تو یہ کہہ کر الگ ہو گئے کہ زیادہ دودھ نہیں ڈالنا چاہیے لیکن ان کے تخمِ فساد نے جو برگ و بار پھیلا دیئے ہیں، انھیں کون چھانٹ سکتا ہے ؟ لوگ چائے کی جگہ ایک طرح کا سیال حلوا بناتے ہیں، کھانے کی جگہ پیتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے چائے پی لی۔ ان نادانوں سے کون کہے کہ :

ہائے کمبخت، تو نے پی ہی نہیں

پھر ایک بنیادی سوال چائے کی نوعیت کا بھی ہے اور اس بارے میں بھی ایک عجیب عالمگیر غلط فہمی پھیل گئی ہے۔ کس کس سے جھگڑیئے اور کس کس کو سمجھائیے :

روز و شب عربدہ با خلقِ خدا نتواں کرد

عام طور پر یہ لوگ خاص طرح کی پتی کو، جو ہندوستان اور سیلون میں پیدا ہوتی ہے،

سمجھتے ہیں، چائے ہے اور پھر اُس کی مختلف قسمیں کرکے ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتے ہیں اور اس ترجیح کے بارے میں باہم ردّوکد کرتے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے سیلون کی چائے بہتر ہے، دوسرا کہتا ہے دارجلنگ کی بہتر ہے۔ گویا یہ بھی وہ معاملہ ہُوا کہ :

در رہِ عشق نہ شُد کس بہ یقیں محرمِ راز
ہر کسے بر حسبِ فہم گمانے دارد

حالانکہ ان فریب خوردگانِ رنگ و بُو کو کون سمجھائے کہ جس چیز پر جھگڑ رہے ہیں، وہ سرے سے چائے ہے ہی نہیں :

چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند!

دراصل یہ عالمگیر غلطی اس طرح پیدا ہُوئی کہ انیسویں صدی کے اوائل میں جب چائے کی مانگ ہر طرف بڑھ رہی تھی، ہندوستان کے بعض انگریز کاشتکاروں کو خیال ہُوا کہ سیلون اور ہندوستان کے بلند اور مرطوب مقامات میں چائے کی کاشت کا تجربہ کریں اُنھوں نے چین سے چائے کے پودے منگوائے اور یہاں کاشت شروع کی۔ یہاں کی مٹی نے چائے پیدا کرنے سے تو انکار کر دیا مگر تقریباً اسی شکل و صورت کی ایک دوسری چیز پیدا کر دی۔ اِن زیاں کاروں نے اسی کا نام چائے رکھ دیا اور اس غرض سے کہ اصلی چائے سے ممتاز رہے، اسے کالی چائے کے نام سے پکارنے لگے :

غلطی ہائے مضامیں مت پُوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

دُنیا، جو اس جستجو میں تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہ جنسِ کمیاب ارزاں ہو، بے سمجھے بُوجھے اسی پر ٹوٹ پڑی، اور پھر تو گویا پوری نوعِ انسانی نے اس فریب خوردگی پر اجماع کر لیا۔ اب آپ ہزار سر پیٹیے، سنتا کون ہے :

اُسی کی سی کہنے لگے اہلِ شہر   کہیں پرسشِ دادخواہاں نہیں

معاملے کا سب سے زیادہ درد انگیز پہلو یہ ہے کہ خود چین کے بعض ساحلی باشندے بھی اس عالمگیر فریب کی لپیٹ میں آ گئے اور اسی پتی کو چائے سمجھ کر پینے لگے۔ یہ وہی بات ہوئی کہ بدخشانیوں نے لال پتھر کو لعل سمجھا اور کشمیریوں نے رنگی ہوئی گھاس کو زعفران سمجھ کر اپنی دستاریں رنگنی شروع کر دیں:

چو کفر از کعبہ برخیزد، کجا ماند مسلمانی!

نوعِ انسانی کی اکثریت کے فیصلوں کا ہمیشہ ایسا ہی حال رہا ہے جمعیتِ بشری کی یہ فطرت ہے کہ ہمیشہ عقلمند آدمی اِکّا دُکّا ہوگا۔ بھیڑ بے وقوفوں ہی کی رہے گی ماننے پر آئیں گے تو گائے کو خدا مان لیں گے۔ انکار پر آئیں گے تو مسیح کو سُولی پہ چڑھا دیں گے۔ حکیم سنائیؔ زندگی بھر ماتم کرتا رہا:

گاؤ را دارند باور در خدائی عامیاں

نوح را باور نہ دارند از پئے پیغمبری!

اسی لیے عرفاء طریق کو کہنا پڑا:

انکارِ خلق باش، تصدیق اینست

مشغول بہ خویش باش توفیق اینست

تبعیتِ خلق از حقت باطل کرد

ترکِ تقلید گیر، تحقیق اینست

یہ تو اصول کی بحث ہوئی۔ اب فروع میں آئیے۔ یہاں بھی کوئی گوشہ نہیں جہاں زمین ہموار ملے۔ سب سے اہم مسئلہ شکر کا ہے۔ مقدار کے لحاظ سے بھی اور نوعیت کے لحاظ سے بھی:

دردا کہ طبیب صبر می فرماید

ویں نفسِ حریص را شکر می باید

جہاں تک مقدار کا تعلق ہے اسے میری محرومی سمجھئے یا تلخ کامی کہ مجھے

مٹھاس کے ذوق کا بہت کم حصّہ ملا ہے۔ نہ صرف چائے میں بلکہ کسی چیز میں بھی زیادہ مٹھاس گوارا نہیں کر سکتا۔ دُنیا کے لیے جو چیز مٹھاس ہوئی وہ میرے لیے بدمزگی ہو گئی۔ کھاتا ہوں تو مُنہ کا مزہ بگڑ جاتا ہے۔ لوگوں کو جو لذت مٹھاس میں ملتی ہے مجھے نمک میں ملتی ہے۔ کھانے میں نمک پڑا ہو مگر میں اوپر سے اور چھڑک دوں گا۔ میں صباحت کا نہیں، ملاحت کا قتیل ہوں!

و للناس فی ما یعشقون مذاہب!

گویا کہہ سکتا ہوں کہ "اخی یوسف اصبح و انا املح منہ" کے مقام کا لذت شناس ہوں:

کز نکتہ دانِ عشقی، خوش بشنو ایں حکایت!

اس حدیث کے تذکرے سے یارانِ قصص و مواعظ کی وہ خانہ ساز روایت یاد دلا دی کہ "الایمان حلو و المومن یحب الحلوی[1]" لیکن اگر مدارجِ ایمانی کے حصول اور مراتبِ ایقانی کی تکمیل کا یہی معیار ٹھہرا، تو نہیں معلوم، ان تہی دستانِ نقدِ حلاوت کا کیا حشر ہونے والا ہے جن کی محبتِ حلاوت کی ساری پونجی چائے کی چند پیالیوں سے زیادہ نہیں ہوئی اور ان میں بھی کم شکر پڑی ہوئی ہو اور پھر اس کم شکر پر بھی تاسف کہ نہ ہوتی تو بہتر تھا۔ ہا۔ مولانا شبلی مرحوم کا بہترین شعر یاد آگیا:

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبے ست سالک را
خجل ہستم ز کفرِ خود کہ دارد بوئے ایماں ہم!

بچوں کا مٹھاس کا شوق ضرب المثل ہے مگر آپ کو سُن کر تعجب ہوگا کہ میں بچپنے میں مٹھاس کا شائق نہ تھا۔ میرے ساتھی مجھے چھیڑا کرتے تھے کہ تجھے نیم کی پتیاں چبانی چاہئیں اور ایک مرتبہ پسی ہوئی پتیاں کھلا بھی دی تھیں:

اسی باعث سے دایہ طفل کو افیون دیتی ہے
کہ تا ہو جائے لذت آشنا تلخیِ دوراں سے!

---

[1] یعنی ایمان مٹھاس ہے اور جو مومن ہے وہ مٹھاس کو محبوب رکھے گا۔

میں نے یہ دیکھ کر کہ مٹھاس کا شائق نہ ہونا نقص سمجھا جاتا ہے، کئی بار بہ تکلف کوشش کی کہ اپنے آپ کو شائق بناؤں مگر ہر مرتبہ ناکام رہا۔ گویا وہی چندر بھان والی بات ہوئی کہ:

مرا دلے ست بہ کفر آشنا کہ چندیں بار
بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

بہرحال یہ تو شکر کی مقدار کا مسئلہ تھا مگر معاملہ اس پر ختم کہاں ہوتا ہے؟

کوتہ نظر ببیں کہ سخن مختصر گرفت!

ایک دقیق سوال اُس کی نوعیّت کا بھی ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ جو شکر ہر چیز میں ڈالی جا سکتی ہے۔ وہی چائے میں بھی ڈالنی چاہیئے۔ اس کے لیے کسی خاص شکر کا اہتمام ضروری نہیں۔ چنانچہ باریک دانوں کی دوبارہ شکر، جو پہلے جاوا اور موریشس سے آتی تھی اور اب ہندوستان میں بننے لگی ہے، چائے کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے۔ حالانکہ چائے کا معاملہ دوسری چیزوں سے بالکل مختلف واقع ہوا ہے۔ اسے حلوے پر قیاس نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کا مزاج اس قدر لطیف اور بے میل ہے کہ کوئی چیز بھی، جو خود اسی کی طرح صاف اور لطیف نہ ہو گی، فوراً اسے مکدّر کر دے گی۔ گویا چائے کا معاملہ بھی وہی ہوا کہ:

نسیمِ صبح جو چھو جائے، رنگ ہو میلا

یہ دوبارہ شکر اگرچہ صاف کیے ہوئے رس سے بنتی ہے مگر پوری طرح صاف نہیں ہوتی۔ اس غرض سے کہ مقدار کم نہ ہو جائے۔ صفائی کے آخری مراتب چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جونہی اسے چائے میں ڈالیے، معاً اس کا ذائقہ متاثر اور لطافت آلودہ ہو جائے گی۔ اگرچہ یہ اثر ہر حال میں پڑتا ہے تاہم دودھ کے ساتھ پیجیئے تو چنداں محسوس نہیں ہوتا کیونکہ دودھ کے ذائقے کی گرانی چائے کے ذائقے پر غالب آجاتی ہے اور کام چل جاتا ہے، لیکن سادہ چائے پیجیئے تو فوراً بول اُٹھے گی۔ اس کے لیئے ایسی

شکر چاہیئے جو بلور کی طرح بے میل اور برف کی طرح شفاف ہو۔ ایسی شکر ڈلیوں کی شکل میں بھی آتی ہے اور بڑے دانوں کی شکل میں بھی۔ میں ہمیشہ بڑے دانوں کی شفاف شکر کام میں لاتا ہوں اور اس سے وہ کام لیتا ہوں جو مرزا غالبؔ گلاب سے لیا کرتے تھے:

آسودہ باد خاطرِ غالبؔ کہ خوئے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را!

میرے لیے شکر کی نوعیت کا یہ فرق ویسا ہی محسوس اور نمایاں ہوا جیسے شربت پینے والوں کے لیے قند اور گڑ کا فرق ہوا، لیکن یہ عجیب مصیبت ہے کہ دوسروں کو کسی طرح بھی محسوس نہیں کرا سکتا۔ جس کسی سے کہا، اُس نے یا تو اسے مبالغے پر محمول کیا۔ یا میرا وہم و تخیل سمجھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو میرے ہی منہ کا مزہ بگڑ گیا ہے، یا دُنیا میں کسی کے منہ کا مزہ درست نہیں۔ یہ نہ سمجھیے کہ بحث چائے کے تکلفات میں نہیں ہے، اُس کی لطافت و کیفیت کے ذوق و احساس میں ہے۔ بہت سے لوگ چائے کے لئے صاف ڈلیاں اور موٹی شکر استعمال کرتے ہیں اور یورپ میں تو زیادہ تر ڈلیوں کا رواج ہے مگر یہ اس لئے نہیں کیا جاتا کہ چائے کے ذائقے کے لیے یہ کوئی ضروری چیز ہوئی بلکہ محض تکلف کے خیال سے کیونکہ اس طرح کی شکر نسبتاً قیمتی ہوتی ہے۔ آپ انھیں معمولی شکر ڈال دیجئے، بے خلل و غش پی جائیں گے اور ذائقے میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کریں گے۔

شکر کے معاملے میں اگر کسی گروہ کو حقیقت آشنا پایا تو وہ ایرانی ہیں۔ اگرچہ چائے کی نوعیت کے بارے میں چنداں ذی حس نہیں مگر یہ نکتہ انھوں نے پالیا ہے عراق اور ایران میں عام طور پر یہ بات نظر آئی تھی کہ چائے کے لیے قند کی جستجو میں رہتے تھے اور اسے معمولی شکر پر ترجیح دیتے تھے کیونکہ قند صاف ہوتی ہے اور وہی کام دیتی ہے جو موٹے دانوں کی شکر سے لیا جاتا ہے۔ کہہ نہیں سکتا کہ اب وہاں کیا حال ہے۔

اور اگر "تعرف الاشیاء باضدادہا" کی بنا پر پوچھیے کہ چائے کے معاملے میں

سب سے زیادہ خیرہ مذاق گروہ کون ہُوا؟ تو میں بلا تامّل انگریزوں کا نام لوں گا۔ یہ عجیب بات ہے کہ یورپ اور امریکہ میں چائے انگلستان کی راہ سے گئی اور دُنیا میں اس کا عالمگیر رواج بھی بہت کچھ انگریزوں ہی کا منّت پذیر ہے۔ تاہم یہ نزدیکان بے بصر حقیقتِ حال سے اتنے دُور جا پڑے کہ چائے کی حقیقی لطافت و کیفیت کا ذوق اُنھیں چُھو بھی نہیں گیا۔ جب اس راہ کے اماموں کا یہ حال ہے تو ان کے مقلدوں کا جو حال ہوگا، معلوم ہے:

آشنا را حال این ست، وائے بر بیگانہ!

اُنھوں نے چین سے چائے پینا تو سیکھ لیا مگر اور کچھ سیکھ نہ سکے۔ اوّل تو ہندوستان اور سیلون کی سیاہ پتی ان کے ذوقِ چائے نوشی کا منتہائے کمال ہُوا۔ پھر قیامت یہ ہے کہ اس میں بھی ٹھنڈا دودھ ڈال کر اُسے یک قلم گندہ کر دیں گے۔ مزید ستم ظریفی دیکھیے کہ اس گندے مشروب کی معیار سنجیوں کے لیے ماہرینِ فن کی ایک پوری فوج موجود رہتی ہے۔ کوئی ان زیاں کاروں سے پوچھے کہ اگر چائے نوشی سے مقصود انھی پتیوں کو گرم پانی میں ڈال کر پی لینا ہے تو اس کے لیے ماہرینِ فن کی دقیقہ سنجیوں کی کیا ضرورت ہے؟ جو پتی بھی پانی کو سیاہی مائل کر دے اور ایک تیز بُو پیدا ہو جائے، چائے ہے اور اس میں ٹھنڈے دودھ کا ایک چمچہ ڈال کر کافی مقدار میں گندگی پیدا کر دی جا سکتی ہے۔ چائے کا ایک ماہرِ فن بھی اس سے زیادہ کیا خاک بتلائے گا؟

ہیں یہی کہنے کو وہ بھی، اور کیا کہنے کو ہیں؟

اگرچہ فرانس اور برِ اعظم میں زیادہ تر رواج کافی کا ہُوا۔ تاہم اعلیٰ طبقے کے لوگ چائے کا بھی شوق رکھتے ہیں اور ان کا ذوق بہر حال انگریزوں کے بد رجہا بہتر ہے۔ وہ زیادہ تر چینی چائے پئیں گے اور اگر سیاہ چائے پئیں گے بھی تو اکثر حالتوں میں بغیر دودھ کے یا لیموں کی ایک قاش کے ساتھ جو چائے کی لطافت کو نقصان نہیں پہنچاتی بلکہ اور نکھار دیتی ہے۔ یہ لیموں کی ترکیب دراصل روس، ترکستان

اور ایران سے چلی۔ سمرقند اور بخارا میں عام دستور ہے کہ چائے کا تیسرا فنجان لیمونی ہوگا بعض یارانی بھی دور کا خاتمہ لیمونی ہی پر کرتے ہیں۔ یہ کمبخت دودھ کی آفت تو صرف انگریزوں کی لائی ہوئی ہے :

سر ایں فتنہ ز جائیست کہ من می دانم !

اب اِدھر اک اور نئی مصیبت پیش آگئی ہے۔ اب تک تو صرف شکر کی عام قسم ہی کے استعمال کا رونا تھا۔ لیکن اب معاملہ صاف صاف گڑ تک پہنچنے والا ہے۔ ہندوستان قدیم میں جب لوگوں نے گڑ کی منزل سے قدم آگے بڑھانا چاہا تھا تو یہ کیا تھا کہ گڑ کو کسی قدر صاف کر کے لال شکر بنانے لگے تھے۔ یہ صفائی میں سفید شکر سے منزلوں دُور تھی مگر ناصاف گڑ سے ایک قدم آگے نکل آئی تھی۔ پھر جب سفید شکر عام طور پر بننے لگی تو اس کا استعمال زیادہ تر دیہاتوں میں محدود رہ گیا۔ لیکن اب پھر دنیا اپنی ترقی معکوس میں اسی طرف لوٹ رہی ہے جہاں سے سیکڑوں برس پہلے آگے بڑھی تھی۔ چنانچہ آج کل امریکہ میں اس لال شکر کی بڑی مانگ ہے۔ وہاں کے اہلِ ذوق کہتے ہیں، کافی بغیر اس شکر کے مزہ نہیں دیتی اور جیسا کہ قاعدہ مقررہ ہے اب ان کی تقلید میں یہاں کے اصحابِ ذوق بھی 'براؤن شوگر' کی صدائیں بلند کرنے لگے ہیں۔ میری یہ پیشین گوئی لکھ رکھیے کہ عنقریب یہ 'براؤن شوگر' کا ہلکا سا پردہ بھی اُٹھ جائے گا اور صاف صاف گڑ کی مانگ ہر طرف شروع ہو جائے گی۔ یارانِ ذوقِ جدید کہیں گے کہ گڑ کے ڈلے ڈالے بغیر نہ چائے مزہ دیتی ہے نہ کافی۔ فرمائیے، اب اس کے بعد کیا باقی رہ گیا ہے جس کا انتظار کیا جائے ؟

وائے در گر پسِ امروز بود فردائے !

شکر اور گڑ کی دُنیائیں اب درجہ ایک دوسرے سے مختلف واقع ہوئی ہیں کہ آدمی ایک کا ہو کر پھر دوسرے کے قابل نہیں رہ سکتا۔ میں نے دیکھا ہے کہ جن لوگوں

نے زندگی میں دو چار مرتبہ بھی گڑ کھا لیا، شکر کی لطافت کا احساس پھر ان میں باقی نہیں رہا۔ جواہر لال چونکہ مٹھاس کے بہت شائق ہیں۔ اس لیے گڑ کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ میں نے یہاں ہزار کوشش کی کہ شکر کی نوعیت کا یہ فرق، جو میرے لیے اس درجہ نمایاں ہے، انھیں بھی محسوس کراؤں لیکن نہ کرا سکا اور بالآخر تھک کے رہ گیا۔

بہرحال زمانے کی حقیقت فراموشیوں پہ کہاں تک ماتم کیا جائے :

کوتہ نتواں کرد کہ ایں قصّہ دراز ست

آئیے، آپ کو کچھ اپنا حال سناؤں، اصحابِ نظر کا قول ہے کہ حُسن اور فن کے معاملے میں حبُ الوطنی کے جذبے کو دخل نہیں دینا چاہیے :

متاعِ نیک، ہر دکاں کہ باشد

پر عمل کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں بھی چائے کے باب میں شاہدانِ ہند کا نہیں خوبانِ چین کا معتقد ہوں :

دوائے دردِ دل خود ازاں مفرح جوئے
کہ در صراحی چینی و شیشۂ حلبی ست!

میرے جغرافیے میں اگر چین کا ذکر کیا گیا ہے تو اس لیے نہیں کہ جنرل چنگ کائی شک اور میڈم چنگ وہاں سے آئے تھے بلکہ اس لیے کہ چائے وہیں سے آتی ہے :

مئے صافی ز فرنگ آید و شاہد ز تتار
ما نہ دانیم کہ بسطامے و بغدادے ہست

ایک مدت سے جس چینی چائے کا عادی ہوں وہ وہائٹ جیسمین White Jasmine کہلاتی ہے۔ یعنی 'یاسمنِ سفید' یا ٹھیٹ اُردو میں یوں کہیے کہ 'گوری چنبیلی':

کسیکہ محرمِ رازِ صبا ست مے داند   کہ باوجودِ خزاں بوئے یاسمن باقی ست!

اُس کی خوشبو جس قدر لطیف ہے اُتنا ہی کیف تند و تیز ہے۔ رنگت کی نسبت کیا کہوں؟ لوگوں نے آتشِ سیالی کی تعبیر سے کام لیا ہے:

مے میانِ شیشۂ ساقی نگر
آتشے گویا بہ آب آلودہ اند

لیکن آگ کا تخیل پھر ارضی ہے اور اس چائے کی علویت کچھ اور چاہتی ہے۔ میں سورج کی کرنوں کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یوں سمجھیے کہ جیسے کسی نے سورج کی کرنیں حل کر کے بلوریں فنجان میں گھول دی ہوں۔ ملا محمد مازندرانی صاحب بُت خانہ نے اگر یہ چائے پی ہوتی تو خانخاناں کی خانہ ساز شراب کی مدح میں ہرگز نہ کہتا:

نہ می ماند ایں بادہ اصلاً بہ آب
تو گوئی کہ حل کردہ اند آفتاب

لڑائی کی وجہ سے جہازوں کی آمد و رفت بند ہوئی تو اس کا اثر چائے پر بھی پڑا۔ میں کلکتہ کے جس چینی اسٹور سے منگوایا کرتا تھا، اُس کا ذخیرہ جواب دینے لگا تھا۔ پھر بھی چند ڈبے مل گئے تھے اور بعض چینی دوستوں نے بطور تحفہ کے بھی بھیج کر چارہ سازی کی تھی۔ جب کلکتہ سے نکلا تو ایک ڈبا ساتھ تھا۔ ایک گھر میں چھوڑ آیا تھا۔ بمبئی سے گرفتار کر کے یہاں لایا گیا تو سامان کے ساتھ وہ بھی آ گیا، اور پھر قبل اس کے ختم ہو، گھر والا ڈبا بھی پہنچ گیا۔ اس طرح یہاں اور چیزوں کی کتنی ہی کمی محسوس ہوئی لیکن چائے کی کمی محسوس نہیں ہوئی اور اگر چائے کی کمی محسوس نہیں ہوئی تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ کسی چیز کی کمی بھی محسوس نہیں ہوئی:

حافظ دگر چہ می طلبی از نعیمِ دہر؟
مے می خوری و طرۂ دلدار می کشی

اس کی فکر کبھی نہیں ہوئی کہ یہ آخری ڈبا چلے گا کب تک؟ کیونکہ خواجہ شیراز کی

موعظت ہمیشہ پیشِ نظر رہتی ہے :

تا ساغرت پُر ست بنوشان و نوش کُن !

یہاں ہمارے زندانیوں کے قافلے میں اس جنس کا شناسا کوئی نہیں ہے۔ اکثر حضرات دودھ اور دہی کے شائق ہیں اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ دودھ اور دہی کی دُنیا چائے کی دُنیا سے کتنی دُور واقع ہوئی ہے ؟ عمریں گزر جائیں پھر بھی یہ مسافت طے نہیں ہو سکتی۔ کہاں چائے کے ذوقِ لطیف کا شہرستانِ کیف و سرور، اور کہاں دودھ اور دہی کی شکم پُری کی نگری!

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق

رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں ؟

جواہر لال بلا شبہہ چائے کے عادی ہیں اور چائے پیتے بھی ہیں خواصِ یورپ کی ہم مشربی کے ذوق میں بغیر دودھ کی، لیکن جہاں تک چائے کی نوعیت کا تعلق ہے شاہراہِ عام سے باہر قدم نہیں نکال سکتے اور اپنی ہیچ و پوچ ہی کی رسموں پر قانع رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ان حضرات کو اس چائے کے پینے کی زحمت دینا نہ صرف بے سُود تھا بلکہ 'وضع الشی فی غیرِ محلہٖ' کے حکم میں داخل تھا :

مے بہ زاہد مکن عرضہ کہ ایں جوہرِ ناب

پیشِ ایں قوم بہ شورابۂ زمزم نہ رسد

ان حضرات میں صرف ایک صاحب ایسے نکلے جنھوں نے ایک مرتبہ میرے ساتھ سفر کرتے ہوئے یہ چائے پی تھی اور محسوس کیا تھا کہ اگرچہ بغیر دودھ کی ہے مگر اچھی ہے۔ یعنی بہتر چیز تو وہی دودھ والا گرم شربت ہُوا جو وہ روز پیا کرتے ہیں مگر یہ بھی چنداں بُری بات نہیں۔ زمانے کی عالمگیر خیرہ مذاقی دیکھتے ہوئے یہ ان کی صرف "اچھی ہے" کی داد بھی مجھے اتنی غنیمت معلوم ہوئی کہ کبھی کبھی انھیں بلا لیا کرتا تھا کہ آئیے ایک پیالی اس "اچھی ہے" کی بھی پی لیجیے :

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است!

ان کے لیے یہ صرف 'اچھی' ہوئی، یہاں چائے کا سارا معاملہ ہی ختم ہو جائے اگر یہ 'اچھی ہے' ختم ہو جائے۔ غالب کیا خوب کہہ گیا ہے:

زاہد از ما خوشۂ تاکے بہ چشم کم مبیں
ہیں، نہ می دانی کہ یک پیمانہ نقصاں کردہ ایم

مگر ایک ڈبا کب تک کام دے سکتا تھا؟ آخر ختم ہونے پر آیا۔ چیتہ خاں نے یہاں دریافت کرایا۔ پونا بھی لکھا۔ لیکن اس قسم کی چائے کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اب بمبئی اور کلکتہ لکھوایا ہے، دیکھیے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ ایک ہفتے سے وہی ہندوستانی سیاہ پتی پی رہا ہوں اور مستقبل کی امیدوں پہ جی رہا ہوں:

نہ کنی چارہ لب خشک مسلمانے را
اے بہ ترسا بچگاں کردہ مئے ناب سبیل!

آج کل چینی ہندوستان کے تمام شہروں میں پھیل گئے ہیں اور ہر جگہ چینی رسٹوران کھُل گئے ہیں۔ چونکہ احمد نگر انگریزی فوج کی بڑی چھاؤنی ہے اس لیے یہاں بھی ایک چینی رسٹوران کھُل گیا ہے۔ جیلر کو خیال ہوا کہ ان لوگوں کے پاس یہ چائے ضرور ہو گی۔ اُس نے خالی ڈبا بھیج کر دریافت کرایا۔ اُنھوں نے ڈبا دیکھتے ہی کہا کہ یہ چائے اب کہاں مل سکتی ہے؟ لیکن تمھیں یہ ڈبا کہاں سے ملا؟ اور اس چائے کی یہاں ضرورت کیا پیش آئی؟ کیا چین کا کوئی بڑا آدمی یہاں آرہا ہے؟ جو وارڈر بازار گیا تھا۔ اُس نے ہر چند باتیں بنائیں مگر ان کی تشفی نہیں ہوئی۔ دوسرے دن سارے شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ میڈم چنگ کائی شک قلعے کے قیدیوں سے ملنے آرہی ہے اور اس کے لیے چینی چائے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

چائے کے ڈبے کی تہ میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ پتیوں کا چورا بیٹھ جایا کرتا ہے اور اسے ڈبے کے ساتھ پھینک دیا کرتے ہیں۔ یہ آخری ڈبا ختم ہونے پر آیا تو تھوڑا سا چورا

اس کی تہ میں بھی جمع تھا۔ میں نے چھوڑ دیا کہ اسے کیا کام میں لاؤں لیکن چھتیہ خاں نے دیکھا تو کہا۔ آج کل لڑائی کی وجہ سے "ضائع مت کرو" کا نعرہ زبانوں پر ہے یہ چُورا بھی کیوں نہ کام میں لایا جائے؟ میں نے بھی سوچا کہ:

بہ دُرد و صاف ترا حکم نیست، دم درکش
کہ ہر چہ ساقیِ ما ریخت عینِ الطاف ست

چنانچہ یہ چُورا بھی کام میں لایا گیا اور اس کا ایک ایک ذرّہ دم دے کر پیتا رہا۔ جب فنجان میں چائے ڈالتا تھا تو ان ذرّوں کی زبانِ حال پکارتی تھی:

ہر چند کہ نیست رنگ و بویم
آخر نہ گیاہِ باغ اویم

اس تخیّل نے کہ ان ذرّوں کے ہاتھ سے کیف و سرور کا جام لے رہا ہوں۔ توسنِ فکر کی جولانیوں کے لیے تازیانے کا کام دیا اور اچانک ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیا۔ ہاں۔ مرزا بیدلؔ نے میری زبانی کہا تھا:

اگر دماغم درین شبستاں خمارِ شرم عدم نہ گیرد
زچینکِ ذرہ جام گیرم بہ آں شکوہے کہ جم نہ گیرد
درین قلمروِ کلفِ غبارم بہ ہیچ کس ہمسری ندارم
کمالِ میزانِ اعتبارم بس ست کز ذرّہ کم نہ گیرد

اس تجربے کے بعد بے اختیار خیال آیا کہ اگر ہم تشنہ کاموں کی قسمت میں اب سرجوشِ خُم کی کیفیتیں نہیں رہی ہیں تو کاش، اس تہِ شیشۂ ناصاف ہی کے چند گھونٹ مل جایا کریں۔ غالبؔ نے کیا خوب کہا ہے:

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
یوں ہے کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے!

شکر کے مسئلے نے بھی یہاں آتے ہی سر اُٹھایا تھا مگر مجھے فوراً اس کا حل مل گیا

اور اب اس طرف سے مطمئن ہوں۔ موٹے دانوں کی صاف شکر تھوڑی سی میرے سفری سامان میں تھی جو کچھ دنوں تک چلتی رہی۔ جب ختم ہوگئی تو میں نے خیال کیا کہ یہاں ضرور مل جائے گی۔ نہیں ملی تو ڈلیوں کے بکس تو ضرور مل جائیں گے۔ لیکن جب بازار میں دریافت کرایا تو معلوم ہوا، امن کے وقتوں میں بھی یہاں ان چیزوں کی مانگ نہ تھی اور اب کہ جنگ کی رکاوٹوں نے راہیں روک دی ہیں، ان کا سراغ کہاں مل سکتا ہے؟ مجبوراً مصری منگوائی اور چاہا کہ اُسے کٹوا کر شکر کی طرح کام میں لاؤں لیکن کوٹنے کے لیے ہاون کی ضرورت ہوئی۔ جیلر سے کہا۔ ایک ہاون اور ہاون دستہ منگوا دیا جائے۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ یہاں نہ ہاون ملتا ہے نہ دستہ۔ حیران رہ گیا کہ کیا اس بستی میں کبھی کسی کو اپنا سر پھوڑنے کی ضرورت پیش نہیں آتی؟ آخر لوگ زندگی کیسے بسر کرتے ہیں:

حدیثِ عشق چہ داند کسے کہ در ہمہ عُمر
بہ سر نہ کوفتہ باشد در سرائے را!

مجبوراً میں نے ایک دُوسری ترکیب نکالی۔ ایک صاف کپڑے میں مصری کی ڈلیاں رکھیں اور بہت سارا ردّی کاغذ اوپر تلے دھر دیا، پھر ایک پتھر اُٹھا کر ایک قیدی کے حوالے کیا جو یہاں کام کاج کے لیے لایا گیا ہے کہ اپنے سر کی جگہ اسے پیٹ:

دریں کہ کوہکن از ذوق داد جاں چہ سخن؟
ہمیں کہ تیشہ بہ سر دیر زد، سخن باقی ست!

لیکن یہ گرفتارِ آلات و وسائل بھی کچھ ایسا:

سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

کہ ایک چوٹ بھی قرینے کی نہ لگا سکا۔ مصری تو کٹنے سے رہی البتہ کاغذ کے پرزے پرزے اڑ گئے اور کپڑے نے بھی اُس کے رُوئے صبیح کا نقاب بننے سے انکار کر دیا:

چلی تھی برچھی کسی پہ، کسی کے آن لگی!

بہرحال کئی دنوں کے بعد خدا خدا کر کے ہاون کا چہرۂ زشت نظر آیا۔ "زشت" اس لیے کہتا ہوں کہ کبھی ایسا اُن گھڑ ظرف نظر سے نہیں گزرا تھا۔ آج کل ٹاٹا نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ یہ خبر دیتی ہے کہ ہزاروں برس پہلے وسط ہند کے ایک قبیلے نے ملک کو لوہے اور لوہارنی کی صنعت سے آشنا کیا تھا۔ عجب نہیں یہ ہاون بھی اسی قبیلے کی دست کاریوں کا بقیہ ہو اور اس انتظار میں گردشِ لیل و نہار کے دن گنتا رہا ہو کہ کب قلعہ احمد نگر کے زندانیوں کا قافلہ یہاں پہنچتا ہے اور کب ایسا ہوتا ہے کہ انھیں سر پھوڑنے کے لیے تیشہ کی جگہ ہاون دستہ کی ضرورت پیش آتی ہے:

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں!

خیر کچھ ہو، مصری کوٹنے کی راہ نکل آئی، لیکن اب کٹی ہوئی مصری موجود ہے تو وہ چیز موجود نہیں جس میں مصری ڈالی جائے:

اگر دستے کنم پیدا، نمی یابم گریباں را

دیکھیے صرف اتنی بات کہنی چاہتا تھا کہ چائے ختم ہو گئی، مگر بائیس صفحے تمام ہو چکے اور ابھی تک بات تمام نہیں ہوئی:

یک حرف بیش نیست سراسر حدیثِ شوق
ایں طرفہ ترکہ ہیچ بہ پایاں نمی رسد

ابوالکلام

مکتوب

قلعہ احمد نگر

۷ر جنوری ۱۹۴۳ء

صدیقِ مکرم!

وہی صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہے۔ سردی اپنے پورے عروج پر ہے۔ کمرے کا دروازہ اور کھڑکی کھلی چھوڑ دی ہے۔ ہوا کے برفانی جھونکے دمبدم آرہے ہیں۔ چائے دم دے کے ابھی ابھی رکھی ہے۔ منتظر بیٹھا ہوں کہ پانچ چھ منٹ گزر جائیں اور رنگ و کیف اپنے معیاری درجے پر آجائے تو دور شروع کردوں۔ دو مرتبہ نگاہ گھڑی کی طرف اٹھ چکی ہے مگر پانچ منٹ ہیں کہ کسی طرح ہونے پر نہیں آتے خواجہ شیراز کا ترانۂ صبح گاہی دل و دماغ میں گونج رہا ہے۔ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ گنگناؤں مگر ہمسایوں کی نیند میں خلل پڑنے کا اندیشہ لبوں کو کھلنے کی اجازت نہیں دیتا ناچار نوکِ قلم کے حوالے کرتا ہوں:

صبح ست و ژالہ می چکد از ابرِ بہمنی   برگِ صبوح سازو بزن جام یک منی
گر صبح دم خمار ترا درد سر دہد   پیشانیٔ خمار ہماں بہ کہ بشکنی
ساقی، بہوش باش کہ غم در کمینِ ماست   مطرب، نگاہدار ہمیں رہ کہ مے زنی

ساقی، بہ بے نیازیٔ یزداں کہ مے بیار
تا بشنوی ز صوتِ مغنی ’ہو الغنی‘

اس علاقے میں عام طور پر سردی بہت ہلکی ہوتی ہے۔ معلوم نہیں، کبھی اس طرف بھی آپ کا گزر ہوا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہوا ہے تو کس موسم میں؟ لیکن پونا تو آپ بارہا گئے ہوں گے۔ دسمبر ۱۹۱۵ء کا سفر مجھے بھی یاد ہے جب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے موقع پر آپ سے وہاں ملاقات ہوئی تھی۔ پونا یہاں سے صرف اسّی میل کی

مسافت پر واقع ہے اور دکن کا یہ تمام حصّہ ایک ہی سطح مرتفع ہے۔ اس لیے یہاں کی موسمی حالت کو پونا پر قیاس کر لیجئے۔ علاوہ بریں وقت کے زندانی کچھ پونا میں رکھے گئے ہیں کچھ یہاں، اس لیے ویسے بھی اہلِ قیاس کے نزدیک بقولِ عرفی دونوں کا حکم ایک ہی ہوا:

یکے ست نسبتِ شیرازی و بدخشانی

فیضی کو جب اکبر نے سفارت پر یہاں بھیجا تھا تو معاملات کی پیچیدگیوں نے اسے دو سال تک ہلنے نہیں دیا اور یہاں کے ہر موسم کے تجربے کا موقع ملا۔ اس نے اپنے مکاتیب میں احمد نگر کی آب و ہوا کے اعتدال کی بہت تعریف کی تھی۔ فیضی سے بہت پہلے کا یہ واقعہ ہے کہ ملک التجار شیرازی نے مولانا جامی کو دکن آنے کی دعوت دی تھی اور لکھا تھا کہ اس ملک میں بارہ مہینے ہوائے معتدل کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ خیر، بارہ مہینا کہنا تو صریح مبالغہ تھا مگر اس میں شک نہیں کہ یہاں گرمی کے دن بہت کم ہوتے ہیں اور یہاں کی برسات مالوہ کی برسات کی طرح بہت ہی پُرلطف ہوتی ہے۔ غالباً ۱۹۰۵ء کی بات ہے کہ بمبئی میں مرزا فرصت شیرازی صاحب آثار العجم سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ برسات کا موسم پونا میں بسر کر کے لوٹے تھے اور کہتے تھے، پونا کی ہوا کے اعتدال نے ہوائے شیراز کی یاد تازہ کر دی:

اے گل بتو خرسندم، تو بوئے کسی داری!

میرا ذاتی تجربہ معاملے کو یہاں تک نہیں لے جاتا لیکن بہرحال میں شیراز میں مسافر تھا اور مرزائے موصوف صاحبُ البیت تھے۔ وصاحب البیت ادری بما فیہا!

اورنگ زیب جب دکن آیا تھا تو یہاں کے برشگال کا اعتدال اس کی طبعِ خشک کو بھی تر کیے بغیر نہ رہا۔ آپ نے تاریخ خوافی خاں اور مآثر الامراء وغیرہ میں جابجا پڑھا ہو گا کہ برسات کا موسم اکثر احمد نگر یا پونا میں بسر کرتا تھا۔ پونا کا نام اس نے

"محی نگر" رکھا تھا مگر زبانوں پر نہیں چڑھا۔ اس کا انتقال احمد نگر ہی میں ہوا تھا۔

جہاں تک اس اعتدال کا تعلق گرمی اور برسات کے موسم سے ہے۔ اُس کے حسن و خوبی میں کلام نہیں، مگر مصیبت یہ ہے کہ یہاں کا سردی کا موسم بھی معتدل ہوتا ہے۔ حالانکہ سردی کا موسم ایسا موسم ہُوا کہ اس میں جس قدر بھی زیادتی ہو، موسم کا حُسن اور زندگی کا عیش ہے۔ اس کی کمی نقص و فتور کا حکم رکھتی ہے، اسے اعتدال کہہ کر سراہا نہیں جا سکتا:

درماندۂ صلاح و فسادیم، الحذر
زیں رسمہا کہ مردم عاقل نہادہ اند!

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اوائل عمر سے میری طبیعت کا اس بارے میں کچھ عجیب حال رہا ہے۔ گرمی کتنی ہی معتدل ہو، مگر مجھے بہت جلد پریشان کر دیتی ہے اور ہمیشہ سرد موسم کا خواستگار رہتا ہوں۔ موسم کی خنکی میرے لیے زندگی کا اصلی سرمایہ ہے، یہ پُونجی ختم ہُوئی اور گویا زندگی کی ساری کیفیتیں ختم ہو گئیں۔ چونکہ زندگی بہرحال بسر کرنی ہے اس لیے کوشش کرتا رہتا ہوں کہ ہر موسم سے سازگار رہوں لیکن طبیعت کے اصلی تقاضے پر غالب نہیں آسکتا۔ افسوس یہ ہے کہ ہندوستان کا موسمِ سرما اس درجہ تنک مایہ ہے کہ ابھی آیا نہیں کہ جانا شروع کر دیتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو جاتا ہے۔ میری طبع سراسیمہ کے لیے اس صورتِ حال میں صبر و شکیب کی ایک عجیب آزمائش پیدا ہو گئی ہے۔ جب تک وہ آتا نہیں، اس کے انتظار میں دن کاٹتا ہوں۔ جب آتا ہے تو اس کی آمد کی خوشیوں میں محو ہو جاتا ہوں، لیکن اس کا قیام اتنا مختصر ہوتا ہے کہ ابھی اس کی پذیرائیوں کے ساز و برگ سے فارغ نہیں ہُوا کہ اچانک ہجران و وداع کا ماتم سر پر آکھڑا ہوتا ہے:

ہمچو عیدے کہ در ایامِ بہار آمد و رفت

میں آپ کو بتلاؤں۔ میرے تخیل میں عیشِ زندگی کا سب سے بہتر تصور کیا ہو سکتا ہے؟ جاڑے کا موسم ہو اور جاڑا بھی قریب قریب درجہ انجماد کا۔ رات کا وقت ہو، آتشدان میں اونچے اونچے شعلے بھڑک رہے ہوں اور کمرے کی ساری مسندیں چھوڑ کر اس کے قریب بیٹھا ہوں اور پڑھنے یا لکھنے میں مشغول ہوں:

من ایں مقام بدنیا و عاقبت نہ دہم
اگرچہ در پیم افتند خلق انجمنے

معلوم نہیں بہشت کے موسم کا کیا حال ہوگا؟ وہاں کی نہروں کا ذکر بہت سننے میں آیا ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں گرمی کا موسم نہ رہتا ہو:

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف، سب درست
لیکن خدا کرے، وہ تری جلوہ گاہ ہو

عجیب معاملہ ہے۔ میں نے بارہا غور کیا کہ میرے تصور میں آتشدان کی موجودگی کو اتنی اہمیت کیوں مل گئی ہے؟ لیکن کچھ بتلا نہیں سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ سردی اور آتشدان کا چولی دامن کا رشتہ ہوا۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ میں سردی کے موسم کا نقشہ اپنے ذہن میں کھینچ ہی نہیں سکتا۔ اگر آتش دان نہ سلگ رہا ہو۔ پھر آتشدان بھی وہی پرانی روش کا ہونا چاہیے۔ جس میں لکڑیوں کے بڑے بڑے کندے جلائے جا سکیں۔ بجلی کے ہیٹر سے میری تسکین نہیں ہوتی بلکہ اسے دیکھ کر طبیعت چڑ سی جاتی ہے۔ ہاں گیس کے آتشدان کی ترکیب اتنی بے معنی محسوس نہیں ہوتی کیونکہ پتھر کے ٹکڑے رکھ کر انگاروں کے ڈھیر کی سی شکل بنا دیتے ہیں اور اس کے نیچے سے شعلے نکلتے رہتے ہیں۔ کم از کم شعلوں کی نوعیت باقی رہتی ہے۔ پھر بھی میں اسے ترجیح دینے کے لیے طیار نہیں۔ دراصل میں صرف گرمی ہی کے لیے آتشدان کا شیدائی نہیں ہوں مجھے شعلوں کا منظر چاہیئے۔ جب تک شعلے بھڑکتے نظر نہ آئیں، دل کی پیاس بجھتی نہیں۔ بے دردوں کو، جو دل کی جگہ برف کی سل سینے

میں چھپائے پھرتے ہیں، ان معاملات کی کیا خبر؟

سینۂ گرم نہ داری مطلب صحبتِ عشق
آتشے نیست چو در مجمرہ ات، عود مخر!

آپ سن کر ہنسیں گے۔ بارہا ایسا ہوا کہ اس خیال سے کہ سردی کا زیادہ سے زیادہ احساس پیدا کروں، جنوری کی راتوں میں آسمان کے نیچے بیٹھ کر صبح کی چائے پیتا رہا اور اپنے آپ کو اس دھوکے میں ڈالتا رہا کہ آج سردی خوب پڑ رہی ہے:

از یک حدیث لطف کہ آں ہم دروغ بود
امشب ز دفترِ گلہ صد باب شستہ ایم!

میری طبیعت کا بھی عجیب حال ہے۔ دوسروں سے پہلے خود اپنی حالت پر ہنستا ہوں۔ بچپنے میں چند مہینے چنسورہ میں بسر کیے تھے کیونکہ کلکتہ میں طاعون پھیل رہا تھا۔ صبح و شام گھنٹوں دریا میں تیرتا رہتا۔ پھر بھی جی سیر نہ ہوتا۔ اب بھی تیراکی کے لیے طبیعت ہمیشہ ترستی رہتی ہے۔ سبحان اللہ طبعِ بوقلموں کی نیرنگ آرائیاں دیکھیے! ایک طرف دریا سے ہم عنانی کا یہ ذوق و شوق دوسری طرف آگ کے شعلوں سے سیراب ہونے کی یہ تشنگی! شاید یہ اس لیے ہو کہ اقلیمِ زندگی کی سطح پہ پانی بہتا ہے تہ میں آگ بھڑکتی رہتی ہے اسی لیے نکتہ سرایانِ حقیقت کو کہنا پڑا کہ:

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در اقلیمِ عشق
روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست!

لوگ گرمیوں میں پہاڑ جاتے ہیں کہ وہاں کی گرمیوں کا موسم بسر کریں۔ میں نے کئی بار جاڑوں میں پہاڑوں کی راہ لی کہ وہاں جانے کا اصلی موسم یہی ہے۔ متنبیؔ بھی کیا بدذوق تھا کہ لبنان کے موسم کی قدر نہ کر سکا۔ میری زندگی کے چند بہترین ہفتے لبنان میں بسر ہوئے ہیں:

وجبال لبنان، وكيف بقطعها
وهي الشتاء وصيفهن شتاء

زندگی کا ایک جاڑا، جو موصل میں بسر ہوا تھا، مجھے نہیں بھولتا۔ موصل اگرچہ جغرافیہ کی لکیروں میں معتدل خطّے سے باہر نہیں ہے لیکن گرد و پیش نے اسے سردسیر حدود میں داخل کر دیا ہے، اور کبھی کبھی تو دیارِ بکر میں ایسی سخت برف پڑتی ہے کہ جب تک سڑکوں پر کھدائی نہ ہو لے، گھروں کے کواڑ نہیں کھل سکتے۔ جس سال میں گیا تھا غیر معمولی برف پڑی تھی۔ برف باری کے بعد جب آسمان کھلتا اور آرمینیا کے پہاڑوں کی ہوائیں چلنے لگتیں تو کیا عرض کروں، ٹھنڈک کا کیا عالم ہوتا؟ مجھے یاد ہے کہ کبھی کبھی سردی کی شدت کا یہ عالم ہوتا کہ مٹکوں کا ڈھکنا ہٹاتے تو پانی کی جگہ برف کی سل دکھائی دیتی لیکن میں پھر بھی سردی کی بے اعتدالیوں کا گلہ مند نہ تھا۔ جس شیخ کے گھر مہمان تھا اس کے بچے دن بھر برف کے گولوں سے کھیلتے رہتے اور کبھی کبھی کوئی چھوٹی سی گولی منہ میں ڈال لیتے۔ ستّی کبیرہ یعنی شیخ کی ماں کا لونڈیوں کو حکم تھا کہ میرا آتشدان چوبیس گھنٹے روشن رکھیں۔ خود بھی دن میں دو تین مرتبہ پکار کے مجھ سے پوچھ لیا کرتیں کہ مجمرہ کا کیا حال ہے؟ ایک لوہے کی کیتلی آتشدان کے محراب میں زنجیر سے لٹکی رہتی اور پانی ہر وقت جوش کھاتا رہتا۔ جس وقت چاہو قہوہ بنا کر گرم گرم پی لو۔ چونکہ دیر تک جوش کھائے ہوئے پانی میں چائے یا کافی بنانا ٹھیک نہیں۔ اس لیے میں اُسے اتار کر رکھ دیا کرتا لیکن لونڈی پھر لٹکا دیتی اور کہتی کہ ستّی کا حکم ایسا ہی ہے۔ چائے بنانے کا یہی طریقہ میں نے شمالی ایران کے عام گھروں میں بھی دیکھا۔ آتشدان کی آگ صرف کمرہ گرم کرنے ہی کے کام میں نہیں لائی جاتی بلکہ باورچی خانے کا بھی آدھا کام دیتی ہے۔ لوگ آتشدان کی آگ پر چائے کا پانی بھی گرم کر لیتے ہیں اور کھانا بھی پکا لیتے ہیں۔ اگر شمالی ایران کے لوگ ایسا نہ کریں تو اتنا ایندھن کہاں سے لائیں کہ کمروں کو بھی گرم رکھیں اور باورچی خانے کا چولھا بھی سلگتا رہے۔ وہاں کے مکانوں میں آتشدان اتنے کشادہ ہوتے ہیں، کہ کئی کئی دیگچیاں ان میں بیک وقت لٹک سکتی ہیں۔ آتشدان کی محراب میں تعمیر کے وقت حلقے ڈال دیے جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح کے جیسے ہمارے مکانوں

کی چھتوں میں پڑے ہوتے ہیں۔ انہی حلقوں میں زنجیر ڈال دی اور کیتلی یا دیگچی لٹکا دی۔ بعض شہروں کی سراؤں کے ہر کمرے میں آتشدان بنا ہے۔ جاڑوں میں سرائچی اسی آتشدان پر پلاؤ دم دے کر آپ کو کھلا دے گا اور کہے گا "بجائے گرم مگزارید و بخورید!"

اگست کے موسم میں جب ہم یہاں لائے گئے تو بارش کا موسم عروج پر تھا اور ہوا خوشگوار تھی۔ بالکل ایسی فضا رہتی تھی جیسی آپ نے جولائی اور اگست میں پونا کی دیکھی ہوگی۔ پانی یہاں عام طور پر بیس پچیس انچ سے زیادہ نہیں برستا لیکن پانی کی دو چار بوندیں بھی کافی خوشگواری پیدا کر دیتی ہیں۔ اُمس بہت کم ہوتی ہے۔ ہوا برابر چلتی رہتی ہے۔

ستمبر اور اکتوبر اسی عالم میں گزرا لیکن نومبر شروع ہوا تو طبیعت اس خیال سے افسردہ رہنے لگی کہ یہاں سردی کا موسم بہت ہلکا ہوتا ہے۔ چھاؤنی کا کمانڈنگ آفیسر جو پچھلا جاڑا یہاں بسر کر چکا ہے، کہتا تھا کہ پونا سے کچھ زیادہ سردی تھی لیکن وہ بھی بہ مشکل دس بارہ دن تک رہی ہوگی۔ عام طور پر دسمبر اور جنوری کا موسم یہاں ایسا رہتا ہے جیسا دہلی اور پنجاب میں جاڑے کے ابتدائی دنوں کا ہوتا ہے۔ ان خبروں نے طبیعت کو بالکل مایوس کر دیا تھا لیکن جونہی دسمبر شروع ہوا، موسم نے اچانک کروٹ بدلی۔ دو دن تک بادل چھایا رہا اور پھر جو مطلع کھلا تو کچھ نہ پوچھیے، موسم کی فیاضیوں کا کیا عالم ہوا! دہلی اور لاہور کے جاڑے کا مزہ یاد آ گیا۔ یہاں کے کمروں میں بھلا آتشدان کہاں! لیکن اگر ہوتا تو موسم ضرور ایسا ہو گیا تھا کہ میں لکڑیاں چُننی شروع کر دیتا۔ عنبر خاں جو ہر وقت خاکی تخفیفہ (یعنی شارٹ) پہنے رہتا تھا، یکایک گرم سوٹ پہن کر آنے لگا اور کہنے لگا کہ سردی سے میرے گھٹنوں میں درد ہونے لگا ہے۔ چھاؤنی سے خبر آئی کہ ایک انگریز سپاہی، جو رات کے پہرے پر تھا، صبح نمونیے میں مبتلا پایا گیا اور شام ہوتے ہوتے ختم ہو گیا۔ ہمارے قلعے کے زندانیوں کا یہ حال ہوا کہ دوپہر کے وقت بھی چادر جسم سے چمٹی رہنے لگی جیسے دیکھو، سردی کی بے جا ستائیوں کا شاکی ہے اور دھوپ میں بیٹھ کر تیل کی مالش

کرا رہا ہے کہ تمام جسم پھٹ کر چھلنی ہو گیا حتیٰ کہ جو صاحب دہلی اور یوپی کے رہنے والے ہیں اور نینی تال کے موسم کے عادی رہ چکے ہیں، وہ بھی یہاں کے جاڑے کے قائل ہو گئے:

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

ضلع کا کلکٹر اسی علاقے کا باشندہ ہے۔ وہ آیا تو کہنے لگا کہ سالہا سال گزر گئے، میں نے ایسا جاڑا اس علاقے میں نہیں دیکھا۔ پارہ چالیس درجے سے بھی نیچے اتر چکا ہے۔ یہاں سب حیران ہیں کہ اس سال کونسی نئی بات ہو گئی ہے کہ اچانک پنجاب کی سردی احمد نگر پہنچ گئی۔ میں نے جی میں کہا، ان بے خبروں کو کیا معلوم کہ ہم زندانیوں اور خراباتیوں کی دعائیں کیا اثر رکھتی ہیں۔ رب اشعث مدفوع بالابواب لو اقسم علی اللہ لابرّہ!

خدائے شیوۂ رحمت کہ در لباس بہار
بعذر خواہی زندانِ بادہ نوش آمد!

یہاں کے لوگ تو سردی کی سختیوں کی شکایت کر رہے ہیں اور میرے دلِ آرزو مند سے اب بھی صدائے ہل من مزید اٹھ رہی ہے۔ کلکتہ سے گرم کپڑے آئے پڑے ہیں۔ میں نے ابھی تک انھیں چھوا بھی نہیں۔ اس ڈر سے کہ اگر گرم کپڑے پہنوں گا تو سردی کا احساس کم ہو جائے گا اور تخیل کو جولانیوں کا موقع نہیں ملے گا، ابھی تک گرمیوں ہی کے لباس میں وقت نکال رہا ہوں البتہ صبح اٹھتا ہوں تو اونی چادر دوہری کر کے کاندھوں پر ڈال لیتا ہوں۔ میرا اور سردی کے موسم کا معاملہ تو وہ ہو گیا جو نظیری نیشاپوری کو پیش آیا تھا:

او در وداعِ دمن بجزع، کز منے و بہار
رطلے سہ چار ماندہ و روزے سہ چار خوش!

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ خیال ہوا، تمہید ہی میں گیارہ صفحے سیاہ ہو گئے اور ابھی تک حرفِ مدعا زبانِ قلم پر نہیں آیا۔ تازہ ترین واقعہ یہ ہے کہ ایک ماہ کی محرومی

و انتظار کے بعد پرسوں چیتہ خاں نے مژدۂ کامرانی سنایا کہ بمبئی کے آرمی اینڈ نیوی اسٹور نے وہایٹ جیسمین چائے کہیں سے ڈھونڈ نکالی ہے، اور ایک پونڈ کا پارسل وی پی کر دیا ہے۔ چنانچہ کل پارسل پہنچا۔ چیتہ خاں نے اس کی قیمت کا گلہ کرنا شروع کر دیا کہ محض ایک پونڈ چائے کے لیئے اتنی قیمت دینی پڑی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مجھے اس کی ارزانی نے حیران کر دیا ہے۔ اس نایابی کے زمانے میں اگر اسٹور اس سے دگنی رقم کا بھی طلبگار ہوتا جب بھی یہ جنس گرانمایہ ارزاں تھی،

اے کہ می گوئی "چرا جامے بجانے می خری؟"
ایں سخن با ساقی ما گو کہ ارزاں کردہ است

حسنِ اتفاق دیکھیے کہ ادھر یہ پارسل پہنچا اُدھر بمبئی سے بعض دوستوں نے بھی چند ڈبے چینی دوستوں سے لے کر بھجوا دیئے۔ اب گرفتاری کا زمانہ جتنا بھی طول کھینچے، چائے کی کمی کا اندیشہ باقی نہیں رہا۔

بہرحال جو بات کہنی چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس ایک واقعے نے صبح کے معاملے کی پوری فضا بدل دی اور جوئے طبع افسردہ کا آب رفتہ پھر واپس آگیا۔ اب پھر وہی صبح کی مجلسِ طرب آراستہ ہے، وہی طبعِ سیہ مست کی عالم فراموشیاں ہیں اور وہی فکرِ درماندۂ کار کی آسماں پیمائیاں :

گوہرِ مخزنِ اسرار ہماں است کہ بود
حقۂ مہر بداں مہر و نشاں است کہ بود
حافظا باز نما قصۂ خونابۂ چشم
کہ دریں چشمہ ہماں آب روانست کہ بود

ابوالکلام

مکتوب

قلعۂ احمد نگر

۹ جنوری سنہ ۱۹۴۳ء

صدیقِ مکرم

انانیتی ادبیات *Egotistic Literature* کی نسبت
زمانۂ حال کے بعض نقادوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ وہ یا تو بہت دلپذیر ہوں گی یا بہت زیادہ ناگوار۔ کسی درمیانی درجے کی یہاں گنجائش نہیں۔ "انانیتی ادبیات" سے مقصود تمام اس طرح کی خامہ فرسائیاں ہیں جن میں ایک مصنف کا ایغو (ego) یعنی "میں" نمایاں طور پر سر اُٹھاتا ہے مثلاً خود نوشتہ سوانح عمریاں، ذاتی واردات و تاثرات، مشاہدات و تجارب، شخصی اسلوبِ نظر و فکر۔ میں "نمایاں طور" کی قید اس لیے لگائی کہ اگر نہ لگائی جائے تو دائرہ بہت وسیع ہو جائے گا کیونکہ غیر نمایاں طور پر تو ہر طرح کی مصنفات کی انانیت اُبھر سکتی ہے اور اُبھرتی رہتی ہے۔ اگر اس اعتبار سے صورتِ حال پر نظر ڈالیے تو ہماری درماندگیوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ ہم اپنے ذہنی آثار کو ہر چیز سے بچا لے جا سکتے ہیں مگر خود اپنے آپ سے بچا نہیں سکتے۔ ہم کتنا ہی ضمیرِ غائب اور ضمیرِ مخاطب کے پردوں میں چھپ کر چلیں لیکن ضمیرِ متکلم کی پرچھائیں پڑتی ہی رہے گی۔ ہم جہاں جاتے ہیں، ہمارا سایہ ہمارے ساتھ جاتا ہے۔ ہماری کتنی ہی خود فراموشیاں ہیں جو دراصل ہماری خود پرستیوں ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک نکتہ شناسِ حقیقت کو کہنا پڑا تھا:

فقلت لها، ما اذنبتُ؟ قالت مجیبۃ

"وجودک ذنبٌ لا یقاس بہ ذنبٌ!"

کل ایک زیرِ تسوید کتاب کا ایک خاص مقام لکھ رہا تھا کہ مبحث کی مناسبت سے قول مندرجۂ صدر ذہن میں تازہ ہو گیا اور اس وقت حسبِ معمول صبح کو لکھنے بیٹھا تو بے اختیار

سامنے آ کھڑا ہوا۔ آیئے، آج تھوڑی دیر کے لیے رُک کر اس معاملے پر غور کرلیں:

ایک ادیب، ایک شاعر، ایک مصوّر، ایک اہلِ قلم کی اُنانیت Egotism کیا ہے؟ ابھی نہ تو فلسفۂ اخلاق کے مذہبِ انا Egoism کا رُخ کیجیے نہ دخودی اُمن Lone Limes مصطلحۂ تصوّف میں جایئے۔ صرف ایک عام تحلیلی زاویۂ نگاہ سے معاملے کو دیکھیے، آپ کو صاف دکھائی دے گا کہ یہ انانیت دراصل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اُس کی فکری انفرادیت کا ایک قدرتی سرجوش ہے جسے وہ دبا نہیں سکتا۔ اگر دبانا چاہتا ہے تو اور زیادہ اُبھرنے لگتی ہے اور اپنی ہستی کا اثبات کرتی ہے۔ ابوالعلا معرّی نے جب اپنا مشہور لامیّہ کہا تھا:

الا فی سبیل المجد ما انا فاعل
عفاف و اقدام و حزم و نائل

یا جب ابو فراس حمدانی نے اپنا لافانی رائیّہ کہا:

اراک عصی الدمع شیمتک الصبر
اما للھوی نھی علیک ولا امر

یا جب ابن سناء الملک نے اپنے زمانے کو مخاطب کیا تھا:

وانک عبدی یا زمان، واننی
علی الرغم منی ان اری لک سیّدا
وما انا راض اننی واطی الثری
ولی ھمۃ، لا ترتضی الافق مقعدا!

یا جب فردوسی کے قلم سے نکلا تھا:

بسے رنج بُردم دریں سال سی
عجم زندہ کردم بدیں پارسی

یا مثلاً جب فیضی نے نل دمن نظم کرتے ہوئے یہ اشعار کہے تھے:

امروز نہ شاعرم، حکیمم — دانندۂ حادث و قدیمم

ہر موئے ز من تمام گوش ست — خاموشی من بصد خروش ست

ایں بادہ کہ جوشد از ایاغم — خونے ست چکیدہ از دماغم

صد دیدہ بہ ورطۂ دل افتاد — کیں موجِ گہر بساحل افتاد

بگداختہ آبگینۂ دل — آئینہ دہم بدستِ محفل

آنم کہ بسحر کاری ژرف — از شعلہ تراش کردہ ام حرف

بانگِ قلم دریں شبِ تار — بس معنیِ خفتہ کردہ بیدار

می ریخت ز سحر کاری ژرف — از صبح ستارہ وز من حرف

ہر نغمہ کہ بستہ ام بریں تار — ناقوس نہفتہ ام بہ زنار

ایں گل کہ بہ بوستاں نتاری ست
از من بہ بہار یادگاری ست!

یا جب ہمارے میر انیس نے کہا تھا:

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

تو یہ محض شاعرانہ تعلّیاں نہ تھیں، یہ ان کی پُر جوش انفرادیت تھی جو لبِ اختیار پہ چیخ رہی تھی۔ لیکن ساتھ ہی ہم دیکھتے ہیں، انانیت کا یہ شعور کچھ اس نوعیت کا واقع ہوا ہے کہ ہر انفرادی انانیت اپنے اندرونی آئینے میں جو عکس ڈالتی ہے، بیرونی آئینوں میں اس سے بالکل اُلٹا عکس پڑنے لگتا ہے، اندر کے آئینے میں ایک بڑا وجود دکھائی دیتا ہے باہر کے تمام آئینوں میں ایک چھوٹی سے چھوٹی شکل اُبھرنے لگتی ہے۔

خودی آئینہ دارد کہ محروم ست اظہارش

یہی صورتِ حال ہے جہاں سے ہر مصنف کی، جو خود اپنی نسبت کچھ کہنا چاہتا ہے ساری مشکلیں اُبھرنی شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ جبکہ خود اپنے عکس کو، جو اُس کے اندرونی آئینے

میں پڑ رہا ہے، جھٹلا نہیں سکتا تو اچانک کیا دیکھتا ہے کہ باہر کے تمام آئینے اُسے جھٹلا رہے ہیں۔ جو "میں" خود اس کے لیے بے حد اہمیت رکھتی ہے، وہی دوسروں کی نگاہوں میں یکسر غیر اہم ہو رہی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسی حالت میں محسوس کرنے لگتا ہے، جیسے ایک مصوّر تصویر کھینچنے کے لیے مُو قلم اٹھائے مگر اُسے یقین ہو کہ میں کتنی ہی مصوّرانہ قوّت کام میں لاؤں، میری نگاہ کے سوا اور کوئی نگاہ اس مرقع کی دلآویزی نہیں دیکھ سکے گی:

آئینہ نقش بندِ طلسمِ خیال نیست
تصویرِ خود بلوحِ دگر می کشیم ما!

اس مشکل سے صرف خال خال مصنف ہی عہدہ برآ ہو سکتے تھے اور ہوئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی 'انانیت' کو بغیر کسی نمائشی وضع میں سجائے، دوسروں کے سامنے لے آنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ دُنیا کے سامنے اُن کی 'انانیت' آئی مگر اس طرح آئی جیسے ایک بے تکلف آدمی بغیر سج دھج بنائے سامنے آ کھڑا ہو۔ یہ بات کہ ایک آدمی بغیر کسی بناوٹ کے اپنی واقعی صورت میں سامنے آ گیا، خود حقیقت کی ایک خاص دلکشی رکھتی ہے اور اس لیئے دُنیا کی نگاہوں کو بے اختیار اپنی طرف کھینچ لیتی ہے جو خاص خاص ادیب ایسا کر سکے ان کی 'میں'، خود ان کے لیئے کتنی ہی بڑی اور دوسروں کے لیے کتنی ہی چھوٹی واقع ہوئی ہو، لیکن دُنیا اس کی دلپذیری سے انکار نہ کر سکی۔ دُنیا کو ان کی انانیت کی مقدار ناپنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ وہ اس کی بے تکلفانہ، نغیت دیکھ کر بے خود ہو گئی۔

ایک آدمی جب اپنی تصویر اتروانی چاہتا ہے تو خود اُسے اُس کا شعور ہو یا نہ ہو لیکن اس خواہش کی تہ میں اس کی انانیت کی ایک دھیمی آواز ضرور بولنے لگتی ہے تصویر اُتروانے کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں۔ ایک حالت وہ ہے جسے مصوّرانہ وضع Pose سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی تصویر اتروانے کے لیے ایک خاص طرح کا انداز بہ تکلف اختیار کر لینا۔ ایک ماہرِ فن مصوّر جانتا ہے کہ کس چہرے اور جسم کی مصوّرانہ وضع کیسی ہونی چاہیئے؟ وہ جب تک نشست و وضع کی نوک پلک درست نہیں کرے گا، تصویر نہیں اتارے گا۔ سو

ہیں ننانوے آدمیوں کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ نشست اور ڈھنگ سجا کے تصویر اُتروائیں لیکن فرض کرو، ایک آدمی بغیر کسی طیاری اور مصنوعی انداز کے آلۂ انعکاس کے سامنے آگیا اور اسی عالم میں اُس کی تصویر اُتر آئی تو ایسی تصویر کس نگاہ سے دیکھی جائے گی؟ ایسی تصویر محض اس لیے کہ بے ساختگی اور واقعیت کی ٹھیک ٹھیک تعبیر پیش کرتی ہے یقیناً ایک خاص قدر و قیمت پیدا کرلے گی اور جس صاحبِ نظر کے سامنے جائے گی اُس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لے گی۔ وہ یہ نہیں دیکھے گا کہ جس کی تصویر ہے وہ خود کیسا ہے؟ وہ اس میں محو ہو جائے گا کہ خود تصویر کتنی بے ساختہ ہے!

بعینہٖ یہی مثال اس صورتِ حال کی بھی سمجھ لیجیے جو مصنف اپنی انانیت کی بے ساختہ تصویر کھینچ دے سکتے ہیں وہ اس معاملے کی ساری مشکلوں پر غالب آجاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تصویر خود اپنے قلم سے کھینچی لیکن یہ بات اس کی [illegible] تصویر بے تکلف اور بے ساختہ کھنچی وہ لوگوں کو با[illegible] [illegible] یا نہ ہے لیکن اس کی بے ساختگی کی گیرائی سب کی نگاہوں کو لبھائے گی۔ ایسے ہی مصنف ہیں جو اپنی انانیت کو لافانی دلپذیری کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔

لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ انسان کی تمام معنوی محسوسات کی طرح اس کی انفرادیت کی نمود بھی مختلف حالتوں میں مختلف طرح کی نوعیتیں رکھتی ہے۔ کبھی وہ سوتی رہتی ہے کبھی جاگ اُٹھتی ہے، کبھی اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور پھر کبھی زور شور سے اُچھلنے لگتی ہے۔ انسان کی ساری قوتوں کی طرح وہ بھی نشو و نما کی محتاج ہوئی جس طرح ہر انسان کا ذہن و ادراک یکساں درجے کا نہیں ہوتا اُسی طرح انفرادیت کا جوش بھی ہر رنگ میں ایک ہی طرح نہیں اُبلتا۔ مدارج کا یہی فرق ہے جو ہم تمام ادیبوں، شاعروں، مصوروں اور موسیقی نوازوں میں پاتے ہیں۔ اکثروں کی انفرادیت بولتی ہے مگر دھیمے سر دل میں بولتی ہے۔ بعضوں کی انفرادیت اتنی پُرجوش ہوتی ہے کہ جب کبھی بولے گی، سارا گرد و پیش گونج اُٹھے گا:

یک بار نالہ کردہ ام از دردِ اشتیاق
از شش جہت ہنوز صدا می تواں شنید!

اسی لیے ایک عرب شاعر کو کہنا پڑا تھا :

وما الدھر، الا من رواۃ قصائدی
اذ قلتُ شعراً، اصبح الدھر منشداً

ایسے افراد اپنی 'میں' کا سر جوش کسی طرح نہیں دبا سکتے۔ اُن کی خاموشی بھی چیخنے والی اور اُن کا سکون بھی تڑپنے والا ہوتا ہے۔ ان کی انفرادیت دبانے سے اور زیادہ اُچھلنے لگے گی۔ ایسے افراد جب کبھی 'میں' بولتے ہیں تو اس میں قصد، بناوٹ اور نمائش کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ سر تا سر حقیقتِ حال کی ایک بے اختیارانہ چیخ ہوتی ہے۔ فیضی کی ایک ایسی ہی چیخ تھی جو اس وقت تک ہمارے سامنے سے ٹکرا رہی ہے :

می کشد شعلہ سرے از دلِ صد پارۂ ما
جوشِ آتش بود امروز بہ فوارۂ ما

لیکن ہر قانون کی طرح یہاں بھی مستثنیات ہیں۔ ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کبھی کبھی ایسی شخصیتیں بھی دنیا کے مرسح (اسٹیج) پر نمودار ہو جاتی ہیں جن کی انانیت کی مقدار اضافی نہیں ہوتی بلکہ مطلق نوعیت رکھتی ہے۔ یعنی خود اُنھیں ان کی انانیت جتنی بڑی دکھائی دیتی ہے اُتنی ہی بڑی دوسرے بھی دیکھنے لگتے ہیں۔ اُن کی انانیت کی پرچھائیں جب کبھی پڑے گی تو خواہ اندر کا آئینہ ہو خواہ باہر کا اُس کے ابعادِ ثلاثہ Dimensions ہمیشہ یکساں طور پر نمودار ہوں گے!

ایسے اخص الخواص افراد کو عام معیارِ نظر سے الگ رکھنا پڑے گا۔ ایسے لوگ فکر و نظر کے عام ترازوؤں میں نہیں تولے جا سکتے۔ ادب و تصنیف کے عام قوانین اُنھیں اپنے کلیوں سے نہیں پکڑ سکتے۔ زمانے کو اُن کا یہ حق تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ وہ جتنی

مرتبہ بھی چاہیں 'میں' بولتے رہیں، اُن کی 'ہر' میں' ان کی 'ہر وہ' اور 'تم' سے کہیں زیادہ دلپذیر ہوتی ہے۔

انانیتی ادبیات کی کوئی خاص قسم لے لیجیے، مثلاً خود نوشتہ سوانح و واردات اور پھر مثال کے لیے بغیر کاوش کے چند شخصیتیں چن لیجیے۔ مثلاً سینٹ آگسٹائن Augustine روسو، اسٹرنڈبرگ Strindberg ٹالسٹائی اناطول فرانس، آندری ژید Andre Gide ان کے خود نوشتہ سوانح چھ مختلف نوعیتوں کی چھ مختلف تصویریں ہیں لیکن سب نے یکساں طور پر ادبیاتِ عالم میں دائمی جگہ حاصل کر لی کیونکہ تصویریں بے ساختہ اور واقعی ہیں۔ مشرقی ادبیات میں مثلاً غزالی، ابنِ خلدون، بابر، جہانگیر اور ملا عبدالقادر بدایونی کے خود نوشتہ حالات سامنے لائیے۔ ہم کتنی ہی مخالفانہ نگاہوں سے انھیں پڑھیں لیکن ان کی دلآویزی کے مطالبے سے انکار نہیں کر سکتے۔ غزالی نے اپنے فکری انفعالات کی سرگزشت سنائی۔ ابنِ خلدون نے اپنے تعلیمی اور سیاسی علائق کی داستان سرائی کی۔ بابر نے امن اور جنگ کے واقعات و واردات قلم بند کیے۔ جہانگیر نے تختِ شہنشاہی پر بیٹھ کر وقائع نگاری کا قلمدان طلب کیا۔ ان سب میں ان کی انانیتیں بے پردہ بول رہی ہیں۔ ہم انھیں خود ان کی نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتے تاہم دیکھتے ہیں اور ان کی لافانی دلآویزی سے انکار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ بغیر کسی بناوٹ کے سامنے آگئی ہیں۔

بدایونی کا معاملہ اوروں سے الگ ہے۔ طبقۂ عوام کا ایک فرد، جس نے وقت کی درسیاتی تعلیم حاصل کر کے علماء کے حلقے میں اپنی جگہ بنائی اور دربارِ شاہی تک رسائی حاصل کر لی اور اس کی زندگی کی تمام سرگرمیوں میں اگر خصوصیت کے ساتھ کوئی چیز ابھرتی ہے تو وہ اس کی بے لچک تنگ نظری، بے روک تعصب، اور بے میل راسخ الاعتقادی ہے۔ ہمیں اس کی انانیت نہ صرف بہت چھوٹی دکھائی دیتی ہے بلکہ قدم قدم پر انکار و تبری

کی دعوت دیتی ہے تاہم یہ کیا بات ہے کہ اس پر بھی ہم اپنی نگاہوں کو اس کی طرف اٹھنے سے روک نہیں سکتے؟ ہم اُسے پسند نہیں کرتے پھر بھی اُسے پڑھتے ہیں اور جی لگا کر پڑھتے ہیں۔ غور کیجیے، یہ وہی بات ہوئی جو ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہم سوچ رہے تھے جس شخص کی یہ تصویر ہے وہ خود خوبصورت نہیں ہے لیکن تصویر بہ حیثیت ایک تصویر کے خوبصورت ہے اس لیے ہماری نگاہوں کو بے اختیار اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ یہ صاحبِ تصویر نہیں تھا جس نے ہماری نگاہوں کو کھینچا۔ یہ تصویر کی بے ساختگی تھی جس کے بلاوے کی کشش سے ہم اپنے آپ کو نہ بچا سکے!

ٹالسٹائی غالباً ان خاص شخصوں میں سے تھا جن کی انانیت کی مقدار اضافی ہونے کی جگہ ایک مطلق نوعیت رکھتی تھی۔ اُس کی انانیت خود اُسے جتنی بڑی دکھائی دی، دُنیا نے بھی اُسے اتنا ہی بڑا دیکھا۔ پچھلی صدی کے آخری اور اس صدی کے ابتدائی دور میں شاید ہی وقت کا کوئی مصنّف اس خود اعتمادی کے ساتھ "میں" بول سکا جس طرح یہ عجیب و غریب روسی بولتا رہا۔ اُس کے خود نوشتہ حالات، اُس کے شخصی واردات و تاثرات، اس کے مختلف وقتوں کے مکالمے اور روزنامچے، اُس کے ادبی اور فنّی مباحث، سب میں اُس کی انانیت بغیر کسی نقاب کے دُنیا کے سامنے آئی اور دُنیا اُسے عالمگیر نوشتوں کے ساتھ جمع کرتی رہی۔ اُس کے خود نوشتہ سوانح جو ایک بے رنگ سادگی کے ساتھ لکھے گئے ہیں اُس کی وار اینڈ پیس اور اینا کارنینا سے کم دلپذیر نہیں ہیں اور در اصل ان دونوں افسانوں میں بھی اُس کی انانیت ہی کی صدائیں ہم سن رہے ہیں۔ زمانہ اس کی قلم کاریوں کا رنگ و روغن ابھی تک مدھم نہیں کر سکا۔ پچھلی جنگ کے زمانے میں لوگ وار اینڈ پیس از سرِ نو ڈھونڈنے لگے تھے اور اب پھر ڈھونڈ رہے ہیں!

موجودہ عہد میں ٹالسٹائی کی عظمت بہ حیثیت ایک مفکّر کے بہت دور تک خوں کو متوجہ کر سکے گی۔ یورپ اور امریکہ کے دماغی طبقوں میں بہت کم لوگ ایسے نکلیں گے

جو اُس کے معاشرتی، فلسفی اور جمالیاتی Aesthetic افکار کو اس نظر سے دیکھنے کے لیے طیار ہوں جس نظر سے اس صدی کے ابتدائی دَور کے لوگ دیکھا کرتے تھے۔ تاہم اس کی انانیتی ادبیات کی دل پذیری سے اب بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اُس کی عجیب زندگی کا معمّا اب بھی بحث و نظر کا ایک دل پسند موضوع ہے۔ ہر دوسرے تیسرے سال کوئی نہ کوئی نئی کتاب نکلتی رہتی ہے۔

پچھلی صدی کے آخر میں اور اس صدی کے ابتدائی دور میں بکثرت خود نوشتہ سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس عہد کے ہر چھٹے مصنّف نے ضروری سمجھا کہ اپنی گزری ہوئی زندگی کو آخری عمر میں پھر ایک مرتبہ دُہرا لے۔ دُنیا کے کتب خانوں نے ان سب کو اپنی الماریوں میں جگہ دی ہے، لیکن دُنیا کے دماغوں میں بہت کم کے لیے جگہ نکل سکی۔

میں نے ابتدائی سطور میں 'ایغو' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ وہی یونانی Ego کی تعریب ہے جو ارسطو کے عربی مترجموں نے ابتدا ہی میں اختیار کر لی تھی اور پھر فارابی اور ابنِ رشد وغیرہ برابر یہ استعمال کرتے رہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ فلسفیانہ مباحث میں 'انا' کی جگہ 'ایغو' کا استعمال زیادہ موزوں ہوگا۔ یہ براہِ راست فلسفیانہ اصطلاح کو رُونما کر دیتا ہے اور ٹھیک وہی کام دیتا ہے جو یورپ کی زبانوں میں 'ایگو' دے رہا ہے۔ یہ اُس اشتباہ کو بھی دُور کر دے گا جو 'انا' مصطلحۂ فلسفہ اور 'انا' مصطلحۂ تصوّف میں باہمدگر پیدا ہو جا سکتا ہے۔ اُردو میں ہم 'ایگو' بجنسہٖ لے سکتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں گاف سے احتراز کرنے کی ضرورت نہیں۔

ابوالکلام

حکایت زاغ و بُلبل

قلعۂ احمد نگر
۱۷ مارچ ۱۹۴۳ء

صدیقِ مکرّم

کل عالَمِ تصوّر میں حکایتِ زاغ و بُلبل ترتیب دے رہا تھا۔ مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا۔

اس وقت خیال ہُوا، ایک فصل آپ کو بھی سُنا دوں:

تا فصلے از حقیقت اشیا نوشتہ ایم
آفاق را مرادفِ عنقا نوشتہ ایم

ایک دن صبح چائے پیتے ہوئے نہیں معلوم سیّد محمود صاحب کو کیا سُوجھی، ایک طشتری میں تھوڑی سی شکر لے کر نکلے اور صحن میں جا بجا کچھ ڈھونڈنے لگے:

گوئی ایں طائفہ ایں جا گہرے یافتہ اند!

جب اُن کا تعاقب کیا گیا تو معلوم ہُوا چیونٹیوں کے بِل ڈھونڈ رہے ہیں جہاں کوئی سُوراخ دکھائی دیا، شکر کی ایک چٹکی ڈال دی۔ میں نے جو یہ حال دیکھا تو یہ کہ کر ان کے سمندِ سعی پہ ایک اور تازیانہ لگا دیا کہ:

و للارض من کاس الکرام نصیب

کہنے لگے اس کا ترجمہ کیجیئے۔ میں نے کہا، خواجہ شیراز مع اضافہ کے کر چکے ہیں:

اگر شراب خوری جرعۂ فشاں بر خاک
ازاں گناہ کہ نفعے رسد بغیر چہ باک

یہاں کمروں کی چھتوں میں گوریاؤں کے جوڑوں نے جا بجا گھونسلے بنا رکھے ہیں۔ دن بھر اُن کا شور و ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ چند دنوں کے بعد محمود صاحب کو خیال ہُوا

ان کی بھی کچھ تو اضح کرنی چاہیے، ممکن ہے، گوریاؤں کی زبانِ حال نے انھیں توجہ دلائی ہو کہ :

نگاہِ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں

چھپرہ میں ایک مرتبہ آنھوں نے مُرغیاں پالی تھیں۔ دانہ ہاتھ میں لے کر آ، آ کرتے تو ہر طرف سے دوڑتی ہوئی چلی آتیں۔ یہی نسخہ چڑیوں پر بھی آزمانا چاہا لیکن چند دنوں کے بعد تھک کر بیٹھ رہے۔ کہنے لگے، عجیب معاملہ ہے، دانہ دکھا دکھا کر جتنا پاس جاتا ہوں، اتنی ہی تیزی سے بھاگنے لگتی ہیں۔ گویا دانے کی پیش کش بھی ایک جرم ہوا :

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

میں نے کہا، طلب و نیاز کی راہ میں قدم اٹھایا ہے تو عشوہ و ناز کی تغافل کیشیوں کے لیے صبر و شکیب پیدا کیجیے۔ نیازِ عشق کے دعووں کے ساتھ نازِ حسن کی گلہ مندیاں زیب نہیں دیتیں :

بہ نازکی نہ بری پے بہ منزلِ مقصود
مگر طریق رہش از سرِ نیاز کنی
اگر بہ ناز بر اند مرد، کہ آخرِ کار
بہ صد نیاز بخواند ترا و ناز کنی

یہاں کبھی کبھی صبح کو جنگلی میناؤں کے بھی دو تین جوڑے آنکلتے ہیں اور اپنی غُر غُر اور چیو چیو کے شور سے کان بہرا کر دیتے ہیں۔ اب محمود صاحب نے گوریاؤں کے عشق پر تو واسوخت پڑھا مگر ان آہوانِ ہوائی کے لیے دامِ ضیافت بچھا دیا :

من و آہوئے صحرائے کہ دائم رمید از من

روز صبح روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہاتھ میں لے کر نکل جاتے اور صحن میں جا کھڑے ہوتے۔ پھر جہاں تک حلق کام دیتا آ، آ، آ کرتے جاتے اور ٹکڑے فضا کو دکھا دکھا کر پھینکتے رہتے۔ یہ صلائے عام میناؤں کو تو ملتفت نہ کر سکی البتہ شہرستانِ ہوا کے دریوزہ گرانِ ہرجائی یعنی کوّوں نے ہر طرف سے ہجوم شروع کر دیا۔ میں نے کوّوں کو شہرستانِ ہوا کا دریوزہ گر اس لیے کہا کہ کبھی انھیں مہمانوں کی طرح کہیں جاتے دیکھا نہیں۔ طفیلیوں کے غول میں بھی بہت کم دکھائی پڑے۔ ہمیشہ اسی عالم میں پایا کہ فقیروں کی طرح ہر دروازے پر پہنچے، صدائیں لگائیں اور چل دیے:

فقیرانہ آئے، صدا کر چلے!

بہرحال محمود صاحب آ، آ کے تسلسل سے تھک کر جونہی مڑتے، یہ دریوزہ گرانِ کوتہ آستین فوراً بڑھتے اور اپنی دراز دستیوں سے دسترخوان صاف کر کے رکھ دیتے۔

اے کوتہ آستیناں تا کے دراز دستی!

صحن کے شمالی کنارے پر نیم کا ایک تناور درخت ہے اس پر گلہریوں کے جھنڈ کودتے پھرتے ہیں۔ انھوں نے جو دیکھا کہ

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے!

تو فوراً لبیک لبیک اور مرحمتِ عالی زیاد کہتے ہوئے اس دسترخوانِ کرم پر ٹوٹ پڑیں:

یاراں! صلائے عام ست گر مے کنید کارے

کوّوں کی دراز دستیوں سے جو کچھ بچتا، ان کوتاہ دستوں کی کامجوئیوں کا کھاجا بن جاتا۔ پہلے روٹی کے ٹکڑوں پر منہ مارتیں، پھر فوراً گردن اٹھا لیتیں۔ ٹکڑا چباتی جاتیں اور سر ہلا ہلا کر کچھ اشارے بھی کرتی جاتیں۔ گویا محمود صاحب کو دادِ ضیافت دیتے ہوئے

بہ طریقِ حسنِ طلب یہ بھی کہتی جاتی ہیں کہ:

گرچہ خوب است، ولیکن قدرے بہتر ازیں

خیر، بیچاری گلہریوں کا شمار تو اس سفرۂ کرم کے ریزہ چینیوں میں ہوا لیکن کوّے، جنھیں طفیلی سمجھ کر میزبانِ عالی ہمّت نے چنداں تعرض نہیں کیا تھا، اچانک اس قدر بڑھ گئے کہ معلوم ہونے لگا، پورے احمد نگر کو اس بخششِ عام کی خبر مل گئی ہے اور علاقے کے سارے کوّوں نے اپنے اپنے گھروں کو خیرباد کہہ کر یہیں دھونی رمانے کی ٹھان لی ہے۔ بیچاری میناؤں کی، جو اس اہتمامِ ضیافت کی اصلی مہمان تھیں، ابھی تک خبر بھی نہیں پہنچی تھی اور اب اگر پہنچ بھی جاتی تو بھلا طفیلیوں کے اس ہجوم میں ان کے لیے جگہ کہاں نکلنے والی تھی:

طفیلی جمع شد چنداں کہ جائے میہماں گم شد

محمود صاحب کے صلائے عام سے پہلے یہاں کوّوں کی کائیں کائیں کی نوبت صبح کی برابر بجتی رہتی تھی۔ اب جو ان کا دسترخوانِ کرم بچھا تو نقارۂ ضرب پر بھی چوٹ پڑ گئی۔ ایک دو دن تک تو لوگوں نے صبر کیا، آخر ان سے کہنا پڑا کہ اگر آپ کے دستِ کرم کی بخششیں رک نہیں سکتیں تو کم از کم چند دنوں ہی کے لیے ملتوی کر دیجیے۔ ورنہ ان ترکمانِ یغما دوست کی ترکتازیاں گھروں کے اندر کے گوشہ نشینوں کو بھی امن چین سے بیٹھنے نہ دیں گی اور ابھی تو صرف احمد نگر ہی کے کوّوں کو خبر ملی ہے، اگر فیضِ عام کا یہ لنگر خانہ اسی طرح جاری رہا تو عجب نہیں تمام دکن کے کوّے قلعۂ احمد نگر پر حملہ بول دیں اور آپ کو صائب کا شعر یاد دلائیں کہ:

دُور دستاں را بہ احساں یاد کردن ہمت است

ورنہ ہر نخلے بہ پائے خود ثمر می افگند!

ابھی محمود صاحب اس درخواست پر غور کر ہی رہے تھے کہ ایک دوسرا واقعہ ظہور میں آ گیا۔ ایک دن صبح کیا دیکھتے ہیں کہ چھت کی منڈیر پر دو معمّر و متین گدھ بھی تشریف

لے آئے ہیں :

پیری سے کمر میں اِک ذرا خم
توقیر کی صورتِ مجسّم

اور گردن اُٹھائے صلائے سفرہ کے منتظر ہیں :

اے خانہ براندازِ چمن! کچھ تو اِدھر بھی!

معلوم ہوتا ہے، ان ناخواندہ مہمانوں کی آمد محمود صاحب پر بھی با ایں ہمہ جود وسخائے عام، گراں گزری، کہنے لگے، بزرگوں نے کہا ہے، گدوں کا آنا منحوس ہوتا ہے۔ بہرحال ان حضرات کے بارے میں بزرگانِ سلف کا کچھ ہی خیال رہا ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی تشریف آوری ہمارے لیے تو بڑی ہی بابرکت ثابت ہوئی کیونکہ ادھر ان کا مبارک قدم آیا۔ اُدھر محمود صاحب نے ہمیشہ کے لیے اپنا سفرۂ کرم لپیٹنا شروع کر دیا۔ ایک لحاظ سے معاملے پر یوں بھی نظر ڈالی جاسکتی ہے کہ ان کی آمد کی آبادی میں اس ہنگامۂ ضیافت کی ویرانی پوشیدہ تھی۔ دیکھیے کیا موقع سے مومن خاں کا قصیدہ یاد آگیا :

شیخ جی آپ کے آتے ہی ہُوا دیر خراب
قصدِ کعبہ کا نہ کیجیے گا بہ ایں یُمنِ قدوم

خیر چند دنوں کے بعد بات آئی گزری ہوئی۔ لیکن کوّوں کے غولوں سے اب نجات کہاں ملنے والی تھی؟ دریوزہ گروں نے کریم کی چوکھٹ پہچان لی۔ وہ روز معیّن وقت پر آتے اور اپنے فراموش کار میزبان کو پکار پکار کے دعائیں دیتے

میاں، خوش رہو، ہم دُعا کر چلے

اسی اثنا میں موسم نے پلٹا کھایا۔ جاڑے نے رختِ سفر باندھنا شروع کیا۔ بہار کی آمد آمد کا غلغلہ برپا ہوا۔ اگرچہ ابھی تک :

اُڑتی سی اک خبر تھی زبانی طیور کی!

ہم جب گزشتہ سال اگست میں یہاں آئے تھے تو صحن بالکل چٹیل میدان تھا۔ بارش نے سبزہ پیدا کرنے کی بار بار کوششیں کیں لیکن مٹی نے بہت کم ساتھ دیا۔ اس بے رنگ منظر سے آنکھیں اُکتا گئی تھیں اور سبزہ و گل کے لیے ترسنے لگی تھیں۔ خیال ہُوا کہ باغبانی کا مشغلہ کیوں نہ اختیار کیا جائے کہ مشغلے کا مشغلہ ہوتا ہے اور اصحابِ صورت اور اصحابِ معنی، دونوں کے لیے سامانِ ذوق بہم پہنچاتا ہے:

بہ بو اصحابِ معنی را بہ رنگ اصحابِ صورت را

جواہر لال، جن کا جوہرِ مستعدی ہمیشہ ایسی تجویزوں کی راہ تکتا ہے، فوراً کمر بستہ ہو گئے اور اس خرابے میں رنگ و بو کی تعمیر کا سر و سامان شروع ہو گیا:

دل کے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

اس کارخانۂ رنگ و بُو کے ہر گوشے میں وجود کی پیدائش اور جامۂ ہستی کی آرائش کے لیئے دو باتوں کی درستگی ضروری ہوتی ہے۔ پہلی یہ کہ بیج درست ہو:

گر جاں بدہد سنگ سیہ لعل نہ گردد
با طینتِ اصلی چہ، بد گہر افتاد!

دوسری یہ کہ زمین مستعد ہو:

جوہرِ طینتِ آدم ز خمیرِ دگر است
تو توقع ز گِل کوزہ گراں می داری!

چنانچہ یہاں بھی سب سے پہلے انہی دو باتوں کی فکر کی گئی۔ بیج کے لیے چلیہ خاں کو کہہ کر پُونا لکھوایا گیا کہ وہاں کے باغوں کے ذخیرے بیجوں کی خوبی و صلاحیت کے لیئے مشہور ہیں لیکن زمین کی درستگی کا معاملہ اتنا آسان نہ تھا۔ احاطے کی پُوری زمین دراصل قلعے کی پرانی عمارتوں کا ملبہ ہے۔ ذرا کھودیئے اور پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑے اور چُونے اور ریت کا برادہ ہر جگہ نکلنے لگتا ہے۔ درمیانی حصّہ تو گویا گنبدوں اور مقبروں کا مدفن ہے نہیں معلوم کن کن فرمانرواؤں اور کیسے کیسے پری چہروں کی ہڈیوں سے اس خرابے کی مٹی گوندھی

گئی ہے، اور زبانِ حال سے کہہ رہی ہے:

قدح بہ شرطِ ادب گیر، زاں کہ ترکیبش
ز کاسۂ سرِ جمشید و بہمن ست و قباد!

ناچار تختوں کی داغ بیل ڈال کر دو دو تین تین فٹ زمین کھودی گئی اور باہر سے مٹی اور کھاد منگوا کر اُنھیں بھر اگیا۔ کئی ہفتے اس میں نکل گئے۔ جواہر لال صبح و شام پھاوڑا اور کدال ہاتھ میں لیے کوہ کندن اور کاہ برآوردن میں لگے رہتے تھے:

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بہ خونِ دل
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

اس کے بعد آبپاشی کا مرحلہ پیش آیا اور اس پر غور کیا گیا کہ کیمسٹری کے حقائق سے فنِ زراعت کے اعمال میں کہاں تک مدد لی جا سکتی ہے۔ اس موضوع پر اربابِ فن نے بڑی بڑی نکتہ آفرینیاں کیں۔ ہمارے قافلے میں ایک صاحب بنگال کے ہیں جن کی سائنٹفک معلومات، ہر موقع پر، ضرورت ہو یا نہ ہو اپنی جلوہ طرازیوں کا فیاضانہ اسراف کرتی رہتی ہیں۔ انھوں نے یہ دقیق نکتہ سنایا کہ اگر پھولوں کے پودوں کو حیوانی خون سے سینچا جائے تو ان میں نباتاتی درجے سے بلند ہو کر حیوانی درجے میں قدم رکھنے کا ولولہ پیدا ہو جائے گا اور ہفتوں کی راہ دنوں میں طے کرنے لگیں گے لیکن آج کل جبکہ جنگ کی وجہ سے آدمیوں کو خون کی ضرورت پیش آگئی ہے اور اس کے بینک کھل رہے ہیں، جلاد تختوں کے لیے کون اپنا خون دینے کے لیے تیار ہو گا؟ ایک دوسرے صاحب نے کہا، یہاں قلعے کے فوجی مس میں روز مرغیاں ذبح کی جاتی ہیں، اُن کا خون جڑوں میں کیوں نہ ڈالا جائے؟ اس پر مجھے ارتجالاً ایک شعر سوجھ گیا حالانکہ شعر کہنے کی عادت مدتیں ہوئیں بھلا چکا ہوں:

کلیوں میں اہتزاز ہے پروازِ حسن کی
سینچا تھا کس نے باغ کو مرغی کے خون سے

اگر مُرغی کی جگہ بُلبل کر دیجئے تو خیال بندوں کی طرز کا اچھا خاصا شعر ہو جائے گا:

غنچوں میں اہتزاز ہے پروازِ حُسن کی
سینچا تھا کس نے باغ کو بُلبُل کے خون سے

شعر سُن کر آصف علی صاحب کے شاعرانہ ولولے جاگ اُٹھے۔ اُنھوں نے اس زمین میں غزل کہنی شروع کر دی۔ لیکن پھر شکایت کرنے لگے کہ قافیہ تنگ ہے۔ میں نے کہا۔ ویسے بھی یہاں قافیہ تنگ ہی ہو رہا ہے۔

دیکھیے، سمندِ فکر کی وحشت خرامی بار بار جادۂ سخن سے ہٹنا چاہتی ہے اور میں چونک چونک کر باگ کھینچنے لگتا ہوں۔ جو بات کہنی چاہتا تھا، وہ یہ ہے کہ ستمبر اور اکتوبر میں بیج ڈالے گئے۔ دسمبر کے شروع ہوتے ہی سارے میدان کی صورت بدل گئی اور جنوری آئی، تو اس عالم میں آئی کہ ہر گوشہ مالن کی جھولی تھا۔ ہر تختہ گُل فروش کا ہاتھ تھا۔ گویا:

کنوں کہ در چمن آمد گل از عدم بوجود — بنفشہ در قدمِ او نہاد سر بسجود
بباغ تازہ کن آئینِ دینِ زردشتی — کنوں کہ لالہ بر افروخت آتشِ نمرود
ز دستِ شاہدِ سیمیں عذارِ عیسیٰ دم — شراب نوش و رہا کن حدیثِ عاد و ثمود

کا عالم طاری ہو گیا۔ لیکن آئینِ زردشتی کے تازہ کرنے کا سامان یہاں کہاں تھا؟ اور شاہدِ سیمیں عذار کے انفاسِ عیسوی کی اعجاز نمائیاں کہاں میسر آسکتی تھیں؟ سو اس کی کمی عالمِ تصور کی جولانیوں سے پوری کی گئی۔ زمانے کی تنگ مائگی جس قدر کوتاہیاں کرتی رہتی ہے، فکرِ فراخ حوصلہ کی آسودگیاں اتنی ہی بڑھتی جاتی ہیں:

چوں دستِ ما بہ دامنِ وصلش نمی رسد
پائے طلب شکستہ بداماں نشستہ ایم

وقت کی رعایت سے اکثر پھول موسمی تھے۔ چالیس سے زیادہ قسمیں گنی جاسکتی تھیں۔ سب سے پہلے مارننگ گلوری Morning Glory نے اس خرابۂ بے رنگ کو

اپنی گل شگفتگیوں سے رنگین کیا۔ جب صبح کے وقت آسمان پر سورج کی کرنیں مسکرانے لگتیں تو زمین پر مورننگ گلوری کی کلیاں کھلکھلا کر ہنسنا شروع کر دیتیں۔ ابوطالب کلیم کو کیا خوب تمثیل سوجھی تھی:

شیرینیٔ تبسم ہر غنچہ را مپرس
در شیر صبح خندۂ گلہا شکر گذاشت

کوئی پھول یاقوت کا کٹورا تھا۔ کوئی نیلم کی پیالی تھی۔ کسی پھول پر گنگا جمنی کی قلم کاری کی گئی تھی۔ کسی پر چھینٹ کی طرح رنگ برنگ کی چھپائی ہو رہی تھی۔ بعض پھولوں پر رنگ کی بوندیں اس طرح پڑ گئی تھیں کہ خیال ہوتا تھا۔ صناعِ قدرت کے موقلم میں رنگ زیادہ بھر گیا ہو گا۔ صاف کرنے کے لیے جھٹکنا پڑا اور اس کی چھینٹیں قبائے گل کے دامن پر پڑ گئیں:

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے؟

'گلوری' کا اردو میں ترجمہ کیجیے تو بات بنتی نہیں 'اجلالِ صبح' وغیرہ کہہ سکتے ہیں لیکن ذوقِ سلیم حرف گیری کرتا ہے اس لیے میں مارننگ گلوری کو 'بہارِ صبح' کے نام سے پکارتا ہوں:

یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

بہارِ صبح کی بیلیں برآمدے کی چھت تک پہنچا کر پھر اندر کی طرف پھیلا دی گئی تھیں۔ چند دنوں کے بعد نظر اٹھائی تو ساری چھت پر پھولوں سے لدی ہوئی شاخیں پھیل گئی تھیں۔ لوگ پھولوں کی سیج بچھاتے ہیں اور کروٹوں اسے پامال کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے حصے میں کانٹوں کا فرش آیا تو ہم نے اپنی پھولوں کی سیج بستر سے اٹھا کر چھت پر الٹ دی۔ تلووں کے کانٹے چبھتے رہتے ہیں مگر نگاہ ہمیشہ اوپر کی طرف رہتی ہے:

گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی

سامنے دو تختوں پر زینیا Zinnia کے پھول رنگ برنگ کے صافے باندھے نمودار ہو گئے۔ زینیا کے پھول کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ یہ بڑے زینیا کے پھول تھے۔ ان کے صافوں کی لپیٹ اتنی مرتّب اور مدوّر واقع ہوئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا، کسی مشّاق دستار بند نے قالب پر چڑھا کر پیچوں کی بایک ایک سلوٹ نکال دی ہے۔ جُوں جُوں عمر بڑھتی گئی، صافوں کی ضخامت بھی بڑھتی گئی اور پھر تو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے پہرہ داروں کی صفیں رنگ برنگ کی پگڑیاں باندھے کھڑی ہیں اور زندانیانِ قلعہ کی طرح اس باغِ نورستہ کی بھی پاسبانی ہو رہی ہے:

کہ بلبلاں ہمہ مستند و باغباں تنہا!

ان تختوں کے درمیان گلِ خطمی یعنی ہالی ہاک Holly Hock کا حلقہ تھا۔ یہ رنگ برنگ کے وائن گلاس[1] ہاتھوں میں لیے کھڑے تھے۔ ہر شاخ اتنے گلاس سنبھالے ہوئے تھی کہ دل اندیشہ ناک رہتا، کہیں ایسا نہ ہو، ہوا کے جھونکوں کی ٹھوکر لگے اور گلاس گر کر چُور چُور ہو جائیں۔ دانشؔ مشہدی نے غالباً انہی پھولوں کی ایک شاخ دیکھ کر کہا تھا:

دیدہ ام شاخِ گلے، بہ خویش می پیچم کہ کاش
می توانستم بہ یک دست ایں قدر ساغر گرفت

تخیّل دراصل امیر خسروؔ سے ماخوذ ہے، جس نے اسی زمین میں کہا تھا:

ہست صحرا چوں کفِ دست و برد از لالہ جام
خوش کفِ دستے کہ چندیں جامِ صہبا بر گرفت

---

[1] قدیم ایرانی ظروف میں "پیمانہ" اسی قسم کا ظرف تھا جس طرح کا آج کل "وائن گلاس" ہوتا ہے لیکن اگر پیمانہ کہیے تو کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ناچار وائن گلاس ہی کہنا پڑتا ہے۔

گُلِ خطمی کے پھولوں کی تشبیہ کتنی ہی دلکش ہو مگر یہ ماننا پڑے گا کہ حُسنِ نزاکت کی ادائیں یہاں نہیں مل سکتیں۔ گلاس خوشنما ہیں مگر نازک نہیں ہیں۔ پٹونیا petunia نے بھی میدان کے ہر گوشے کو دامنِ رنگین بنا دیا تھا لیکن اُس کی رنگتوں کی سادگی سے تخیل کی پیاس کہاں بُجھ سکتی تھی؟ میدان کے وسط میں جھنڈے کے چبوترے کے دونوں طرف اسٹر Aster کارن فلاور corn Flower سویٹ پیس Sweat Peas کوکنار Poppy فلکس Phlax کلیوپسیس calliopsis اور کاسمس cosmas کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ نکل آئے تھے۔ گویا میدان کی کمر میں بوقلموں رنگوں کا ایک پٹکا بندھ گیا تھا لیکن وہ بھی چشمِ تماشائی کا سامانِ دید تھا۔ اہلِ بینش کے لیے ذوقِ نظر کا سامان نہ تھا حالانکہ:

بزم میں اہلِ نظر بھی تھے، تماشائی بھی

اس غرض کے لیے پِنکس pinks سلویا Salvia اور پینزی pansy وغیرہ کے تختوں کا رُخ کرنا پڑتا تھا جن کی جلوہ فروشیاں ہر دم دیدہ و دل کو دعوتِ نظارہ دیتی رہتی تھیں۔ قدرت کے قلمِ صنعت کی یہ بھی ایک عجیب کرشمہ سنجی ہے کہ پھولوں کے ورق اور تتلیوں کے پروں پر ایک ہی موقلم سے مینا کاری کر دی اور ایک ہی رنگ کی دوائیں کام میں لائی گئیں۔ ان پھولوں کے اوراق کا مطالعہ کیجیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بڑے پھولوں کی کترن سے کچھ کاغذ بچ رہا تھا۔ اُسے بھی ضائع نہیں کیا گیا اور قینچی سے تراش تراش کر ننھے ننھے پھولوں کے ورق بنا لیے۔ اگر ایک چیز نازک اور خوبصورت ہوتی ہے تو ہم کہتے ہیں یہ پھول ہے لیکن اگر خود پھولوں کے لیے کچھ کہنا چاہیں تو انھیں کس چیز سے تشبیہ دیں؟ حقیقت یہ ہے کہ زبانِ درماندہ کو یہاں یارائے سخن نہیں اور خاموشی کے بغیر چارہ کار نہیں۔ حُسن کی جلوہ طرازیاں محویت کا پیام ہوتی ہیں۔ خامہ فرسائی اور سخن آرائی کا تقاضا نہیں ہوتا:

از نگہ چشم تہی گشت و تماشا ماندہ است — در زبان حرف نماندہ ست و سخنہا ماندہ ست

ان پھولوں کو موسمی کہا جاتا ہے کیونکہ ان کی پیدائش اور زندگی صرف موسم ہی تک محدود رہتی ہے اور ادھر موسم ختم ہوا، ادھر انھوں نے بھی دنیا کو خیر باد کہہ دیا، گویا زندگی کا ایک ہی پیراہن ان کے حصے میں آیا تھا، وہی کفن کا بھی کام دے گیا:

ہمچو ماہی غیر داغِ غم پوششِ دیگر نہ بود
تا کفن آمد، ہمیں یک جامہ بر تن داشتم

میر مبارک اللہ واضح عالمگیری کو یہی خیال پانی کا بلبلا دیکھ کر ہوا تھا۔ دیکھیے کیا خوب کہہ گیا ہے:

رشک فرمائے دلم نیست بجز عیشِ حباب
یافت یک پیرہنِ ہستی و آں ہم کفن ست

بہار میں پھولوں سے درخت لد جاتے ہیں، خزاں میں غائب ہو جاتے ہیں، پھر جونہی موسم کا دور پلٹتا ہے، دوبارہ آموجود ہوتے ہیں مگر موسمی پھولوں کے پودوں کا شیوۂ یک رنگی و یک ساختگی دیکھیے کہ جب ایک مرتبہ دنیا کو پیٹھ دکھا دی تو پھر دوبارہ مڑ کے دیکھنا نہیں چاہتے، گویا ابو طالب کلیم کا اشارہ انہی کی طرف تھا:

وضعِ زمانہ قابلِ دیدن دوبارہ نیست
رو پس نہ کرد ہر کہ ازیں خاکداں گزشت

پھولوں کے جمالیاتی Aesthetic منظر سے اگر نظر ہٹائیے تو پھر ایک اور گوشہ سامنے آجاتا ہے۔ یہ ان کی عجائب آفرینیوں کا گوشہ ہے۔ روحِ نباتی بھی روحِ حیوانی کی طرح قسم قسم کے جسموں میں ابھرتی ہے اور طرح طرح کے افعال و خواص کی نمائش کرتی رہتی ہے۔ یہ کہیں سوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے کہیں کروٹ بدلنے لگتی ہے اور پھر کہیں اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ ہمارے اس چھوٹے سے گوشۂ چمن میں ابھی صرف ایک ہی پھول ایسا ہے جسے اس قسم کے غیر معمولی پھولوں میں سے شمار کیا جا سکتا ہے۔ یعنی گلوری اوسا سپربا Gloriosa Superba

اس کی پانچ جڑیں گملوں میں لگائی گئی تھیں، چار بار آور ہوئیں۔ اب ان کی شاخیں کلیوں سے لدی ہوئی ہیں۔ ان کا پھول پہلے پنجے کی طرح کھلے گا۔ پھر پیالے کی طرح اُلٹ جائے گا۔ پھر فانوس کی طرح مدوّر ہونے لگے گا، پھر تھوڑی دیر دم لینے کے لیے رُک جائے گا اور پھر دیکھیے تو جن منزلوں سے گزرتا ہوا آیا تھا انہی منزلوں سے گزرتا ہوا اُلٹے پاؤں واپس ہونے لگے گا۔ واپسی میں پہلے فانوس کی اُٹھی ہوئی شاخیں پھیل کر ایک پیالہ بنائیں گی۔ پھر اچانک یہ پیالہ اُلٹ جائے گا۔ گویا زندگی کے جامِ واژگوں میں اب کچھ باقی نہ رہا :

لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

ہر پھول کی آمد و رفت کی یہ مسافرت دس سے بارہ دن کے اندر طے ہوا کرتی ہے۔ چھ دن آنے میں لگتے ہیں، چھ دن واپسی میں، اور دراصل اس کا آنا بھی جانے ہی کے لیے ہوتا ہے :

ترا آنا نہ تھا ظالم، مگر تمہید جانے کی

رنگت کے اعتبار سے بھی اُس کی بوقلمونیوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ کلیاں جب نمودار ہوں گی تو ہلکے سبز رنگ کی ہوں گی۔ پھر جوں جوں کھلنے کا وقت آنے لگے گا، زردی اُبھرنے لگے گی اور پھر زردی بتدریج سُرخی مائل ہونا شروع ہو جائے گی۔ پہلے آدھا سُرخ آدھا زرد رہے گا۔ پھر زردی تیزی کے ساتھ گھٹنے لگے گی اور پھر پورا پھول سُرخ ہو کر مرچ کی پھلیوں کی طرح چمکنے لگے گا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس کی نسل ہندوستان کی طرف منسوب کی جاتی ہے مگر یہاں اس کی شہرت نہیں :

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ!

یہ پھول نباتات کی اُس قسم میں داخل ہے جسے اتحادِ تناسلی کے لیے خارج کی مداخلت مطلوب ہوتی ہے، اور کبھی ہوا کے جھونکوں سے اور کبھی تتلیوں اور مکھیوں کی نشست و برخاست سے فطرت یہ کام لے لیا کرتی ہے۔ اس پھول کا جزو رجولیت اس کے

انوثیت کے جزسے اِس طرح بے تعلق واقع ہوا ہے کہ جب تک خارج کا ہاتھ مادۂ تلقیح کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ نہ پہنچا دے، تلقیح کا عمل انجام نہیں پا سکتا۔ جن پھولوں کو یہ خارجی اعانت مل جاتی ہے وہ باردار ہو جاتے ہیں اور اپنا بیج چھوڑ جاتے ہیں، جنھیں نہیں ملتی بانجھ ہو کر بغیر بیج بنائے ختم ہو جاتے ہیں۔ ان پودوں کے لیے تتلیوں کا ایک گروہ بروقت پہنچ گیا چنانچہ اکثر پھول باردار ہو گئے۔

خیر یہ چمن آرائی کا ذکر تو ایک جملۂ معترضہ تھا جو بلا قصد اتنا طولانی ہو گیا۔ اب اصل حکایت کی طرف واپس ہونا چاہیے۔ فروری میں ابر و باد کی آمد و رفت سے موسم کا اُتار چڑھاؤ جاری رہا مگر جونہی مہینہ ختم ہونے پر آیا۔ موسم بہار کا پیش خیمہ پہنچ گیا۔ یعنی معتدل ہواؤں کے جھونکے چلنے لگے۔ پھر ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ خراماں خراماں چلتی ہوئی خود بہار بھی آموجود ہوئی ہے اور جوانانِ چمن نے اُس کی خوش آمدید کا جشن منانا شروع کر دیا ہے:

نفسِ بادِ صبا مشک فشاں خواہد شد
عالمِ پیر دگر بار جواں خواہد شد!

اُسی زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک دن دوپہر کے وقت کمرے میں بیٹھا تھا کہ اچانک کیا سنتا ہوں، بُلبل کی نواؤں کی صدائیں آ رہی ہیں:

باز نوائے بلبلاں عشق تو یاد می دہد
ہر کہ ز عشق نیست خوش عمر بباد می دہد

باہر نکل کر دیکھا تو خطمی کے شگفتہ پھولوں کے ہجوم میں ایک جوڑا بیٹھا ہے اور گردن اُٹھائے نغمہ سنجی کر رہا ہے۔ بے اختیار خواجہ شیراز کی غزل یاد آ گئی:

صفیرِ مُرغ برآمد، بط شراب کجاست
فغاں فتاد ز بُلبلؔ نقابِ گل کہ درید"

یہ علاقہ اگرچہ سرد سیر نہیں ہے لیکن چونکہ بلند سطح پر واقع ہوا ہے اس لیے پہاڑی

بُلبُلوں سے خالی نہیں ہے۔ یہ بُلبُلیں اگرچہ سرو سیر ایران کی بُلبُلوں کی طرح ہزار داستان نہیں ہوتیں لیکن رسیلے گلے کی ایک تان بھی کیا کم ہے۔ دوپہر کی چائے کا، جو قیلولے کے بعد پیتا ہوں، آخری فنجان باقی تھا۔ میں نے اٹھایا اور اس نغمۂ عندلیب پر خالی کر دیا:

تو نیز بادہ بہ چنگ آرد راہِ صحرا گیر
کہ مرغِ نغمہ سرا سازِ خوش نوا آورد

دوسرے دن صبح برآمدے میں بیٹھا تھا کہ بُلبُل کے ترانے کی آواز پھر اُٹھی۔ میں نے ایک صاحب کو توجّہ دلائی کہ سُننا بُلبُل کی آواز آ رہی ہے۔ ایک دُوسرے صاحب، جو صحن میں ٹہل رہے تھے کچھ دیر کے لیے رُک گئے اور کان لگا کر سنتے رہے۔ پھر بولے کہ ہاں، قلعے میں کوئی چھکڑا جا رہا ہے۔ اُس کے پہیّوں کی آواز آ رہی ہے۔ سبحان اللہ ذوقِ سماع کی دقّتِ امتیاز دیکھیے۔ بُلبُل کی نواؤں اور چھکڑے کے پہیوں کی ریں ریں میں یہاں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا:

ہمائے، گو مفگن سایۂ شرف ہرگز
دراں دیار کہ طوطی کم از زغن باشد

خدارا انصاف کیجیے، اگر دو ایسے کان ایک قفس میں بند کر دیئے جائیں کہ ایک میں تو بُلبُل کی نوائیں بسی ہوں، دوسرے میں چھکڑے کے پہیّوں کی ریں ریں تو آپ اسے کیا کہیں گے:

نوائے بُلبُلت اے گل کجا پسند افتد
کہ گوشِ ہوش بہ فرمانِ ہرزہ گو داری!

اصل یہ ہے کہ ہر مُلک کی فضا طبیعتوں میں ایک خاص طرح کا طبعی ذوق پیدا کر دیا کرتی ہے۔ ہندوستان کا عام طبعی ذوق بُلبُل کی نواؤں سے آشنا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ مُلک کی فضا دوسری طرح کی صداؤں سے بھری ہوئی تھی۔ یہاں کے پرندوں کی شہرت طوطے اور مینا کے پروں سے اُڑی اور دُنیا کے عجائب میں سے شمار کی گئی:

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند
زیں قندِ پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

بُلبل کی جگہ یہاں کویل کی صدائیں شاعری کے کام آئیں اور اس میں شک نہیں کہ اس کی کوک دردآشنا دلوں کو غم والم کی چیخوں سے کم محسوس نہیں ہوتی۔

بلبل کی نواؤں کا ذوق تو ایران کے حصّے میں آیا ہے۔ موسم بہار میں باغ وصحرا ہی نہیں بلکہ ہر گھر کا پائیں باغ ان کی نواؤں سے گونج اُٹھتا ہے۔ بچّے جھولے میں اُن کی لوریاں سُنتے سُنتے سو جائیں گے اور مائیں اشارہ کر کے بتلائیں گی کہ دیکھ یہ بُلبل ہے جو تجھے اپنی کہانی سُنا رہی ہے۔ جنوب سے شمال کی طرف جس قدر بڑھتے جائیں، یہ افسونِ فطرت اور بھی زیادہ عام اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ایک شخص نے شیراز یا قزوین کے گُلگشتوں کی سَیر نہ کی ہو، وہ سمجھ نہیں سکتا کہ حافظ کی زبان سے یہ شعر کس عالم میں ٹپکے تھے:

بُلبل بہ شاخِ سرو بہ گل بانگ پہلوی
می خواند دوش درسِ مقاماتِ معنوی
یعنی بیا، کہ آتشِ موسیٰ نمودِ گل،
تا از درخت نکتۂ تحقیق بشنوی
مُرغانِ باغ قافیہ سنجند و بذلہ گو
تا خواجہ می خورد بہ غزل ہائے پہلوی

یہ جو کہا مرغانِ باغ "قافیہ سنجی" کرتے ہیں تو یہ مبالغہ نہیں ہے واقعہ ہے۔ میں نے ایران کے چمن زاروں میں ہزار کو قافیہ سنجی کرتے ہوئے خود سُنا ہے۔ ٹھہر ٹھہر کے لَے بدلتی جائے گی اور ہر لَے ایک ہی طرح کے آثار پر ختم ہوگی جو سُننے میں ٹھیک ٹھیک شعروں کے قوافی کی طرح متوازن اور متجانس محسوس ہوں گے۔ گھنٹوں سُنتے رہیے، ان قافیوں کا تسلسل ٹوٹنے والا نہیں۔ آواز جب ٹوٹے گی۔ ایک ہی

قافیے پر ٹوٹے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ نوائے بلبل بہشتِ بہار کا ملکوتی ترانہ ہے جو ملک اس بہشت سے محروم ہے وہ اس کے ترانے کے ذوق سے بھی محروم ہے۔ گرم ملکوں کو اس عالم کی کیا خبر؟ زمستان کی برفباری اور پت جھڑ کے بعد جب موسم کا رُخ پلٹنے لگتا ہے اور بہار اپنی ساری رعنائیوں اور جلوہ فروشیوں کے ساتھ باغ و صحرا پر چھا جاتی ہے تو اس وقت برف کی بے رحمیوں سے ٹھٹھری ہوئی دُنیا یکایک محسوس کرنے لگتی ہے کہ اب موت کی افسردگیوں کی جگہ زندگی کی سرگرمیوں کی ایک نئی دنیا نمودار ہو گئی۔ انسان اپنے جسم کے اندر دیکھتا ہے تو زندگی کا تازہ خون ایک ایک رگ کے اندر اُبلتا دکھائی دیتا ہے۔ اپنے سے باہر دیکھتا ہے تو فضا کا ایک ایک ذرّہ عیش و نشاطِ ہستی کی سرمستیوں میں رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ آسمان و زمین کی ہر چیز، جو کل تک محرومیوں کی سوگواری اور افسردگیوں کی جانکاہی تھی، آج آنکھیں کھولیے تو حُسن کی عشوہ طرازی ہے، کان لگایئے تو نغمہ کی جاں نوازی ہے۔ سونگھیے تو سرتاسر بو کی عطر بیزی ہے:

صبا بہ تہنیتِ پیرِ مے فروش آمد | کہ موسمِ طرب و عیش و نائے و نوش آمد
ہوا مسیح نفس گشت و باد نافہ کشا | درخت سبز شد و مرغ در خروش آمد
تنورِ لالہ چناں بر فروخت بادِ بہار | کہ غنچہ غرق عرق گشت و گل بہ جوش آمد

عین جوش و سرمستی کی ان عالمگیریوں میں بلبل کے مستانہ ترانوں کی گت شروع ہو جاتی ہے اور یہ نغمہ سرائے بہشتی اس محویت اور خود رفتگی کے ساتھ گانے لگتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے خود سازِ فطرت کے تاروں سے نغمے نکلنے لگے۔ اُس وقت انسانی احساسات میں تہلکہ مچنے لگتا ہے، ممکن نہیں کہ حرف و صوت سے ان کی تعبیر آشنا ہو سکے۔ شاعر پہلے مضطر ہوگا کہ اس عالم کی تصویر کھینچ دے۔ جب نہیں کھینچ سکے گا تو پھر خود اس کی تصویر بن جائے گا۔ وہ رنگ، بو اور نغمے کے اس سمندر کو پہلے کنارے پر کھڑے ہو کر دیکھے گا پھر کود پڑے گا اور خود اپنی ہستی کو بھی اسی کی ایک موج بنا دے گا:

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم!
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نو در اندازیم
چو دردستست رودے خوش، بزن مطرب سرودے خوش
کہ دست افشاں غزل خوانیم و پا کوباں سر اندازیم

ہندوستان میں صرف کشمیر ایک ایسی جگہ ہے جہاں اس عالم کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے، اسی لیے فیضی کو کہنا پڑا تھا:

ہزار قافلۂ شوق می کشد شب گیر
کہ بارِ عیش کشاید بخطۂ کشمیر

لیکن افسوس ہے، لوگوں کو پھل کھانے کا شوق ہوا۔ عالمِ بہار کی جنت نگاہیوں کا شوق نہ ہوا۔ کشمیر جائیں گے بھی تو بہار کے موسم میں نہیں، بارش کے بعد پھلوں کے موسم میں۔ معلوم نہیں دنیا اپنی ہر بات میں اتنی شکم پرست کیوں ہو گئی ہے؟ حالانکہ انسان کو معدے کے ساتھ دل و دماغ بھی دیا گیا تھا۔

ہندوستان کے پہاڑوں میں پہاڑی بلبل کا ترنم نینی تال اور کانگڑہ میں زیادہ سنا جا سکتا ہے۔ مسوری اور شملہ کی چٹانی فضا اس کے لیے کافی کشش پیدا نہیں کر سکتی تھی۔

ہندوستان میں عام طور پر چار قسم کی بلبلیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ خوش نوا قسم وہ ہے جس کے چہرے کے دونوں طرف سفید بُٹے ہوتے ہیں اور اس لیے آج کل نیچرل ہسٹری کی تقسیم میں اسے وہائٹ چیکڈ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ کشامہ کو اگرچہ عام طور پر بلبل نہیں سمجھا جاتا لیکن اسے بھی میدانی سرزمینوں کا بلبل ہی تصور کرنا چاہیے۔ مغربی یو، پی اور پنجاب میں اس کی متعدد قسمیں پائی جاتی ہیں۔

اس وقت تک بلبل کے تین جوڑے یہاں دکھائی دیے ہیں۔ تینوں معمولی پہاڑی قسم کے ہیں جنھیں انگریزی میں کے نام سے پکارتے

ہیں۔ ایک نے تو پھول کی ایک بیل میں آشیانہ بھی بنا لیا ہے۔ دوپہر کو پہلے بالکل خاموش رہے گی پھر جونہی میں کچھ دیر لیٹنے کے بعد اُٹھوں گا اور لکھنے کے لیے بیٹھوں گا، معاً ان کی نوائیں شروع ہو جائیں گی۔ گویا انھیں معلوم ہو گیا ہے کہ یہی وقت ہے جب ایک ہم صفیر اپنے دل و جگر کے زخموں کی پٹیاں کھولتا ہے۔ اس لیے نالہ و فریاد کے پیہم چہکے لگانا شروع کر دیں۔ میرا وہی حال ہوا جو عربی کے ایک شاعر کا ہوا تھا:

ومما شجانی انّی کنت نائماً
اعلّل من بردٍ بطیب التنسّم
الی ان دعت ورقاء من غصن ایکۃ
تغرّد مبکاھا بحسن الترنّم
فلو قبل مبکاھا بکیت صبابۃً
بسُعدیٰ، شفیت النفس قبل التندّم
ولاکن بکت قبلی، فھیّج لی البکاء
بکاھا، فقلت الفضل للمتقدّم!

ابوالکلام

---

[1] اور جس بات نے مجھے غمگین کیا وہ یہ ہے کہ جبکہ میں سو رہا تھا اور میٹھی نیند کے مزے لے رہا تھا تو اچانک ایک خوش آواز پرند نے درختوں کے جھنڈ میں ترانہ سنجی شروع کر دی۔ اُس کی رونے کی آواز اپنے ترنم کی خوبی میں آپ ہی اپنی مثال تھی۔ اگر اس کے رونے سے پہلے میں نے سُعدیٰ کے عشق میں چند آنسو بہا دیے ہوتے تو میرے حصے میں شرمندگی نہ آتی، مگر واقعہ یہ ہے کہ میں ایسا نہ کر سکا، اور یہ اس پرند کا رونا تھا جس سے میرے اندر بھی گریہ و زاری کا جوش امنڈ آیا۔ پس مجھے شرمندگی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بلاشبہہ یہاں فضیلت اسی کے لیے ہوئی جس نے پہلا قدم اٹھایا۔

چڑیا چڑے کی کہانی

قلعۂ احمد نگر

۱۷ مارچ ۱۹۴۳ء

صدیق مکرم!

زندگی میں بہت سی کہانیاں بنائیں۔ خود زندگی ایسی گزری، جیسے ایک کہانی ہو:

ہے آج جو سرگزشت اپنی
کل اس کی کہانیاں بنیں گی

آیئے آج آپ کو چڑیا چڑے کی کہانی سناؤں:

دگر ہا شنیدستی، ایں ہم شنو!

یہاں کمرے جو ہمیں رہنے کو ملے ہیں، پچھلی صدی کی تعمیرات کا نمونہ ہیں۔ چھت لکڑی کے شہتیروں کی ہے اور شہتیروں کے سہارے کے لیے محرابیں ڈال دی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جا بجا گھونسلا بنانے کے قدرتی گوشے نکل آئے اور گوریاؤں کی بستیاں آباد ہو گئیں۔ دن بھر اُن کا ہنگامۂ تگ و دو گرم رہتا ہے۔ کلکتہ میں بالی گنج کا علاقہ چونکہ کھلا اور درختوں سے بھرا ہے اس لیے وہاں بھی مکانوں کے برآمدوں اور کارنسوں پر چڑیوں کے غول ہمیشہ حملہ کرتے رہتے ہیں۔ یہاں کی ویرانی دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آ گئی:

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

گزشتہ سال جب اگست میں یہاں ہم آئے تھے تو ان چڑیوں کی آشیاں سازیوں

نے بہت پریشان کر دیا تھا۔ کمرے کے مشرقی گوشے میں منہ دھونے کی ٹیبل لگی ہے ٹھیک
اس کے اُوپر نہیں معلوم کب سے ایک پُرانا گھونسلا تعمیر پا چکا ہے۔ دن بھر میدان
سے تنکے چُن چُن کر لاتیں اور گھونسلے میں بچھانا چاہتیں۔ وہ ٹیبل پہ گر کے اسے کوڑے
کرکٹ سے اٹ دیتے۔ ادھر پانی کا جگ بھروا کے رکھا اُدھر تنکوں کی بارش
شروع ہو گئی۔ پچھم کی طرف چارپائی دیوار سے لگی تھی۔ اس کے اوپر نئی تعمیروں کی
سرگرمیاں جاری تھیں۔ ان نئی تعمیروں کا ہنگامہ اور زیادہ عاجز کر دینے والا تھا۔
ان چڑیوں کو ذرا سی تو چونچ ملی ہے اور مٹھی بھر کا بھی بدن نہیں لیکن طلب وسعی کا
جوش اس بلا کا پایا ہے کہ چند منٹوں کے اندر بالشت بھر کلفات کھود کے صاف کر
دیں گی۔ حکیم ارشمیدس Archimedes کا مقولہ مشہور ہے DOSMOE POU
STO KAI TEN GENKINES مجھے فضا میں کھڑے ہونے کی جگہ دے
دو، میں کرۂ ارضی کو اس کی جگہ سے ہٹا دوں گا۔ اس دعوے کی تصدیق ان چڑیوں کی
سرگرمیاں دیکھ کر ہو جاتی ہے۔ پہلے دیوار پہ چونچ مار مار کے اپنی جگہ بنا لیں گی کہ پنجے
ٹیکنے کا سہارا نکل آئے۔ پھر اس پہ پنجے جما کر چونچ کا پھاوڑا چلانا شروع کر دیں گی۔
اور اس زور سے چلائیں گی کہ سارا جسم سکڑ سکڑ کر کانپنے لگے گا اور پھر تھوڑی دیر کے
بعد دیکھیے تو کئی انچ کلفات اُڑ چکی ہو گی۔ مکان چونکہ پُرانا ہے۔ اس لیے نہیں معلوم،
کتنی مرتبہ چونے اور ریت کی تہیں دیوار پہ چڑھتی رہی ہیں۔ اب مل ملا کر تعمیری مسالے کا
ایک موٹا سا دل بن گیا ہے۔ ٹوٹتا ہے تو سارے کمرے میں گرد کا دھواں پھیل جاتا
ہے اور کپڑوں پہ دیکھیے تو غبار کی تہیں جم گئی ہیں۔

اس مصیبت کا علاج بہت سہل تھا۔ یعنی مکان کی از سرِ نو مرمت کر دی جائے
اور تمام گھونسلے بند کر دیے جائیں لیکن مرمت بغیر اس کے ممکن نہ تھی کہ معمار بلائے
جائیں اور یہاں باہر کا کوئی آدمی اندر قدم نہیں رکھ سکتا۔ یہاں ہمارے آتے ہی پانی کے
نل بگڑ گئے تھے۔ ایک معمولی مستری کا کام تھا لیکن جب تک ایک انگریز فوجی انجینیئر

کمانڈنگ آفیسر کا پروانۂ راہداری لے کر نہیں آیا ان کی مرمت نہ ہو سکی۔
چند دنوں تک تو میں نے صبر کیا لیکن پھر برداشت نے صاف جواب دے دیا اور فیصلہ کرنا پڑا کہ اب لڑائی کے بغیر چارہ نہیں:

من و گرز و میدان و افراسیاب

یہاں میرے سامان میں ایک چھتری بھی آگئی ہے۔ میں نے اٹھائی اور اعلانِ جنگ کر دیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد معلوم ہو گیا کہ اس کوتاہ دستی کے ساتھ ان حریفانِ سقف و محراب کا مقابلہ ممکن نہیں۔ حیران ہو کر کبھی چھتری کی نارسائی دیکھتا، کبھی حریفوں کی بلند آشیانی۔ بے اختیار حافظ کا شعر یاد آگیا:

خیالِ قدِ بلند تو می کند دلِ من
تو دستِ کوتہ من بین و آستینِ دراز

اب کسی دوسرے ہتھیار کی تلاش ہوئی۔ برآمدے میں جالا صاف کرنے کا بانس پڑا تھا۔ دوڑتا ہوا گیا اور اسے اٹھا لایا۔ اب کچھ نہ پوچھیے کہ میدانِ کارزار میں کس زور کا رن پڑا۔ کمرے میں چاروں طرف حریف طواف کر رہا تھا اور میں بانس اٹھائے دیوانہ وار اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ فردوسی اور نظامی کے رجز بے اختیار زبان سے نکل رہے تھے:

بہ خنجر زمیں را میستاں کنم
بہ نیزہ ہوا را نیستاں کنم

آخر میدان اپنے ہی ہاتھ رہا اور تھوڑی دیر کے بعد کمرہ ان حریفانِ سقف و محراب سے بالکل پاک صاف تھا:

بہ یک تاختن تا کجا تاختم
چہ گردن کشاں را سر انداختم

اب میں نے چھت کے تمام گوشوں پر فتحمندانہ نظر ڈالی اور مطمئن ہو کر لکھنے میں مشغول ہو گیا۔

لیکن ابھی پندرہ منٹ پورے نہیں گزرے ہوں گے کہ کیا سنتا ہوں، حریفوں کی رجز خوانیوں اور ہوا پیمائیوں کی آوازیں پھر اُٹھ رہی ہیں۔ سر اُٹھا کے جو دیکھا تو چھت کا ہر گوشہ اُن کے قبضے میں تھا۔ میں فوراً اُٹھا اور بانس لا کر پھر معرکۂ کارزار گرم کر دیا:

برآرم دمار از ہمہ لشکرش
بہ آتش بسوزم ہمہ کشورش

اس مرتبہ حریفوں نے بڑی پامردی دکھائی۔ ایک گوشہ چھوڑنے پر مجبور ہوتے تو دوسرے میں ڈٹ جاتے لیکن بالآخر میدان کو پیٹھ دکھانی ہی پڑی۔ کمرے سے بھاگ کر برآمدے میں اور وہاں اپنا لاؤ لشکر نئے سرے سے جمانے لگے میں نے وہاں بھی تعاقب کیا اور ہتھیار ہاتھ سے نہیں رکھا کہ سرحد سے بہت دُور تک میدان صاف نہیں ہو گیا تھا۔

اب دشمن کی فوج تتر بتر ہو گئی تھی مگر اندیشہ باقی تھا کہ کہیں پھر اکٹھی ہو کر میدان کا رُخ نہ کرے۔ تجربے سے معلوم ہوا تھا کہ بانس کے نیزے کی ہیبت دشمنوں پر خوب چھا گئی ہے۔ جس طرف رُخ کرتا تھا اُسے دیکھتے ہی کلمۂ فرار پڑھنے لگتے۔ اس لیے فیصلہ کیا ابھی کچھ عرصے تک اسے کمرے ہی میں رہنے دیا جائے اگر کسی اکا دکا حریف نے رُخ کرنے کی جرأت بھی کی تو یہ سر بفلک نیزہ دیکھ کر اُلٹے پاؤں بھاگنے پر مجبور ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ سب سے بڑا گھونسلا مُنہ دھونے کی ٹیبل کے اُوپر تھا۔ بانس اس طرح وہاں کھڑا کر دیا گیا کہ اُس کا سرا ٹھیک ٹھیک گھونسلے کے دروازے کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اب گو مستقبل اندیشوں سے خالی نہ تھا۔ تاہم طبیعت مطمئن تھی کہ اپنی طرف سے سر و سامانِ جنگ میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔ میر کا یہ شعر زبانوں پر چڑھ کر بہت پامال ہو چکا ہے تاہم موقع کا تقاضا ٹالا بھی نہیں جا سکتا:

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے امیر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اب گیارہ بج رہے تھے۔ میں کھانے کے لیے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو کمرے میں قدم رکھتے ہی ٹھٹک کے رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سارا کمرہ پھر حریف کے قبضے میں ہے اور اس اطمینان و فراغت سے اپنے کاموں میں مشغول ہیں جیسے کوئی حادثہ پیش آیا ہی نہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جس ہتھیار کی ہیبت پر اس درجہ بھروسا کیا گیا تھا۔ وہی حریفوں کی کارجوئیوں کا ایک نیا آلہ ثابت ہوا۔ بانس کا سرا جو گھونسلے سے بالکل لگا ہوا تھا، گھونسلے میں جانے کے لیے اب دہلیز کا کام دینے لگا ہے تنکے چُن چُن کر لاتے ہیں اور اس نوتعمیر دہلیز پر بیٹھ کر بہ اطمینان تمام گھونسلے میں بچھاتے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی چُوں چُوں بھی کرتے جاتے ہیں۔ عجب نہیں یہ مصرعہ گنگنا رہے ہوں:

عدو شود سببِ خیر گر خدا خواہد

اپنی فتح مندیوں کا یہ حسرت انگیز انجام دیکھ کر بے اختیار ہمت نے جواب دے دیا۔ صاف نظر آگیا کہ چند لمحوں کے لیے حریف کو عاجز کر دینا تو آسان ہے مگر اُن کے جوشِ استقامت کا مقابلہ کرنا آسان نہیں اور اب اس میدان میں ہار مان لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا:

بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است!

اب یہ فکر ہوئی کہ ایسی رسم و راہ اختیار کرنی چاہیے کہ ان ناخواندہ مہمانوں کے ساتھ ایک گھر میں گزارا ہو سکے۔ سب سے پہلے چارپائی کا معاملہ سامنے آیا۔ یہ بالکل نئی تعمیرات کی زد میں تھی۔ پُرانی عمارت کے گرنے اور نئی تعمیروں کے سروسامان سے جس قدر گرد و غبار اور کوڑا کرکٹ نکلتا، سب کا سب اسی پر گرتا اس لیے اسے دیوار سے اتنا ہٹا دیا گیا کہ براہِ راست زد میں نہ رہے۔ اس تبدیلی سے کمرے کی

شکل ضرور بگڑ گئی، لیکن اب اس کا علاج ہی کیا تھا؟ جب خود اپنا گھر ہی اپنے قبضے میں نہ رہا تو پھر شکل و ترتیب کی آرائشوں کی کسے فکر ہو سکتی تھی؟ البتہ مُنہ دھونے کے ٹیبل کا معاملہ اتنا آسان نہ تھا۔ وہ جس گوشے میں رکھا گیا تھا، صرف وہی جگہ اس کے لیے نکل سکتی تھی۔ ذرا بھی ادھر اُدھر کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ مجبوراً یہ انتظام کرنا پڑا کہ بازار سے بہت سے جھاڑن منگوا کر رکھ لیے اور ٹیبل کی ہر چیز پہ ایک ایک جھاڑن ڈال دیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اُنھیں اٹھا کر جھاڑ دیتا اور پھر ڈال دیتا۔ ایک جھاڑن اس غرض سے رکھنا پڑا کہ ٹیبل کی سطح کی صفائی برابر ہوتی رہے۔ سب سے زیادہ مشکل مسئلہ فرش کی صفائی کا تھا لیکن اسے بھی کسی نہ کسی طرح حل کیا گیا۔ یہ بات طے کر لی گئی کہ صبح کی معمولی صفائی کے علاوہ بھی کمرے میں بار بار جھاڑو پھر جانا چاہیے۔ ایک نیا جھاڑو منگوا کر الماری کی آڑ میں چھپا دیا۔ کبھی دن میں دو مرتبہ کبھی تین مرتبہ کبھی اس سے بھی زیادہ اس سے کام لینے کی ضرورت پیش آتی۔ یہاں ہر دو کمرے کے پیچھے ایک قیدی صفائی کے لیے دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہر وقت جھاڑو لیے کھڑا نہیں رہ سکتا تھا اور اگر رہ بھی سکتا تو اس پہ اتنا بوجھ ڈالنا انصاف کے خلاف تھا اس لیے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا کہ خود ہی جھاڑو اٹھا لیا اور ہمسایوں کی نظریں بچا کے جلد جلد دو چار ہاتھ مار دیئے۔ دیکھیے۔ ان ناخواندہ مہمانوں کی خاطر تواضع میں کتنی نک کرنی پڑی:

عشق ازیں بسیار کردست و کند!

ایک دن خیال ہوا کہ جب صلح ہو گئی تو چاہیئے کہ پوری طرح صلح ہو۔ یہ ٹھیک نہیں کہ رہیں ایک ہی گھر میں، اور رہیں بیگانوں کی طرح۔ میں نے باورچی خانے سے تھوڑا سا کچا چاول منگوایا اور جس صوفے پر بیٹھا کرتا ہوں، اس کے سامنے کی دری پر چند دانے چھڑک دیئے۔ پھر اس طرح سنبھل کے بیٹھ گیا جیسے ایک شکاری دام بچھا کے بیٹھ جاتا ہے، دیکھیے، عرفی کا شعر صورتِ حال پر کیسا چسپاں ہوا ہے:

فتادم دام بر کنجشک و شادم، یاد آں ہمت
کہ گر سیمرغ می آمد بدام، آزادی کردم!

کچھ دیر تک تو مہمانوں کی توجہ نہیں ہوئی اور اگر ہوئی بھی تو ایک غلط اندازِ نظر سے معاملہ آگے نہیں بڑھا لیکن پھر صاف نظر آ گیا کہ معشوقانِ ستم پیشہ کے تغافل کی طرح یہ تغافل بھی نظر بازی کا ایک پردہ ہے ورنہ نیلے رنگ کی دری پر سفید سفید ابھرے ہوئے دانوں کی کشش ایسی نہیں کہ کام نہ کر جائے:

حُور و جنّت جلوہ بر زاہد دہد در راہِ دوست
اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

پہلے ایک چڑیا آئی اور اِدھر اُدھر کودنے لگی۔ بظاہر چہچہانے میں مشغول تھی مگر نظر دانوں پر تھی۔ وحشی یزدی کیا خوب کہہ گیا ہے:

چہ لطف ہا کہ دریں شیوۂ نہانی نیست
عنایتے کہ تو داری بمن، بیانی نیست

پھر دوسری آئی اور پہلی کے ساتھ مل کر دری کا طواف کرنے لگی۔ پھر تیسری اور چوتھی بھی پہنچ گئی۔ کبھی دانوں پر نظر پڑتی کبھی دانہ ڈالنے والے پر۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا جیسے آپس میں کچھ مشورہ ہو رہا ہے۔ کبھی معلوم ہوتا ہر فرد غور و فکر میں ڈوبا ہوا ہے آپ نے غور کیا ہوگا کہ گوریا جب تفتیش اور تفحص کی نگاہوں سے دیکھتی ہے، تو اس کے چہرے کا کچھ عجیب سنجیدہ انداز ہو جاتا ہے۔ پہلے گردن اٹھا کے سامنے کی طرف دیکھے گی پھر گردن موڑ کے داہنے بائیں دیکھنے لگے گی، پھر کبھی گردن کو مروڑ کے اوپر کی طرف نظر اٹھائے گی اور چہرے پر تفحص اور استفہام کا کچھ ایسا انداز چھا جائے گا جیسے ایک آدمی ہر طرف متعجبانہ نگاہ ڈال کر اپنے آپ سے کہہ رہا ہو کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ اور کیا ہو رہا ہے؟ ایسی ہی متفحص نگاہیں اس وقت بھی ہر چہرے پر ابھر رہی تھیں۔

پایم بہ پیش از سرِ ایں کوئے می رود
یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست؟

پھر کچھ دیر کے بعد آہستہ آہستہ قدم بڑھنے لگے، لیکن براہِ راست دانوں کی طرف نہیں آڑے ترچھے ہو کر بڑھتے اور کترا کر نکل جاتے۔ گویا یہ بات دکھائی جا رہی تھی کہ خدا نخواستہ ہم دانوں کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں۔ دروغِ راست مانند کی یہ نمائش دیکھ کر بے اختیار ظہوری کا یہ شعر یاد آگیا:

بگو حدیثِ وفا، از تو با دوست، بگو
شوم فدائے دروغے کہ راست مانند ست

آپ جانتے ہیں کہ صید سے کہیں زیادہ صیاد کو اپنی نگرانیاں کرنی پڑتی ہیں۔ جونہی ان کے قدموں کا رُخ دانوں کی طرف پھرا، میں نے دم سادھ لیا۔ نگاہیں دوسری طرف کر لیں، اور سارا جسم پتھر کی طرح بے حس و حرکت بنا لیا۔ گویا آدمی کی جگہ پتھر کی ایک مورتی دھری ہے۔ کیونکہ جانتا تھا، اگر نگاہِ شوق نے مضطرب ہو کر ذرا بھی جلد بازی کی تو شکار دام کے پاس آتے آتے نکل جائے گا۔ یہ گویا نازِ حسن اور نیازِ عشق کے معاملات کا پہلا مرحلہ تھا:

نہاں از و بہ رخش داشتم تماشائے
نظر بہ جانبِ ما کرد و شرمسار شدم

خیر، خدا خدا کر کے اس عشوۂ تغافل نما کے ابتدائی مرحلے طے ہوئے اور ایک مُحبتِ طناز نے صاف صاف دانوں کی طرف رُخ کیا، مگر یہ رُخ بھی کیا قیامت کا رُخ تھا، ہزار تغافل اس کے جلو میں چل رہے تھے۔ میں بے حس و حرکت بیٹھا دل ہی دل میں کہہ رہا تھا:

بہ ہر کجا ناز سر بر آرد، نیاز ہم پائے کم ندارد
تو و خرامے و صد تغافل، من و نگاہے و صد تمنا

ایک قدم آگے بڑھتا تو دو قدم پیچھے ہٹتے تھے۔ میں جی ہی جی میں کہہ رہا تھا کہ التفات

تغافل کا یہ ملا جلا انداز بھی کیا خوب ہے۔ کاش تھوڑی سی تبدیلی اس میں کی جا سکتی۔ دو قدم آگے بڑھتے، ایک قدم پیچھے ہٹتا۔ غالب کیا خوب کہہ گیا ہے:

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد

ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا!

التفات و تغافل کی ان عشوہ گریوں کی ابھی جلوہ فروشی ہو رہی تھی کہ ناگہاں ایک تنومند چڑے نے جو اپنی قلندرانہ بے دماغی اور رندانہ جرأتوں کے لحاظ سے پورے حلقے میں ممتاز تھا، سلسلۂ کار کی درازی سے اکتا کر بے باکانہ قدم اٹھا دیا اور زبانِ حال سے یہ نعرۂ مستانہ لگاتا ہوا بہ یک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا:

زدیم بر صفِ رندان و ہر چہ بادا باد!

اس ایک قدم کا اٹھنا تھا کہ معلوم ہوا جیسے اچانک تمام رکے ہوئے قدموں کے بندھن کھل پڑے۔ اب نہ کسی قدم میں جھجک تھی نہ کسی نگاہ میں تذبذب۔ مجمع کا مجمع بہ یک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا، اور اگر انگریزی محاورے کی تعبیر مستعار لی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ حجاب و تامل کی ساری برف اچانک ٹوٹ گئی یا یوں کہیے کہ پگھل گئی۔ غور کیجیے تو اس کارگاہِ عمل کے ہر گوشے کی قدم رانیاں ہمیشہ اسی ایک قدم کے انتظار میں رہا کرتی ہیں۔ جب تک یہ نہیں اٹھتا، سارے قدم زمین میں گڑے رہتے ہیں، یہ اٹھا اور گویا ساری دنیا اچانک اٹھ گئی:

نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد

اس بزمِ سود و زیاں میں کامرانی کا جام کبھی کوتاہ دستوں کے لیے نہیں بھرا گیا۔ وہ ہمیشہ انہی کے حصے میں آیا جو خود بڑھ کر اٹھا لینے کی جرأت رکھتے تھے۔ شاد عظیم آبادی مرحوم نے ایک شعر کیا خوب کہا تھا:

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

اس جھپٹے کا یہ بیباکانہ اقدام کچھ ایسا دل پسند واقع ہوا کہ اسی وقت دل نے ٹھان لی اس مردِ کار سے رسم و راہ بڑھانی چاہیے۔ میں نے اس کا نام قلندر رکھ دیا کیونکہ بے دماغی اور وارستگی کی سرگرانیوں کے ساتھ ایک خاص طرح کا بانکپن بھی ملا ہوا تھا اور اس کی وضع قلندرانہ کو آب و تاب دے رہا تھا :

رہے اِک، بانکپن بھی بے دماغی میں تو زیبا ہے
بڑھا دو چینِ ابرو پر ادائے کجکلاہی کو!

دو تین دن تک اسی طرح ان کی خاطر تواضع ہوتی رہی۔ دن میں دو تین مرتبہ دانے دری پر ڈال دیتا۔ ایک ایک کر کے آتے اور ایک ایک دانہ چن لیتے۔ کبھی دانہ ڈالنے میں دیر ہو جاتی تو قلندر آ کر چوں چوں کرنا شروع کر دیتا کہ وقتِ موعود گزر رہا ہے۔ اس صورتِ حال نے اب اطمینان دلا دیا کہ پردۂ حجاب اٹھ چکا۔ وہ وقت دُور نہیں کہ رہی سہی جھجک بھی نکل جائے گی۔

اور کُھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

چند دنوں کے بعد میں نے اس معاملے کا دوسرا قدم اٹھایا۔ سگرٹ کے خالی ٹین کا ایک ڈھکنا لیا۔ اس میں چاول کے دانے ڈالے اور ڈھکنا دری کے کنارے رکھ دیا۔ فوراً مہمانوں کی نظر پڑی۔ کوئی ڈھکنے کے پاس آ کر منہ مارنے لگا، کوئی ڈھکنے کے کنارے پر چڑھ کر زیادہ جمعیتِ خاطر کے ساتھ چگنے میں مشغول ہو گیا۔ آپس میں رقیبانہ رد و کد بھی ہوتی رہی۔ جب دیکھا کہ اس طریقِ ضیافت سے طبیعتیں آشنا ہو گئی ہیں تو دوسرے دن ڈھکنا دری کے کنارے سے کچھ ہٹا کر رکھا۔ تیسرے دن اور زیادہ ہٹا دیا اور بالکل اپنے سامنے رکھ دیا۔ گویا اس طرح بتدریج بُعد سے قرب کی طرف معاملہ بڑھ رہا تھا۔ دیکھیے بُعد و قرب کے معاملے نے عالیہ بنت المہدی کا مطلع یاد دلا دیا :

وحَبِّب، فان الحب داعیة الحب
وکم من بعید الدار مستوجب القرب

اتنا قریب دیکھ کر پہلے تو مہمانوں کو کچھ تامّل ہوا۔ دری کے پاس آگئے مگر قدموں کی جھجک تھی اور نگاہوں میں تذبذب بول رہا تھا، لیکن اتنے میں قلندر اپنے قلندرانہ نعرے لگاتا ہُوا آ پہنچا اور اس کی رندانہ جرأتیں دیکھ کر سب کی جھجک دُور ہوگئی۔ گویا اس راہ میں قلندر رہی کے پیرو ہوئے۔ جہاں اس کا قدم اُٹھا، سب کے سب اُٹھ گئے۔ وہ دانوں پر چونچ مارتا پھر سر اُٹھا کے اور سینہ تان کے زبانِ حال سے مترنم ہوتا:

وما الدهر، الا من رواة قصائدی
اذا قلت شعراً، اصبح الدهر منشدا

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تو پھر ایک قدم اور اٹھایا گیا اور دانوں کا برتن دری سے اُٹھا کے تپائی پر رکھ دیا۔ یہ تپائی میرے بائیں جانب صوفے سے لگی رہتی ہے اور پوری طرح میرے ہاتھ کی زد میں ہے۔ اس تبدیلی سے خوگر ہونے میں کچھ دیر لگی۔ بار بار آتے اور تپائی کا چکر لگا کے چلے جاتے۔ بالآخر یہاں بھی قلندر ہی کو پہلا قدم بڑھانا پڑا اور اس کا بڑھنا تھا کہ یہ منزل بھی پچھلی منزلوں کی طرح سب پر کھُل گئی۔ اب تپائی کبھی تو ان کی مجلس آرائیوں کا ایوانِ طرب بنتی کبھی باہمی معرکہ آرائیوں کا اکھاڑا۔

جب اس قدر نزدیک آجانے کے خوگر ہو گئے تو میں نے خیال کیا، اب معاملہ کچھ اور آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ ایک دن صبح یہ کیا کہ چاول کا برتن صوفے پر ٹھیک اپنی بغل میں رکھ دیا اور پھر لکھنے میں اس طرح مشغول ہو گیا گویا اس معاملے سے کوئی سروکار نہیں:

دل و جانم بہ تو مشغول و نظر در چپ و راست
تا نہ دانند رقیباں کہ تو منظورِ منی!

تھوڑی دیر کے بعد کیا سنتا ہوں کہ زور زور سے چونچ مارنے کی آواز آرہی ہے۔ کنکھیوں سے دیکھا تو معلوم ہُوا کہ ہمارا پرانا دوست قلندر پہنچ گیا ہے اور بے تکان چونچ مار رہا ہے۔ ڈھکنا چونکہ بالکل پاس دھرا تھا اس لیے اُس کی دُم میرے گھٹنے کو چھو رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے یارانِ تیز گام بھی پہنچ گئے اور پھر تو یہ حال ہو گیا کہ ہر وقت دو تین دستو

کا حلقۂ بے تکلف میرے بغل میں اُچھل کود کرتا رہتا۔ کبھی کوئی صوفے کی پُشت پر چڑھ جاتا کبھی کوئی جست لگا کر کتابوں پر کھڑا ہو جاتا، کبھی نیچے اُتر آتا اور چُوں چُوں کر کے پھر واپس آجاتا۔ بے تکلفی کی اچھل کود میں کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ میرے کاندھے کو درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ سمجھ کر اپنی جست وخیز کا نشانہ بنانا چاہا۔ لیکن پھر چونک کر پلٹ گئے یا پنجوں سے اسے چھُوا اور اُوپر ہی اُوپر نکل گئے۔ گویا ابھی معاملہ اُس منزل سے آگے نہیں بڑھا تھا جس کا نقشہ وحشی یزدی نے کھینچا ہے :

هنوز عاشقی و دلربائی نہ شدہ است هنوز زوری و مرد آزمائیے نہ شدہ است
همیں تواضع عام ست حُسن را با عشق میانِ ناز و نیاز آشنائیے نہ شدہ است

بہر حال رفتہ رفتہ ان آہوانِ ہوائی کو یقین ہو گیا کہ یہ صورت ہمیشہ صوفے پر دکھائی دیتی ہے، آدمی ہونے پر بھی آدمیوں کی طرح خطرناک نہیں ہے۔ دیکھئے محبت کا افسوں جو انسانوں کو رام نہیں کر سکتا۔ وحشی پرندوں کو رام کر لیتا ہے :

درسِ وفا اگر بُود زمزمۂ محبتے
جمعہ بہ مکتب آورد طفلِ گریز پائے را

بارہا ایسا ہوا کہ میں اپنے خیالات میں محو لکھنے میں مشغول ہوں۔ اتنے میں کوئی دلنشیں بات نوکِ قلم پر آگئی، یا عبارت کی مناسبت نے اچانک کوئی پُرکیف شعر یاد دلادیا اور بے اختیار اُس کی کیفیت کی خود رفتگی میں میرا سر وشانہ ہلنے لگے یا مُنہ سے "ہا" نکل گیا اور یکایک زور سے پروں کے اُڑنے کی ایک پھُرسی آواز سنائی دی۔ اب جو دیکھتا ہوں تو معلوم ہوا کہ ان یارانِ بے تکلف کا ایک طائفہ میری بغل میں بیٹھا بے تامل اپنی اچھل کود میں مشغول تھا۔ اچانک اُنھوں نے دیکھا کہ یہ پتھر اب ہلنے لگا ہے تو گھبرا کر اُڑ گئے۔ عجب نہیں کہ اپنے جی میں کہتے ہوں۔ یہاں صوفے پر ایک پتھر پڑا رہتا ہے لیکن کبھی کبھی آدمی بن جاتا ہے۔

ابوالکلام

مکتوب

قلعۂ احمد نگر

۱۸ مارچ ۱۹۴۳ء

صدیقِ مکرم

کل جو کہانی شروع ہوئی تھی وہ ابھی ختم کہاں ہوئی؟ آیئے آج آپ کو اِس "منطق الطیر" کا ایک دوسرا باب سناؤں۔ معلوم نہیں، اگر آپ سنتے ہوتے تو شوق ظاہر کرتے یا اُکتا جاتے؟ لیکن اپنی طبیعت کو دیکھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے داستان سرائیوں سے تھکنا بالکل بھول گئی ہو۔ داستانیں جتنی پھیلتی جاتی ہیں، ذوقِ داستان سرائی اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے:

فرخندہ شبے باید و خوش مہتابے
تا با تو حکایت کنم از ہر بابے

ان یارانِ سقف و محاریب میں اور مجھ میں اب خوف و تذبذب کا ایک ہلکا سا پردہ حائل رہ گیا تھا، چند دنوں میں وہ بھی اُٹھ گیا۔

اُنھیں چھت سے صوفے پر اترنے کے لیے چند درمیانی منزلوں کی ضرورت تھی۔ اب یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ پہلی منزل کا کام پنکھے کے دستوں سے لیتے اور دوسری کا میرے سر اور کاندھوں سے۔ باہر سے اڑتے ہوئے کمرے میں آتے اور سیدھے اپنے گھونسلے میں آتے۔ پھر وہاں سے سر نکال کر ہر طرف نظر دوڑاتی اور پورے کمرے کا جائزہ لے لیا۔ پھر وہاں سے اُڑے اور سیدھے پنکھے کے دستے پر پہنچ گئے۔ پھر دستے سے جو کُودے تو کبھی میرے سر کو اپنے قدموں کی جولانگاہ بنایا کبھی کاندھوں کو اپنے جلوس سے عزت بخشی۔ دیکھیے، ان چڑیوں نے نہیں معلوم کتنے برسوں کے بعد مومن خاں کا ترکیب بند یاد دلا دیا:

جولاں کو ہے اُس کی قصدِ پامال
اے خاک! نوید سرفرازی

پہلی دفعہ تو اس ناگہانی نزولِ اجلال نے مجھے چونکا دیا تھا اور شرمندگی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ چونک کر بل گیا تھا۔ قدرتی طور پر ان آشنایانِ زود گسل پر یہ ناقدرشناسی گراں گزری ہوگی لیکن یہ جو کچھ ہوا، محض ایک اضطراری سہو تھا۔ طبیعت فوراً متنبہ ہوگئی اور پھر تو سر اور کاندھا کچھ ایسا بے حس ہو کر رہ گیا کہ منائے کی چھتری کی جگہ بالاخانے کا کام دینے لگا۔ پنکھے سے اتر کر سیدھے کاندھے پر پہنچتے، کچھ دیر چہچہاتے اور پھر کود کر صوفے پر پہنچ جاتے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ کاندھے سے جست لگائی اور سر پر جا بیٹھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آتشی قندھاری نے اپنی آنکھوں کی کشتی بنائی تھی۔ بدایونی نے اس کا یہ شعر نقل کیا ہے:

سرشکم رفتہ رفتہ بے تو دریا شد، تماشا کن
بیا، در کشتیِ چشمم نشین و سیرِ دریا کن

اور ہمارے سوداؔ کو تامل ہوا تھا:

آنکھوں میں دوں اُس آئنہ رُو کو جگہ و لے
ٹپکا کرے ہے بسکہ یہ گھر، نم بہت ہے یاں

لیکن میری زبان کو شیخ شیراز کی التجائے نیاز مستعار لینی پڑی:

گر بر سر و چشمِ من نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تو خیال ہوا کہ اب ایک اور تجربہ بھی کیوں نہ کر لیا جائے؟ ایک دن صبح میں نے دانوں کا برتن کچھ دیر تک نہیں رکھا۔ جہمانِ باصفا بار بار آئے اور جب سفرۂ ضیافت دکھائی نہیں دیا تو ادھر اُدھر چکّر لگانے اور شور مچانے لگے۔ اب میں نے برتن نکال کے ہتیلی پر رکھ لیا اور ہتیلی صوفے پر رکھ دی۔ سچ نہی قلندر کی

نظر پڑی، معاً جست لگائی اور ایک چکر لگا کے انگوٹھے پر آ کھڑا ہوا اور پھر تیزی کے ساتھ دانوں پر چونچ مارنے لگا۔ اس تیزی میں کچھ تو طبع قلندرانہ کا قدرتی تقاضا تھا اور کچھ یہ وجہ بھی ہوگی کہ دیر تک دانوں کا انتظار کرنا پڑا تھا۔ چونچ کی تیز ضربوں سے دانے اڑ اڑ کر ڈھکنے سے باہر گرنے لگے۔ ایک دانہ انگلی کی جڑ کے پاس بھی گر گیا۔ اس نے فوراً وہاں بھی ایک چونچ ماردی اور ایسی خارا شگاف ماری کہ کیا کہوں، اگر ستم پیشوں کے جور و جفا کا خوگر نہ ہو چکا ہوتا تو یقین کیجیے، بے اختیار منہ سے ایک چیخ نکل جاتی:

من کشتۂ کرشمۂ مژگاں کہ بر جگر
خنجر زد آں چناں کہ نگہ را خبر نہ شد

اب میں نے ہتھیلی برتن سمیت اوپر اٹھالی اور ہوا میں معلق کردی۔ تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ ایک اور چڑیا آئی۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کا نام موتی ہے۔ موتی نے ہتھیلی کے اوپر ایک دو چکر لگائے اور رک گئی۔ گویا اندازہ کرنا چاہتی تھی کہ اس جزیرے پر اترنے کے لیے محفوظ جگہ کون سی ہوگی۔ پھر دوبارہ آئی اور کہنی کے پاس اتر کر سیدھی پہنچے تک پہنچ گئی اور پہنچے سے ہتھیلی کی خاکنائے پر اتر کر بے تکان منقار درازیاں شروع کردیں۔ اس میں کوئی دانہ قاب کے باہر گر گیا تو چونچ کا ایک نشتر اس پر بھی لگا دیا۔ دیکھیے "دست درازی" کی ترکیب میں تصرف کرکے مجھے منقار درازی کی ترکیب وضع کرنی پڑی۔ جانتا ہوں کہ محاورات میں تصرفات کی گنجائش نہیں ہوتی مگر کیا کیا جائے، سابقہ ایسے یارانِ کوتہ آستین سے آ پڑا جو ہاتھ کی جگہ منہ سے "دراز دستیاں" کرتے ہیں:

دراز دستیٔ ایں کوتہ آستیناں بیں!

لیکن اس آخری تجربے نے طبع کاوش پسند کو ایک دوسری ہی فکر میں ڈال دیا۔ ذوقِ عشق کی اس کوتاہی پر شرم آئی کہ ہتھیلی موجود ہے اور میں نامراد ٹین کے ڈھکنے پر ان منقاروں کی نشتر زنی ضائع کر رہا ہوں۔ میں نے دوسرے دن ٹین کا ڈھکنا ہٹا دیا۔ چاول کے دانے ہتھیلی پر رکھے اور ہتھیلی پھیلا کر صوفے پر رکھ دی۔ سب سے پہلے موتی آئی اور گردن

اُٹھا اٹھا کے دیکھنے لگی کہ آج ڈھکنا کیوں دکھائی نہیں دیتا ہے یہ اس بستی کی سب سے زیادہ خوبصورت چڑیا ہے۔ آج کل حسن کی نمائشوں میں خوبروئی اور دلآویزی کا جو فقتہ گر سب سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے اُسے پُورے ملک کی نسبت سے موسوم کردیا کرتے ہیں مثلاً کہیں گے مس انگلینڈ، مادی موزیل Madamoiselle فرانس۔ گویا ایک حسین چہرے کے چمکنے سے سارے ملک و قوم کا چہرہ چمک اُٹھتا ہے:

کنند خویش و تبار از تو نازو می زیبد
بہ حسنِ یک تن اگر صد قبیلہ ناز کند!

اگر یہ طریقہ موقی کے لیے کام میں لایا جائے تو اسے مادام قلعہ احمد نگر سے موسوم کر سکتے ہیں:

ایں نگاہیست کہ شائستہ دیدارے ہست!

چھریرا بدن، نکلتی ہوئی گردن، مخروطی دُم اور گول گول آنکھوں میں ایک عجیب طرح کا بوتا ہوا بھولاپن۔ جب دانہ چُگنے کے لیے آئے گی تو ہر دانے پر میری طرف دیکھتی جائے گی۔ ہم دونوں کی زبانیں خاموش رہتی ہیں، مگر نگاہیں گویا ہوگئی ہیں۔ وہ میری نگاہوں کی بولی سمجھنے لگی ہے، میں نے اُس کی نگاہوں کو پڑھنا سیکھ لیا ہے۔ ہاں، وحشی یزدی نے ان معاملات کو کیا ڈوب کر کہا ہے:

کرشمہ گرمِ سوال است، لب مکن رنجہ
کہ احتیاج بہ پُرسیدن زبانی نیست

بہرحال اس موقع پر بھی اُس کی بے ساختہ نگاہوں نے مجھ سے کہا اور پھر بغیر کسی جھجک کے جسرت لگا کے انگوٹھے کی جڑ پر آکھڑی ہوئی اور دانوں پر چونچ مارنا شروع کردیا۔ یہ چونچ نہیں تھی نشتر کی نوک تھی، جو اگر چاہتی تو ہتھیلی کے آر پار ہو جاتی مگر صرف چھ کے لگا لگا کے رُک جاتی تھی:

یک ناوکِ کاری ز کمانِ تو نہ خوردم
ہر زخمِ تو محتاج بہ زخمِ دگرم کرد

ہر مرتبہ گردن موڑ کے میری طرف دیکھتی بھی جاتی تھی گویا پوچھ رہی تھی کہ درد تو نہیں ہوتا؟ بھلا میں، جاں باختہ لذّتِ الم اس کا کیا جواب دیتا؟

این سخن را چہ جواب ست، تو ہم میدانی!

مرزا صائب کا یہ شعر آپ کی نگاہوں سے گزرا ہو گا:

خویش را بر نوکِ مژگانِ ستم کیشاں زدم
آں قدر زخمے کہ دل می خواست در خنجر نہ بُود

مجھے اس میں اس قدر تصرّف کرنا پڑا کہ مژگاں کی جگہ "منقار" کر دیا:

خویش را بر نوکِ منقارِ ستم کیشاں زدم
آں قدر زخمے کہ دل می خواست در خنجر نہ بُود

درد کا حال تو معلوم نہیں، مگر چونچ کی ہر ضرب جو پڑتی تھی، ہتھیلی کی سطح پر ایک گہرا زخم ڈال کے اُٹھتی تھی:

رسیدن ہائے منقارِ ہُما بر استخواں غالبؔ
پس از عمرے بہ یادم داد رسم و راہِ یکاں را

اس بستی کے اگر عام باشندوں سے قطعِ نظر کر لی جائے تو خواص میں چند شخصیتیں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ قلندر اور موتی سے آپ کی تقریب ہو چکی ہے۔ اب مختصراً مُلّا اور صوفی کا حال بھی سُن لیجیے۔ ایک چڑا ہے بڑا ہی تنومند اور جھگڑالو ہے۔ جب دیکھو زبان فرفر چل رہی ہے اور سر اُٹھا ہوا اور سینہ تنا ہوا رہتا ہے۔ جو بھی سامنے آ جائے دو دو ہاتھ کیے بغیر نہیں رہے گا۔ کیا مجال کہ ہمسایہ کا کوئی چڑا اس محلّے کے اندر قدم رکھ سکے۔ کئی شہ زوروں نے ہمّت دکھائی لیکن پہلے ہی مقابلے میں چت ہو گئے۔ جب کبھی فرش پر یارانِ شہر کی مجلس آراستہ ہوتی ہے تو یہ سر و سینہ کو جنبش دیتا ہوا اور دہنے بائیں نظر ڈالتا ہوا فوراً آ موجود ہوتا ہے اور آتے ہی اُچک کر کسی بلند جگہ پر پہنچ جاتا ہے۔ پھر اپنے شیوۂ خاص میں اِس تسلسل کے ساتھ چوں چاں، چُوں شروع کر دیتا ہے کہ ٹھیک ٹھیک قاآنی کے واعظکِ جامع کا

نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے :

دی واعظکے آمد در مسجد جامع ! | چُوں برف ہمہ جامہ سپید از پا تا سر
چشمش بہ سوئے چپ، و چشمش بہ سوئے راست | تا خود کسے سلامے کند از منعم و مضطر
زاں ساں کہ خرامد بہ رسن مرد رسن باز | آہستہ خرامیدی و موزون و موقر
فارغ نہ شدہ خلق ز تسلیم و تشہد | بر جست چو بوزینہ و بنشست بہ منبر
وانگہ بہ سر و گردن و ریش و لب و بینی | بس عشوہ بیاوردہ سخن کرد چنیں سر

فرمائیے ! اگر اس کا نام مُلّا نہ رکھتا تو اور کیا رکھتا؟ ٹھیک اس کے برعکس ایک دُوسرا چِڑا ہے۔ تعرف الاشیاء باضدادھا، اسے جب دیکھیے اپنی حالت میں گُم اور خاموش ہے۔

کاں را کہ خبر شد، خبرش باز نیامد

بہت کیا تو کبھی کبھار ایک ہلکی سی ناتمام چُوں کی آواز نکال دی اور اس ناتمام چُوں کا بھی انداز لفظ و سخن کا سا نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسی آواز ہوتی ہے جیسے کوئی آدمی سر جھکائے اپنی حالت میں گُم پڑا رہتا ہو اور کبھی کبھی سر اُٹھا کے "ہا" کہہ دیتا ہو :

تا تو بیدار شوی، نالہ کشیدم، ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

دوسرے چڑے اس کا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔ گویا اس کی کم سخنی سے عاجز آگئے ہیں۔ پھر بھی اس کی زبان کھلتی نہیں۔ البتہ نگاہوں پر کان لگایئے تو اُن کی صدائے خاموشی سُنی جاسکتی ہے :

تو نظر باز نۂ، ورنہ تغافل نگہ ست
تو زباں فہم نۂ، ورنہ خموشی سخن ست !

میں نے یہ حال دیکھا تو اس کا نام صُوفی رکھ دیا، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تلقب :

جامۂ بود کہ بر قامتِ او دوختہ بود !

صبح جب اس بستی کے تمام باشندے باہر نکلتے ہیں تو برآمدے اور میدان میں عجیب چہل پہل ہونے لگتی ہے۔ کوئی پھُول کے گملوں پر کُودتا پھرتا ہے کوئی کروٹن کی شاخوں میں

جھولا جھولنے لگتا ہے۔ ایک جوڑے نے غسل کا تہیہ کیا اور اس انتظار میں رہا کہ کب پھولوں کے تختوں میں پانی ڈالا جاتا ہے۔ جونہی پانی ڈالا گیا اور فوراً حوض میں اتر گیا اور پروں کو تیزی کے ساتھ کھولنے اور بند کرنے لگا۔ ایک دوسرے جوڑے کو آس پاس پانی نہیں ملا، تو فتیمّموا صعیداً طیّباً پڑھتا ہوا مٹی ہی میں نہانا شروع کر دیا۔ پہلے چونچ مار مار کے اتنی مٹی کھود ڈالی کہ سینے تک ڈوب سکے۔ پھر اس گڑھے میں بیٹھ کر اس طرح پاکوبیاں اور پرافشانیاں شروع کر دیں کہ گرد و خاک کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ فاصلے پر مُلّا حسبِ معمول کسی حریف سے کشتی لڑنے میں مشغول ہے۔ ان کے لڑنے کی خود فروشیوں کا بھی کچھ عجیب حال ہوتا ہے:

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں!

یعنی ہاتھ کو دیکھیے تو ہتھیار سے یک قلم خالی ہے، بلکہ سرے سے ہاتھ ہے ہی نہیں:

دہن کا ذکر کیا، یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے!

مگر چونچ کو دیکھیے تو سارے ہتیاروں کی کمی پوری کر رہی ہے۔ جوشِ غضب میں آ کر اس طرح ایک دوسرے سے گتھ جائیں گے کہ ایک کو دوسرے سے تمیز کرنا دشوار ہو جائے گا گویا "جدالِ سعدی با مدعی در بیانِ توانگری و درویشی" کا منظر آنکھوں میں پھر جائے گا۔

او در من و من درو فتادہ

ہوا میں جب کشتی لڑتے ہوئے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوتے ہیں تو انھیں اس کا بھی ہوش نہیں رہتا کہ کہاں گر رہے ہیں۔ کئی مرتبہ میرے سر پر گر پڑے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ٹھیک میری گود میں آ کر پڑ گئے۔ میں نے ایک کو ایک ہاتھ سے دوسرے کو دوسرے سے پکڑ لیا،

میرے دونوں ہاتھ نکلے کام کے

سارا جسم مٹھی میں بند تھا۔ صرف گردنیں نکلی ہوئی تھیں، دل اس زور سے دھڑ دھڑ کر رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا اب پھٹا، اب پھٹا لیکن اس پر بھی ایک دوسرے کو چونچ مارنے سے باز نہیں رہ سکتے تھے۔ جب میں نے مٹھیاں کھول دیں تو پھر سے اڑ کر پنکھے کے ڈنڈے پر جا بیٹھے اور

دیر تک چوں چوں کرتے رہے۔ غالباً ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے:

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت!

موتی کے گھونسلے سے ایک بچے کی آواز عرصے سے آ رہی تھی۔ وہ جب دانوں پر چونچ مارتی تو ایک دو دانوں سے زیادہ نہ لیتی اور فوراً گھونسلے کا رُخ کرتی۔ وہاں اُس کے پہنچتے ہی بچے کا شور شروع ہو جاتا۔ ایک دو سیکنڈ کے بعد پھر آتی اور دانہ لے کر اُڑ جاتی۔ ایک مرتبہ میں نے گنا تو ایک منٹ کے اندر سات مرتبہ آئی گئی۔

جن علماء علم الحیوان نے اس جنس کے پرندوں کے خصائص کا مطالعہ کیا ہے اُن کا بیان ہے کہ ایک چڑیا دن بھر کے اندر ڈھائی سو سے تین سو مرتبہ تک بچے کو غذا دیتی ہے اور اگر دن بھر کی مجموعی مقدار غذا بچے کے جسم کے مقابلے میں رکھی جائے تو اُس کا حجم کسی طرح بھی بچے کے جسمانی حجم سے کم نہ ہوگا۔ مگر بچوں کی قوتِ ہاضمہ اس تیزی سے کام کرتی رہتی ہے کہ اِدھر دانہ اُن کے اندر گیا اور اُدھر تحلیل ہونا شروع ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ پرندوں کے بچوں کے نشو و نما کا اوسط چارپایوں کے بچوں کے اوسط سے بہت زیادہ ہوتا ہے اور بہت تھوڑی مدت کے اندر وہ بلوغ تک پہنچ جاتے ہیں۔ موتی کی رفتارِ عمل سے مجھے اس بیان کی پوری تصدیق مل گئی۔

پھر جوں جوں بچوں کے پر بڑھنے لگتے ہیں، وجدان کا فرشتہ آتا ہے اور ماں کے کان میں سرگوشیاں شروع کر دیتا ہے کہ اب اُنھیں اُڑنے کا سبق سکھانا چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے، موتی کے کانوں میں یہ سرگوشی شروع ہو گئی تھی۔ ایک دن صبح کیا دیکھتا ہوں گھونسلے سے اُڑتی ہوئی اُتری تو اُس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ بھی ادھوری پرواز کے پر و بال کے ساتھ نیچے گر گیا۔ موتی بار بار اُس کے پاس جاتی اور اُڑنے کا اشارہ کر کے اُوپر کی طرف اُڑنے لگتی لیکن بچے میں اثر پذیری کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ پر پھیلائے، آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میں نے اُسے اُٹھا کے دیکھا تو معلوم ہوا، ابھی پر پوری طرح بڑھے نہیں ہیں۔ گرنے کی چوٹ کا اثر بھی تازہ ہے اور اس

نے بے حال کر دیا ہے بے اختیار نظیری کا شعر یاد آ گیا:

بہ وصلش تا رسم، صد بار بر خاک افگند شوقم
کہ نو پروازم و شاخِ بلندے آشیاں دارم

بہر حال اُسے اُٹھا کے دری پر رکھ دیا۔ موتی چاول کے ٹکڑے چُن چُن کر مُنہ میں لیتی اور اُسے کھلا دیتی۔ وہ مُنہ کھولتے ہوئے چُوں چُوں کی ایک مدھم اور اکھڑی سی آواز نکال دیتا اور پھر دم بخود آنکھیں بند کیے پڑا رہتا۔ پورا دن اسی حالت میں نکل گیا۔ دوسرے دن بھی اس کی حالت ویسی ہی رہی۔ ماں صبح سے لے کر شام تک برابر اُڑنے کی تلقین کرتی رہی مگر اس پر کچھ ایسی مُردنی سی چھا گئی تھی کہ کوئی جواب نہیں ملتا۔ میرا خیال تھا کہ یہ اب بچے گا نہیں لیکن تیسرے دن صبح کو ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔ دھوپ کی ایک لکیر کمرے کے اندر دُور تک چلی گئی تھی۔ یہ اس میں جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ پر گرے ہوئے، پاؤں مڑے ہوئے، آنکھیں حسبِ معمول بند تھیں۔ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ یکایک آنکھیں کھول کر ایک جھرجھری سی لے رہا ہے۔ پھر گردن آگے کر کے فضا کی طرف دیکھنے لگا پھر گرے ہوئے پروں کو سکیڑ کر ایک دو مرتبہ کھولا بند کیا، اور پھر جو ایک مرتبہ جست لگا کر اڑا، تو یہ یک دفعہ تیر کی طرح میدان میں جا پہنچا اور پھر ہوائی کی طرح فضا میں اُڑ کر نظروں سے غائب ہو گیا۔ یہ منظر اس درجہ عجیب اور غیر متوقع تھا کہ پہلے تو مجھے اپنی نگاہوں پر شبہہ ہونے لگا، کہیں کسی دوسری چڑیا کو اڑتے دیکھ کر دھوکے میں نہ پڑ گیا ہوں لیکن ایک واقعہ جو ظہور میں آ چکا تھا۔ اب اُس میں شبہے کی گنجائش کہاں باقی رہی تھی؟ کہاں تو بے حالی اور درماندگی کی یہ حالت کہ دو دن تک ماں سر کھپاتی رہی مگر زمین سے بالشت بھر بھی اونچا نہ ہو سکا، اور کہاں آسمان پیمائیوں کا یہ انقلاب انگیز جوش کہ پہلی ہی اڑان میں عالمِ حدود و قیود کے سارے بندھن توڑ ڈالے اور فضائے لاتناہی کی ناپیدا کنار وسعتوں میں گم ہو گیا! کیا کہوں، اس منظر نے کیسی خود رفتگی کی حالت طاری کر دی تھی۔ بے اختیار یہ شعر زبان پر آ گیا تھا اور اس جوش و خروش کے ساتھ آیا تھا کہ ہمسائے چونک اُٹھے تھے:

نیروئے عشق بیں کہ دریں دشتِ بیکراں
گامے نہ رفتہ ایم و بہ پایاں رسیدہ ایم

دراصل یہ کچھ نہ تھا، زندگی کی کرشمہ سازیوں کا ایک معمولی سا تماشا تھا جو ہمیشہ ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرتا رہتا ہے مگر ہم اُسے سمجھنا نہیں چاہتے۔ اس چڑیا کے بچے میں اُڑنے کی استعداد اُبھر چکی تھی۔ وہ اپنے کُنجِ نشیمن سے نکل کر فضاءِ آسمانی کے سامنے آکھڑا ہوا تھا مگر ابھی تک اُس کی خودشناسی کا احساس بیدار نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی حقیقت سے بے خبر تھا۔ ماں بار بار اشارے کرتی تھی، ہوا کی لہریں بار بار پروں کو چھوتی ہوئی گزر جاتی تھیں، زندگی اور حرکت کا ہنگامہ ہر طرف سے آآ کر بڑھاوے دیتا تھا، لیکن اس کے اندر کا مُجوِلھا کچھ اس طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا کہ باہر کی کوئی گرمجوشی بھی اسے گرم نہیں کر سکتی تھی:

کلیم شکوہ ز توفیقِ چند؟ شرمت باد
تو چوں گل بہ رہ نہ نہی پائے، رہنما چہ کند

لیکن جونہی اُس کی سوئی ہوئی خودشناسی جاگ اُٹھی اور اسے اس حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا کہ "میں اڑنے والا پرند ہوں"۔ اچانک قالبِ بے جان کی ہر چیز از سرِ نو جاندار بن گئی۔ وہی جسمِ زار جو بے طاقتی سے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا، اب سرو قد کھڑا تھا۔ وہی کانپتے ہوئے گھٹنے جو جسم کا بوجھ بھی سہار نہیں سکتے تھے۔ اب تن کر سیدھے ہو گئے تھے۔ وہی گرے ہوئے پر، جن میں زندگی کی کوئی تڑپ دکھائی نہیں دیتی تھی، اب سمٹ سمٹ کر اپنے آپ کو تولنے لگے تھے۔ چشم زدن کے اندر جوشِ پرواز کی ایک برق وار تڑپ نے اُس کا پورا جسم ہلا کر اُچھال دیا اور پھر جو دیکھا تو درماندگی اور بے حالی کے سارے بندھن ٹوٹ چکے اور مرغِ ہمت لعقاب وار فضاءِ لاانتہاہی کی لاانتہائیوں کی پیمائش کر رہا تھا۔ وللّٰہ درّ ما قال:

بال بکشا و صفیر از شجرِ طوبیٰ زن
حیف باشد چو تو مرغے کہ اسیرِ قفسی!

گویا بے طاقتی سے توانائی، غفلت سے بیداری، بے پروبالی سے بلند پروازی اور موت

سے زندگی اور پُورا انقلابِ چشم زدن کے اندر ہو گیا۔ غور کیجئے تو یہی ایک چشم زدن کا وقفہ زندگی کے پُورے افسانے کا خلاصہ ہے:

طے می شود ایں رہ بہ درخشیدن برقے
ما بے خبراں منتظرِ شمع و چراغیم

اُڑنے کے سروسامان میں سے کونسی چیز تھی جو اس تو گرفتارِ قفسِ حیات کے حصے میں نہیں آئی تھی؟ فطرت نے سارا سروسامان مہیا کر کے اسے بھیجا تھا اور ماں کے اشارے دمبدم گرمِ پروازی کے لیے اُبھار رہے تھے لیکن جب تک اس کے اندر کی خود شناسی بیدار نہیں ہوئی اور اس حقیقت کا عرفان نہیں ہُوا کہ وہ طائرِ بلند پرواز ہے اُس کے بال و پر کا سارا سروسامان بیکار رہا۔ ٹھیک اسی طرح انسان کے اندر کی خود شناسی بھی جب تک سوتی رہتی ہے باہر کا کوئی ہنگامۂ سعی اسے بیدار نہیں کر سکتا لیکن جونہی اُس کے اندر کا عرفان جاگ اُٹھا، اور اسے معلوم ہو گیا کہ اُس کی چھُپی ہُوئی حقیقت کیا ہے تو پھر چشم زدن کے اندر سارا انقلابِ حال انجام پا جاتا ہے اور ایک ہی جست میں حضیضِ خاک سے اڑ کر رفعتِ افلاک تک پہنچ جاتا ہے۔ خواجہ شیراز نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا:

چہ گویمت کہ بہ مے خانہ دوش مستِ خراب | سروشِ عالمِ غیبم چہ مژدہ ہا داد ست
کہ "اے بلند نظر" شاہبازِ سدرہ نشین | نشیمنِ تو نہ ایں کنجِ محنت آباد ست
ترا ز کنگرۂ عرش می زنند صفیر | ندانمت کہ دریں دامگہ چہ افتاد ست

ابوالکلام

مکتوب

قلعۂ احمد نگر
۱۱ر اپریل ۱۹۴۳ء

آنچہ دل از فکر آں می سوخت، بیم ہجر بود
آخر از بے مہری گردوں بہ آں ہم ساختیم!

صدیقِ مکرّم!

اس وقت صبح کے چار نہیں بجے ہیں بلکہ رات کا پچھلا حصّہ شروع ہو رہا ہے۔ دس بجے حسب معمول بستر پر لیٹ گیا۔ لیکن آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئیں۔ ناچار اُٹھ بیٹھا، کمرے میں آیا۔ روشنی کی اور اپنے اشغال میں ڈوب گیا۔ پھر خیال ہوا قلم اٹھاؤں اور کچھ دیر آپ سے باتیں کر کے جی کا بوجھ ہلکا کروں۔ ان آٹھ مہینوں میں جو کیاں گزر چکے ہیں، یہ چھٹی رات ہے جو اس طرح گزر رہی ہے اور نہیں معلوم ابھی اور کتنی راتیں اسی طرح گزریں گی:

دماغ بر فلک و دل بہ پائے مہر بتاں
چگونہ حرف زنم، دل کجا دماغ کجا!

میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ ۱۹۴۱ء میں مَیں جب نینی جیل میں مقید تھا تو اس خیال سے کہ میرے لیے تشویش خاطر کا موجب ہوگا، مجھے اطلاع نہیں دی گئی لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گزرا تھا۔ مجھے قید خانے میں اُس کے خطوط ملتے رہے۔ ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیل آب ہوئی اور وہ رانچی چلی گئی۔ رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئی تو صحت کی رونق چہرے پر واپس آ رہی تھی۔

اُس تمام زمانے میں مَیں زیادہ تر سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہو گئی:

صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش است

جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں تین ہفتے کے بعد کلکتہ واپس آیا اور پھر چار دن کے بعد آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی طوفان آیا نہیں تھا مگر طوفانی آثار ہر طرف امنڈنے لگے تھے۔ حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں، ایک افواہ، جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی یہ تھی کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا جائے گا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام پر بھیج دیا جائے گا[1]۔ یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کی غیر معمولی حالت نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دیے ہیں اور وہ اِن سے ہر طرح کام لے سکتی ہے۔ اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی اور اس نے وقت کی صورتِ حال کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ اِن چار دنوں کے اندر، جو میں نے دو سفروں کے درمیان بسر کیے میں اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ وہ میری طبیعت کی اُفتاد سے واقف تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس

---

[1] گرفتاری کے بعد جو بیانات اخبار میں آئے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ افواہیں بے اصل نہ تھیں۔ سکریٹری آف سٹیٹ اور وائسرائے کی یہی رائے تھی کہ ہمیں گرفتار کر کے مشرقی افریقہ بھیج دیا جائے۔ اور اس غرض سے بعض انتظامات بھی کر لیے گئے تھے۔ لیکن پھر رائے بدل گئی اور بالآخر طے پایا کہ قلعۂ احمد نگر میں فوجی نگرانی کے ماتحت رکھا جائے اور ایسی سختیاں عمل میں لائی جائیں کہ ہندوستان سے باہر بھیجنے کا جو مقصد تھا وہ یہیں حاصل ہو جائے۔

خاموشی میں خلل پڑے۔ اس لیے وہ بھی خاموش تھی لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی۔ ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اور ان کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ ۳ اگست کو، جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگا تو وہ حسبِ معمول دروازے تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔ میں نے کہا، اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو ۱۳ اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا:

خود را بحیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم!

گزشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورتِ حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔

وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطرابِ طبع کا اظہار ہوگا تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا اور عرصے تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔ ۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی، تو وہ اپنا اضطرابِ خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصے تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعے نے ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار

شد آں کہ اہلِ نظر بر کنارہ می رفتند
ہزار گونہ سخن بر دہان و لب خاموش
بہ بانگ چنگ بگوئیم آں حکایت ہا
کہ از نہفتن آں دیگِ سینہ می زد جوش!

کل رات ایک عجیب طرح کی حالت پیش آئی۔ کچھ دیر کے لیے ایسا محسوس ہونے لگا کہ سوئی چبھ رہی ہے اور شاید دل کی بھاپ پانی بن کر بہنا شروع ہو جائے لیکن یہ محض ایک سانحہ تھا جو آیا اور گزر گیا اور طبیعت پھر بند کی بند رہ گئی۔ دیگ نے جوش کھایا لیکن پھوٹ کر بہ نہ سکی:

ضعف سے گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہُوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا!

میرے ساتھ لاسلکی کا ایک سفری (پورٹیبل) سیٹ سفر میں رہا کرتا تھا جب بمبئی میں گرفتار کر کے یہاں لایا گیا تو سامان کے ساتھ وہ بھی آگیا، لیکن جب سامان قلعے کے اندر لایا گیا تو اس میں سیٹ نہیں تھا۔ معلوم ہُوا کہ باہر روک لیا گیا ہے۔ جیلر سے پوچھا تو اُس نے کہا۔ کمانڈنگ آفیسر کے حکم سے روکا گیا ہے اور اب گورنمنٹ سے اس بارے میں دریافت کیا جائے گا۔ بہرحال جب اخباروں کا آنا روک دیا گیا تھا تو ظاہر ہے کہ لاسلکی کے سیٹ کی اجازت کیونکر دی جا سکتی تھی؟ تین ہفتے کے بعد اخبار کی روک تو اُٹھ گئی مگر سیٹ پھر بھی نہیں دیا گیا۔ وہ چیتہ خاں کے آفس میں مقفل پڑا رہا۔ اب میں نے چیتہ خاں کو دے دیا ہے کہ اپنے بنگلے میں لگا کر کام میں لائے کیونکہ اب وہ جس بنگلے میں منتقل ہُوا ہے، اس میں لاسلکی سیٹ نہیں ہے۔

لیکن آج کل کوئی فوجی افسر ہمارے احاطے کے قریب قلعے میں فروکش ہے۔ اس کے پاس لاسلکی کا سیٹ ہے۔ کبھی کبھی اس کی آواز یہاں بھی آنکلتی ہے۔ کل رات بہت صاف آنے لگی تھی۔ غالباً بی، بی، سی کا پروگرام تھا اور کوئی وایولین Violin

بجانے والا اپنا کمال دکھارہا تھا۔ ایسی لَے تھی جیسی کہ Mendelssohn کے مشہور قطعۂ نغمۂ بغیر لفظ (سونگس وداوٹ ورڈز) کی سننے میں آئی تھی :

حدیثِ عشق کہ از حرف و صوت مستغنی ست
بہ نالۂ دف و نَے در خروش و ولولہ بُود!

ناگہاں ایک مغنیۂ خوش لہجہ کی صدائے درد انگیز اٹھی اور اُس نے سانٹ کے زیر و بم کے ساتھ مل کر دہ عالم پیدا کر دیا جس کی طرف خواجہ شیراز نے اشارہ کیا ہے :

چہ راہ می زند ایں مطربِ مقام شناس
کہ درمیانِ غزل قولِ آشنا آورد!

پہلے طبیعت پر ایک فوری اثر پڑا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے پھوڑا پھوٹنے لگا ہے لیکن یہ حالت چند لمحوں سے زیادہ نہیں رہی۔ پھر دیکھا تو بدستور انقباضِ خاطر واپس آگیا تھا۔

یا مگر کاوشِ آں نشترِ مژگاں کم شد
یا کہ خود زخمِ مرا لذتِ آزار نہ ماند!

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ایک زمانے میں مجھے فنِ موسیقی کے مطالعے اور مشق کا بھی شوق رہ چکا ہے۔ اس کا اشتغال کئی سال تک جاری رہا تھا۔ ابتدا اس کی یوں ہوئی کہ ۱۹۰۵ء میں جب تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا اور طلبا کو پڑھانے میں مشغول تھا تو کتابوں کا شوق مجھے اکثر ایک کتب فروش خدا بخش کے یہاں لے جایا کرتا تھا۔ جس نے ویلزلی اسٹریٹ میں مدرسہ کالج کے سامنے دکان لے رکھی تھی اور زیادہ تر عربی اور فارسی کی قلمی کتابوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کیا کرتا تھا۔ ایک دن اُس نے فقیر اللہ سیف خان کی راگ درپن کا ایک نہایت خوشخط اور مصوّر نسخہ مجھے دکھایا اور کہا کہ یہ کتاب فنِ موسیقی میں ہے۔ سیف خاں عالمگیری عہد کا ایک امیر تھا اور ہندوستان کی موسیقی کے علم و عمل کا ماہر تھا۔ اُس نے سنسکرت کی ایک کتاب کا فارسی

میں ترجمہ کیا جو راگ درپن کے نام سے مشہور ہوئی یہ نسخہ جو خدا بخش کے ہاتھ لگا تھا۔ آصف جاہ کے لڑکے ناصر جنگ شہید کے کتب خانے کا تھا اور نہایت اہتمام کے ساتھ مرتّب کیا گیا تھا۔ میں ابھی اس کا دیباچہ دیکھ رہا تھا کہ مسٹر ڈینسن راس آ گئے جو اس زمانے میں مدرسہ عالیہ کے پرنسپل تھے اور ایرانی لہجے میں فارسی بولنے کے بہت شائق تھے۔ یہ دیکھ کر کہ ایک کم سن لڑکا فارسی کی ایک قلمی کتاب کا غور و خوض سے مطالعہ کر رہا ہے، متعجب ہوئے اور مجھ سے فارسی میں پوچھا "یہ کس مصنّف کی کتاب ہے؟" میں نے فارسی میں جواب دیا کہ سیف خاں کی کتاب ہے اور فنِ موسیقی میں ہے۔ اُنھوں نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی اور خود پڑھنے کی کوشش کی۔ پھر کہا کہ ہندوستان کا فنِ موسیقی بہت مشکل فن ہے۔ کیا تم اس کتاب کے مطالب سمجھ سکتے ہو؟ میں نے کہا جو کتاب بھی لکھی جاتی ہے اسی لیے لکھی جاتی ہے کہ لوگ پڑھیں اور سمجھیں۔ اگر میں اسے پڑھوں گا تو سمجھ لوں گا۔ اُنھوں نے صفحہ الٹ کر کہا "تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اگر سمجھ سکتے ہو تو مجھے اس صفحے کا مطلب سمجھاؤ۔" اُنھوں نے جس صفحے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس میں مبادیات کی بعض قسموں کا بیان تھا۔ میں نے الفاظ پڑھ لیے مگر مطلب کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ شرمندہ ہو کر خاموش ہو گیا اور بالآخر کہنا پڑا کہ اس وقت اس کا مطلب بیان نہیں کر سکتا، بغور مطالعہ کرنے کے بعد بیان کر سکوں گا۔

میں نے کتاب لے لی اور گھر آ کر اُسے اوّل سے آخر تک پڑھ لیا، لیکن معلوم ہوا کہ جب تک موسیقی کی مصطلحات پر عبور نہ ہو اور کسی ماہرِ فن سے اس کی مبادیات سمجھ نہ لی جائیں، کتاب کا مطلب سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ طبیعت طالب علمی کے زمانے میں اس بات کی خوگر ہو گئی تھی کہ جو کتاب بھی ہاتھ آئی اُس پر ایک نظر ڈالی اور تمام مطالب پر عبور ہو گیا۔ اب جو یہ رکاوٹ پیش آئی تو طبیعت کو سخت اُلجھن ہوئی اور خیال ہوا کہ کسی واقف کار سے مدد لینی چاہیے لیکن مدد لی جائے تو کس سے لی جائے؟ خاندانی زندگی کے حالات ایسے تھے کہ اس کوچے سے رسم و راہ

رکھنے والوں کے ساتھ ملنا آسان نہ تھا۔ آخر خیال مسیتا خاں کی طرف گیا۔ اس پیشے کا بھی ایک آدمی تھا جس کی ہمارے یہاں گزر تھی۔

اس مسیتا خاں کا حال بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ سونی پت ضلع انبالہ کا رہنے والا تھا اور پیشے کا خاندانی گویّا تھا۔ گانے کے فن میں اچھی استعداد بہم پہنچائی تھی اور دہلی اور جے پور کے استادوں سے تحصیل کی تھی۔ کلکتہ میں طوائفوں کی معلمی کیا کرتا تھا:

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے!

یہ والد مرحوم کی خدمت میں بیعت کے لیے حاضر ہوا۔ اُن کا قاعدہ تھا کہ اِس طرح کے لوگوں کو مُرید نہیں کرتے تھے لیکن اصلاح و توبہ کا دروازہ بند بھی نہیں کرتے۔ فرماتے، بغیر بیعت کے آتے رہو۔ دیکھو، خُدا کو کیا منظور ہے۔ اکثر حالتوں میں ایسا ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد لوگ خود بخود اپنا پیشہ چھوڑ کر تائب ہو گئے چنانچہ مسیتا خاں کو بھی یہی جواب ملا۔ والد مرحوم جمعہ کے دن وعظ کے بعد جامع مسجد سے مکان آتے تو پہلے کچھ دیر دیوان خانے میں بیٹھتے۔ پھر اندر جاتے۔ خاص خاص مُرید پالکی کے ساتھ چلتے ہوئے آجاتے اور اپنی اپنی معروضات پیش کر کے رخصت ہو جاتے مسیتا خاں بھی ہر جمعہ وعظ کے بعد حاضر ہوتا اور دُور فرش کے کنارے دست بستہ کھڑا رہتا۔ کبھی والد مرحوم کی نظر پڑ جاتی تو پوچھ بیٹھتے، مسیتا خاں کیا حال ہے؟ عرض کرتا، حضور کی نظرِ کرم کا اُمیدوار ہوں۔ فرماتے ہاں! اپنے دل کی لگن میں لگے رہو۔ وہ بے اختیار ہو کر قدموں پر گر جاتا اور اپنے آنسوؤں کی جھڑی سے اُنھیں تر کر دیتا تھا۔ ذوق نے کیا خوب کہا ہے:

ہُوئے ہیں تر گریۂ ندامت سے اس قدر آستین و دامن
کہ میری تر دامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے!

کبھی عرض کرتا: رات کے دربار میں حاضری کا حکم ہو جائے۔ یعنی رات کی مجلسِ خاص میں جو

مریدوں کی تعلیم وارشاد کے لیئے ہفتے میں ایک بار منعقد ہوا کرتی تھی۔ اُسے والد مرحوم ٹال جاتے مگر ان کے ٹالنے کا بھی ایک خاص طریقہ تھا۔ فرماتے، ابھی بات ہے دیکھو ساری باتیں اپنے وقت پر ہو رہیں گی۔ وہ جاں باختۂ امید و بیم اتنے ہی میں نہال ہو جاتا اور رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے اپنے گھر کی راہ لیتا۔ خواجہ حافظ ان معاملات کو کیا ڈوب کر کہہ گئے ہیں:

زہاجبِ درِ خلوت سرائے خاص بگو!
فلاں زگوشہ نشینانِ خاکِ درگہِ ماست!

لیکن بالآخر اُس کا عجز و نیاز اور صدقِ طلب رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ والد مرحوم نے اُسے مرید کر لیا تھا اور حلقے میں بیٹھنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ اُسے بھی کچھ توفیق ملی کہ طوائفوں کی نوچیوں کی معلمی سے تائب ہو گیا اور ایک بنگالی زمیندار کی ملازمت پر قناعت کر لی۔ والد مرحوم کو میں نے ایک مرتبہ یہ کہتے سنا تھا کہ مسیتا خاں کا حال دیکھتا ہوں تو پیرِ چنگی کی حکایت یاد آجاتی ہے یعنی مولانا روم والے پیرِ چنگی کی:

پیرِ چنگی کے بود مردِ خُدا
حبذا اے سرِ پنہاں حبذا

بہرحال میرا خیال اسی مسیتا خاں کی طرف گیا اور اس سے اس معاملے کا ذکر کیا پہلے تو اُسے کچھ حیرانی سی ہوئی لیکن پھر جب معاملہ پوری طرح سمجھ میں آگیا تو بہت خوش ہوا کہ مرشد زادے کی نظرِ توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی ہے لیکن اب مشکل پیش آئی کہ یہ تجویز عمل میں لائی جائے تو کیسے لائی جائے؟ گھر میں جہاں ہدایہ اور مشکوٰۃ کے پڑھنے والوں کا مجمع رہتا تھا، سارا، گا، ما کی سبق آموزیوں کا موقع نہ تھا اور دوسری جگہ بالالتزام جانا اشکال سے خالی نہ تھا۔ بہرحال اس مشکل کا ایک حل نکال لیا گیا اور ایک ازوارثِ گیا جس کے مکان میں نشست و برخاست کا انتظام ہو گیا۔ پہلے ہفتے میں تین دن مقرر کیے تھے۔ پھر روز سہ پہر کے وقت جانے لگا۔ مسیتا خاں پہلے سے وہاں موجود رہتا اور دو ڈیڑھ

گھنٹے تک موسیقی کے علم و عمل کا مشغلہ جاری رہتا،

عشق می ورزم و امید کہ ایں فنِ شریف
چوں ہنرہائے دگر موجبِ حرماں نہ شود!

مسیتا خاں نے تعلیم کا صرف ایک ہی ڈھنگ رٹا ہوا تھا جو اس فن کے اُستادوں کا عام طریقہ ہوتا ہے وہی اُس نے یہاں بھی چلایا لیکن میں نے اُسے روک دیا اور کوشش کی کہ اپنے طریقے پر معلومات مرتب کروں۔ موسیقی کے آلات میں زیادہ تر توجہ ستار پر ہوئی اور بہت جلد اس سے انگلیاں آشنا ہو گئیں۔ اب سوچتا ہوں تو حسرت ہوتی ہے کہ وہ بھی کیا زمانہ تھا اور طبیعت کے کیا کیا ولولے تھے۔ میری عمر ستر برس سے زیادہ نہ ہوگی، لیکن اُس وقت بھی طبیعت کی افتاد یہی تھی کہ جس میدان میں قدم اُٹھاتیے، پوری طرح اُٹھاتیے اور جہاں تک راہ ملے بڑھتے ہی جاتیے۔ کوئی کام بھی ہو لیکن طبیعت اس پر کبھی راضی نہیں ہوئی کہ اُدھورا کر کے چھوڑ دیا جائے۔ جس کوچے میں بھی قدم اُٹھایا اُسے پوری طرح چھان کر چھوڑا۔ ثواب کے کام کیے تو وہ بھی پوری طرح کیے۔ گناہ کے کام کیے تو اُنھیں بھی اُدھورا نہ چھوڑا۔ رندی کا کوچہ ملا تھا تو اس میں بھی سب سے آگے رہتے تھے۔ پارسائی کی راہ ملی، تو اس میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ طبیعت کا تقاضا ہمیشہ یہی رہا کہ جہاں کہیں جائیے ناقصوں اور خام کاروں کی طرح نہ جائیے۔ رسم و راہ رکھیئے تو راہ کے کاملوں سے رکھیے۔ شیخ علی حزیں نے میری زبانی کہا تھا:

تا دستِ رسم بود، زدم چاکِ گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم!

چنانچہ اس کوچے میں بھی قدم رکھا تو جہاں تک راہ مل سکی۔ قدم بڑھاتے جانے میں کوتاہی نہیں کی۔ ستار کی مشق چار پانچ سال تک جاری رہی تھی۔ بین سے بھی انگلیاں ناآشنا نہیں رہیں لیکن زیادہ دل بستگی اس سے نہ ہو سکی پھر اس کے

بعد ایک وقت آیا کہ یہ مشغلہ یک قلم متروک ہوگیا اور اب تو گزرے ہوئے وقتوں کی صرف ایک کہانی باقی رہ گئی ہے۔ البتہ انگلی پر سے مضراب کا نشان بہت دنوں تک نہیں مٹا تھا:

اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا!

اس عالم رنگ و بو میں ایک روش تو مکھی کی ہوئی کہ شہد پہ بیٹھتی ہے تو اس طرح بیٹھتی ہے کہ پھر اُٹھ نہیں سکتی:

کہ پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں پائے بند تو رے

اور ایک بھونرے کی ہوئی کہ ہر پھول پر بیٹھے، بُو باس لی اور اُڑ گئے:

تک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش کام ہوئے اور چل نکلے!

چنانچہ زندگی کے چمنستان ہزار رنگ کا ایک پھول یہ بھی تھا کہ کچھ دیر کے لیے رُک کر بُو باس لے لی اور آگے نکل گئے۔ مقصود اس اشتغال سے صرف یہ تھا کہ طبیعت اس کُوچے سے ناآشنا نہ رہے۔ کیونکہ طبیعت کا توازن اور فکر کی لطافت بغیر موسیقی کی ممارست کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب ایک خاص حد تک یہ مقصد حاصل ہو گیا تو پھر مزید اشتغال نہ صرف غیر ضروری تھا بلکہ موانع کار کے حکم میں داخل ہو گیا تھا۔ البتہ موسیقی کا ذوق اور تأثر جو دل کے ایک ایک ریشے میں رچ گیا تھا۔ دل سے نکالا نہیں جا سکتا تھا اور آج تک نہیں نکلا:

جاتی ہے کوئی کش مکش اندوہ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا!

حُسن آواز میں ہو یا چہرے میں، تاج محل میں ہو یا نشاط باغ میں، حُسن ہے اور حُسن اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے۔ افسوس اُس محرومِ ازلی پر جس کے بے حس دل نے اس مطلبے کا جواب دینا نہ سیکھا ہو:

سینۂ گرم نہ داری مطلب صحبتِ عشق
آتشے نیست چو در مجمرہ است، عود مخر!

میں آپ سے ایک بات کہوں۔ میں نے بارہا اپنی طبیعت کو ٹٹولا ہے۔ میں زندگی کی احتیاجوں میں سے ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں۔ لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آوازِ خوش میرے لیئے زندگی کا سہارا، دماغی کاوشوں کا مداوا اور جسم و دل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے:

روئے نکو معالجۂ عمرِ کوتہ ست
ایں نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ اند

مجھے اگر آپ زندگی کی رہی سہی راحتوں سے محروم کر دینا چاہتے ہیں تو صرف اس ایک چیز سے محروم کر دیجئے، آپ کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ یہاں احمد نگر کے قید خانے میں اگر کسی چیز کا فقدان مجھے ہر شام محسوس ہوتا ہے تو وہ ریڈیو سیٹ کا فقدان ہے:

لذّتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ
خُلد میں بھی یہ بلا یاد آئی!

جس زمانے میں موسیقی کا اشتغال جاری تھا، طبیعت کی خود رفتگی اور محویت کے بعض ناقابلِ فراموش احوال پیش آئے جو اگرچہ خود گزر گئے لیکن ہمیشہ کے لیئے دامنِ زندگی پہ اپنا رنگ چھوڑ گئے۔ اُسی زمانے کا ایک واقعہ ہے کہ آگرہ کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اپریل کا مہینہ تھا اور چاندنی کی ڈھلتی ہوئی راتیں تھیں جب رات کی پچھلی پہر شروع ہونے کو ہوتی تو چاند پردۂ شب ہٹا کر یکایک جھانکنے لگتا۔ میں نے خاص طور پہ کوشش کر کے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ رات کو ستارے کر تاج چلا جاتا اور اُس کی چھت پہ جمنا کے رُخ بیٹھ جاتا۔ پھر جونہی چاندنی پھیلنے لگتی، ستار پہ کوئی گت چھیڑ دیتا۔ اور اس میں محو ہو جاتا۔ کیا کہوں اور کس طرح کہوں کہ فریبِ تخیل کے کیسے جلوے انہی آنکھوں کے آگے گزر چکے ہیں:

گدائے میکدہ ام، لیک وقتِ مستی بیں
کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم!

رات کا سناٹا، تاروں کی چھاؤں، ڈھلتی ہوئی چاندنی اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات۔ چاروں طرف تاج کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے، بُرجیاں دم بخود بیٹھی تھیں۔ بیچ میں چاندنی سے دُھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا۔ نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں اور اُوپر ستاروں کی اَن گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔ نُور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اُٹھتے اور ہوا کی لہروں پر بے روک تیرنے لگتے۔ آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور میری اُنگلی کے زخموں سے نغمے:

زخمہ بر تارِ رگِ جاں می زنم
کس چہ داند تا چہ دستاں می زنم

کچھ دیر تک فضا تھمی رہتی۔ گویا کان لگا کر خاموشی سے سُن رہی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ہر تماشائی حرکت میں آنے لگتا۔ چاند بڑھنے لگتا۔ یہاں تک کہ سر پر آکھڑا ہوتا۔ ستارے دیدے پھاڑ پھاڑ کر تکنے لگتے۔ درختوں کی ٹہنیاں کیفیت میں آآکر جھومنے لگتیں۔ رات کے سیاہ پردوں کے اندر عناصر کی سرگوشیاں صاف صاف سُنائی دیتیں۔ بارہا تاج کی بُرجیاں اپنی جگہ سے ہل گئیں اور کتنے ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ منارے اپنے کاندھوں کو جنبش سے نہ روک سکے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں مگر واقعہ یہ ہے کہ اس عالم میں بارہا میں نے بُرجیوں سے باتیں کی ہیں اور جب کبھی تاج کے گنبدِ خاموش کی طرف نظر اٹھائی ہے تو اُس کے لبوں کو ہلتا ہوا پایا ہے:

تو مپندار کہ ایں قصّہ ز خود می گویم
گوش نزدیکِ لبم آر کہ آوازے ہست

اس زمانے کے کچھ عرصہ بعد لکھنؤ جانے اور کئی ماہ تک ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ آپ

بھولے نہ ہوں گے کہ سب سے پہلے آپ سے وہیں ملاقات ہوئی تھی۔ آپ نے قلمی کتابوں کے تاجر عبدالحسین سے کلیاتِ صائبؔ کا ایک نسخہ خریدا تھا اور مجھے یہ کہہ کر دکھایا تھا کہ قلمی کتابوں کا بھی آپ کو کچھ شوق ہے؟

ایں سخن را چہ جواب ست، تو ہم میدانی

اسی قیام کے دوران میں مرزا محمد ہادی مرحوم سے شناسائی ہوئی۔ وہ موسیقی میں کافی دخل رکھتے تھے اور چونکہ علم و فن کی راہوں سے آشنا تھے اس لیے علمی طریقے پر اسے سمجھتے اور سمجھا سکتے تھے۔ مجھے ان سے اپنی معلومات کی تکمیل میں مدد ملی۔ افسوس وہ بھی چل بسے:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

اُس زمانے میں کہ کیننگ کالج کے سامنے پانچ روپیہ ماہوار کرائے کا ایک مکان لے رکھا تھا وہی ان کی دنیا تھی۔ علمِ ہیئت کے شوق نے نجاری کے مشغلے سے آشنا کر دیا تھا۔ جب کالج سے آتے تو مکان کی چھت پر لکڑی کے دوائر قطر اور نصف اور ثلث بنانے میں مشغول ہو جاتے اور اس طرح اپنی رصد بندیوں کا سامان کرتے چھت کی سیڑھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ جست لگا کر اوپر پہنچتے اور پھر ساری رات ستاروں کی ہم نشینی میں بسر کر دیتے:

کہ با جام و سبو ہر شب قرینِ ماہ و پروینم!

کئی برس کے بعد پھر لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا تو انھیں ایک دوسرے ہی عالم میں پایا۔ ایک رشتہ دار کے انتقال سے کا آپی گی کچھ جائداد ورثے میں مل گئی تھی اور اب جوانی کی محرومیوں کا بڑھاپے کی ذوق اندوزیوں سے کفارہ کرنا چاہتے تھے:

وقتِ عزیز رفت، بیا تا قضا کنم
عمرے کہ بے حضورِ صراحی و جام رفت

یہ گرم جوشیاں چونکہ موسیقی کے ذوق کے پردے میں اُبھری تھیں۔ اس لیے شاہدانِ نغمہ پرداز سے صحبتیں گرم رہتی تھیں اور بعض اُستادانِ فن سے بھی مذاکرہ جاری رہتا۔ اس مرتبہ اگرچہ میرا قیام بہت مختصر رہا۔ لیکن جتنے دن رہا، موسیقی کے مذاکرات ہوتے رہے۔ اِسی زمانے کے کچھ عرصہ بعد اُنھوں نے معارف النغمات کی ترتیب میں مدد دی جو چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

بچپنے میں حجاز کی مترنم صداؤں سے کان آشنا ہو گئے تھے۔ صدرِ اوّل کے زمانے سے لے کر جس کا حال ہم کتاب الاغانی اور عقد الفرید وغیرہ میں پڑھ چکے ہیں۔ آج تک حجازیوں کا ذوقِ موسیقی غیر متغیر رہا۔ یہ ذوق اُن کے خمیر میں کچھ اس طرح پیوست ہو گیا تھا، کہ اذان کی صداؤں تک کو موسیقی کے نقشوں میں ڈھال دیا۔ آج کل کا حال معلوم نہیں، لیکن اُس زمانے میں حرم شریف کے ہر منارے پر ایک مؤذن متعین ہوتا تھا اور اُن سب کے اوپر شیخ المؤذنین ہوتا۔ اُس زمانے میں شیخ المؤذنین شیخ حسن تھے اور بڑے ہی خوش آواز تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ رات کی پچھلی پہر میں اُن کی ترحیم[1] کی نوائیں ایک سماں باندھ دیا کرتی تھیں۔ ہمارا مکان قدوہ میں باب السلام کے پاس تھا۔ کوٹھے کی کھڑکیوں سے مناروں کی قندیلیں صاف نظر آتی تھیں اور صبح کی اذان تو اس طرح سنائی دیتی جیسے چھت پر کوئی اذان دے رہا ہو۔ جب عراق اور مصر و شام کے سفر کا اتفاق ہوا تو موجودہ عربی کی موسیقی کی جستجو ہوئی۔ معلوم ہوا کہ قدماء کی بہت سی مصطلحات، جو ہمیں کتاب الاغانی اور خوارزمی وغیرہ میں ملتی ہیں۔ اب کوئی نہیں جانتا نہ تعبیر و تقسیم کے اسماء و رموز

---

[1] صبح کی اذان سے پہلے مختلف کلمات ادعیہ ایک خاص لحن میں دہرائے جاتے ہیں، اسے ترحیم کہتے ہیں۔ کم سے کم چار سو برس پہلے بھی یہ رسم جاری تھی کیونکہ ملا علی قاری اور صاحب اشباہ نے اسے بھی بدع و محدثات میں شمار کیا تھا۔

تقریباً بدل گئے ہیں اور عربی کی جن مصطلحات نے ایران پہنچ کر فارسی کا جامہ پہن لیا تھا وہ اب پھر عربی میں واپس آکر معرّب ہو گئی ہیں۔ البتہ فن کی پرانی بنیادیں ابھی تک متزلزل نہیں ہوئیں۔ وہی بارہ راگنیاں اب بھی اصل و بنیاد کا کام دے رہی ہیں جو یونانی موسیقی کی تقلید میں وضع ہوئی تھیں۔ آسمان کے بارہ برجوں کی طرف اب بھی انھیں اسی طرح منسوب کیا جاتا ہے، جس طرح قدماء نے کیا تھا۔ آلاتِ موسیقی میں اگرچہ بہت سی تبدیلیاں ہو گئیں لیکن عود کے پردے ابھی تک خاموش نہیں ہوئے ہیں، اور اُن کے زخموں سے وہ نوائیں سُنی جا سکتی ہیں جو کبھی ہارون الرشید کی شبستانِ طرب میں اسحاق موصلی اور ابراہیم بن مہدی کے مضراب سے اُٹھا کرتی تھیں:

این مطرب از کجاست کہ سازِ عراق ساخت
وآہنگ بازگشت ز 'راہ' 'حجاز' کرد!

'عراق' اور 'حجاز' دو راگنیوں کے نام ہیں اور 'راہ' یعنی سُر
مطرب نگاہ دار ہمیں 'رہ' کہ میزنی!

اُس زمانے میں شیخ احمد سلامہ حجازی کا جوق مصر میں بہت مشہور اور نامور تھا 'جوق' وہاں منڈلی کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ ہم نے یہاں منڈلی کے لیے 'طائفہ' کا لفظ اختیار کیا تھا۔ پھر اس کی جمع 'طوائف' ہوئی اور رفتہ رفتہ طوائف کے لفظ نے مفرد معنی پیدا کر لیے۔ یعنی زن رقاصہ و مغنیہ کے معنی میں بولا جانے لگا۔ شیخ سلامہ کا جوق قاہرہ کے اوپیرا ہاؤس میں اکثر اپنا کمال دکھایا کرتا تھا اور شہر کی کوئی بزمِ طرب بغیر اس کے بارونق نہیں سمجھی جاتی تھی۔ مجھے بارہا اس کے سُننے کا اتفاق ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ عربی موسیقی آج کل جیسی کچھ اور جتنی کچھ بھی ہے وہ اس کا پورا ماہر تھا۔ ایک دوست کے ذریعے اس سے شناسائی پیدا کی تھی اور موجودہ عربی موسیقی پر مذاکرات کیے تھے:

اس زمانے میں مصر کی ایک مشہور "عالمہ" طاہرہ نامی باشندۂ طنطا تھی۔ "عالمہ" مصر میں مغنیہ کو کہتے ہیں یعنی موسیقی کا علم جاننے والی۔ ہمارے علمائے کرام کو اس اصطلاح سے غلط فہمی نہ ہو۔ یورپ کی زبانوں میں بھی لفظ Alma ہو گیا ہے۔ یہ شیخ سلامہ بھی اس عالمہ کی فن دانی کا اعتراف کرتا تھا۔ وہ خود بھی بلائے جان تھی مگر اس کی آواز اُس سے بھی زیادہ آفت ہوش و ایمان تھی۔ میں نے اس سے بھی تنا سانی بہم پہنچائی اور عربی موسیقی کے کمالات سُنے۔ دیکھیے اس خانماں خراب شوق نے کن کن گلیوں کی خاک چھنوائی:

جانا پڑا رقیب کے در پہ ہزار بار

اے کاش جانتا نہ تری رہگزر کو میں

جس زمانے کے یہ واقعات لکھ رہا ہوں اُس سے کئی سال بعد مصر میں اُمِّ کلثوم کی شہرت ہوئی اور اب تک قائم ہے۔ میں نے اُس کے بے شمار ریکارڈ سُنے ہیں اور قاہرہ، انگورہ، طرابلس الغرب، فلسطین اور سنگاپور کے ریڈیو اسٹیشن آج کل بھی اس کی نواؤں سے گونجتے رہتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس نے اُمِّ کلثوم کی آواز نہیں سنی ہے وہ موجودہ عربی موسیقی کی دلآویزیوں کا کچھ اندازہ نہیں کر سکتا۔ اُس کے مشہور انشادات میں سے ایک رشید عالیہ بنت المہدی کا مشہور نسیب ہے:

وحبّب، فان الحب داعیۃ الحبّ

وکم من بعید الدار مستوجب القرب

البتہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ قدیم یونانی موسیقی کی طرح عربی موسیقی بھی نسبتاً سادہ اور دقتِ تالیف کی کاوشوں سے خالی ہے۔ ہندوستان نے اس معاملے کو جن گہرائیوں تک پہنچا دیا، حق یہ ہے کہ قدیم تمدنوں میں سے کوئی تمدن بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ حسنِ تقسیم اور دقتِ ترتیب یہاں کی ہر فنی شاخ کی عام خصوصیت رہی ہے۔

لیکن جہاں تک نفسِ فن کی دقیقہ سنجیوں کا تعلق ہے اس میں بھی کوئی شبہ نہیں

کہ یورپ کا موجودہ فنِ موسیقی، جس کی بنیاد نشئۃ ثانیہ کے جنوبی باکمالوں نے رکھی تھی، منتہائے کمال تک پہنچا دیا گیا ہے اور گو ذوقِ سماع کے اختلاف سے ہمارے کان اُس کی پوری قدر شناسی نہ کرسکیں۔ لیکن دماغ اُس کی عظمت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دراصل اشیاء و معانی کے تمام مرکب مزاجوں کی طرح موسیقی کا مزاج بھی ترکیبی واقع ہوا ہے اور سارا معاملہ مفرد اصوات والحان کی تالیف سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ ان مفرد اجزا کی ترکیب کا تسویہ اور تناسب جس قدر دقیق اور نازک ہوتا جائے گا، موسیقی کی گہرائیاں اُتنی ہی بڑھ جائیں گی۔ اس اعتبار سے اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے یورپ کا فنِ موسیقی فکرِ انسانی کی دقت آفرینیوں کا ایک غیر معمولی نمونہ ہے اور جرمنی کے باکمالانِ فن نے تو اس باب میں بڑی ہی سحرکاری کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موسیقی اور شاعری ایک ہی حقیقت کے دو مختلف جلوے ہیں اور ٹھیک ایک ہی طریقے پر ظہور پذیر بھی ہوتے ہیں۔ موسیقی کا مؤلف الحان کے اجزا کو وزن و تناسب کے ساتھ ترکیب دے دیتا ہے۔ اسی طرح شاعر بھی الفاظ و معانی کے اجزا کو حسنِ ترکیب کے ساتھ باہم جوڑ دیتا ہے:

توخانہ بستی دمن زخمی نگیں بستم

جو حقائق شعر میں الفاظ و معانی کا جامہ پہن لیتے ہیں وہی موسیقی میں الحان و ایقاع کا بھیس اختیار کر لیتے ہیں۔ نغمہ بھی ایک شعر ہے لیکن اسے حرف و لفظ کا بھیس نہیں ملا۔ اُس نے اپنی رُوحِ معنی کے لیے نواؤں کا بھیس طیار کر لیا:

والاذن تعشق قبل العین احیانا

یہ کیا بات ہے کہ بعض الحان درد و الم کے جذبات برانگیختہ کر دیتے ہیں، بعض کے سننے سے مسرت و انبساط کے جذبات اُمنڈنے لگتے ہیں؟ بعض کی لَے ایسی ہوتی ہے جیسے کہہ رہی ہو کہ زندگی اور زندگی کے سارے ہنگامے ہیچ ہیں۔ بعض کی

ئے ایسی محسوس ہوتی ہے جیسے اشارہ کر رہی ہو کہ :

یاراں! صلائے عام ست، گر مے کنید کارے!

یہ وہی معانی ہیں جو موسیقی کی زبان میں اُبھرنے لگتے ہیں۔ اگر یہ شعر کا جامہ پہن لیتے تو کبھی حافظ کا ترانہ ہوتا، کبھی خیام کا زمزمہ، کبھی شیلے Shelley کی ماتم سرائیاں ہوتیں، کبھی ورڈس ورتھ Words worth کی حقائق سرائیاں:

دریں میدانِ پُر نیرنگ حیرانست دانائی
کہ یک ہنگامہ آرائی و صد کشور تماشائی

یہ عجیب بات ہے کہ عربوں نے ہندوستان کے تمام علوم و فنون میں دلچسپی لی۔ لیکن ہندوستان کی موسیقی پر ایک غلط انداز نظر بھی نہ ڈال سکے۔ ابوریحان البیرونی نے کتاب الہند میں ہندوؤں کے تمام علوم و عقائد پر نظر ڈالی ہے اور ایک باب فی کتبھم فی سائر العلوم پر بھی لکھا ہے مگر موسیقی کا اس میں کوئی ذکر نہیں۔ ڈاکٹر ادورڈ سخاؤ Sachau نے الآثار الباقیہ کے مقدمے میں البیرونی کا ایک مکتوب درج کیا ہے جس میں اُس نے اپنی تمام مصنفات کا بہ تفصیل ذکر کیا ہے۔ لیکن اس میں بھی اس موضوع پر کوئی تصنیف نظر نہیں آتی حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے نائک سلطان محمود اور سلطان مسعود کے درباروں میں اپنے کمالات فن کی نمائشیں کرنے لگے تھے اور ہندوستان کے ڈھول اور باجے غزنی کے گلی کوچوں میں بجائے جا رہے تھے۔ غالباً اس تغافل کی وجہ کچھ تو یہ ہوگی کہ علوم عقلیہ کے شوق و اشتغال نے اس کی بہت کم مہلت دی کہ فنونِ لطیفہ کی طرف توجہ کرتے اور کچھ یہ بات بھی ہوگی کہ عربوں کا ذوقِ سماع ہندوستان کے ذوقِ سماع سے اس درجہ مختلف تھا کہ ایک کے کان دوسرے کی نواؤں سے بہ مشکل آشنا ہو سکتے تھے۔

ہندوستان کی موسیقی کی طرح ہندوستان کے ڈراموں سے بھی عرب مصنف

یک قلم نا آشنا رہے۔ البیرونی نے سنسکرت کی شاعری اور فنِ عروض کا بہ تفصیل ذکر کیا ہے۔ لیکن ناٹک کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ حالانکہ یونانی ادبیات کی طرح سنسکرت ادبیات کی بھی، ایک خاص اور ممتاز چیز ناٹک ہے۔

خود یونان کے فنونِ ادبیہ کے ساتھ بھی عربوں نے ایسا ہی تغافل برتا۔ یونان کی شاعری اور ڈراموں کی انھیں بہت کم خبر تھی۔ ہومر اور سوفاکلیس وغیرہما کے نام انھیں ارسطو کے مقالات اور افلاطون کی 'جمہوریت' سے معلوم ہو گئے تھے لیکن اس سے زیادہ کچھ معلوم نہ کر سکے۔ ابنِ رشد نے 'کامیڈی' اور 'ٹریجڈی' کی جو تعریف اپنی شرح میں کی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یونانی ڈرامے کی حقیقت سے اس کا دماغ کس درجہ نا آشنا تھا۔ وہ کامیڈی کو ہجو اور ٹریجڈی کو مدح سے تعبیر کرتا ہے!

یہ بات بھی صاف نہیں ہوئی کہ یونان کے فنِ بلاغت سے آئمہ بلاغتِ عرب کہاں تک متاثر ہوئے تھے؟ بظاہر انھوں نے اسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ ارسطو کے مقالات، خطابات اور شاعری پر عربی میں منتقل ہو گئے تھے اور ابنِ رشد نے اپنی شروح میں انھیں بھی شامل کیا لیکن عرب آئمہ فن نہ تو اس کی رُوح سمجھ سکے اور نہ بلاغتِ عربی کی سرگرانیوں نے اس کی مہلت دی کہ سمجھنے کی کوشش کرتے۔ ارسطو نے اپنے دونوں مقالوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ تمام تر یونانی خطابت اور شاعری کے نمونوں پر مبنی ہے اور عربی دماغ اُن سے آشنا نہ تھا۔ آپ نے ابنِ قدامہ کی نقد الشعر کا ضرور مطالعہ کیا ہوگا۔ چوتھی صدی کے بغداد کے علمی حلقے میں اُس کا نشو و نما ہوا تھا اور وہ نسلاً رومی تھا۔ چند سال ہوئے اسکوریال (اسپین) کے کتب خانے میں ایک کتاب کا سُراغ ملا۔ جس کی لوح پر 'نقد النثر' درج تھا مگر مصنف کا نام مٹا ہوا تھا۔ بہت غور کرنے سے ابو جعفر ابنِ قدامہ سے ملتے جلتے حروف دکھائی دینے لگے۔ جب اس نام کی کتاب دُنیا کے کتب خانوں کی فہرستوں میں ڈھونڈی گئی تو

معلوم ہُوا کہ کوئی دُوسرا نسخہ اس کا موجود نہیں۔ اسکوریال کے کتب خانے میں زیادہ تر وہی کتابیں ہیں جو سترھویں صدی میں سلطان مراکش کے دو جہازوں کی لُوٹ سے اسپین کے ہاتھ آئی تھیں۔ چونکہ اس زمانے میں اسلامی ذخیروں کو تباہ کرنے کی مسیحی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ چکی تھیں اس لیے انھیں ضائع نہیں کیا گیا اور اسکوریال کی خانقاہ میں رکھ دی گئیں۔ یقیناً یہ نسخہ بھی اسی لُوٹ میں آ گیا ہوگا۔ پچھلے دنوں جامعہ مصریہ کے ادارے نے اس کا عکس حاصل کیا اور ڈاکٹر منصور اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی تصحیح و ترتیب کے بعد چھپ کر شائع ہو گیا۔ دونوں نے اس پر الگ الگ مقدمے بھی لکھے ہیں۔ بظاہر اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ یہ رسالہ بھی نقد الشعر کے مصنف ہی کے قلم سے نکلا ہے۔ رسالے کے اسلوبِ بیان میں منطقی طریقِ بحث و تحلیل صاف نمایاں ہے جو آگے چل کر فنِّ بلاغت پر بالکل چھا گیا لیکن اصولِ فن خالص عربی ہیں اور امثال و نظائر میں بھی باہر کے اثرات کی کوئی پرچھائیں دکھائی نہیں دیتی۔ البتہ بلاغت کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے یونان اور ہندوستان کے بعض اقوال جاحظ کے حوالے سے نقل کر دیئے ہیں اور وہ سب نے نقل کئے ہیں۔

لیکن عربوں نے جو تغافل یونانی ادبیات سے برتا تھا وہ اس کے فنِ موسیقی سے برت نہیں سکتے تھے کیونکہ خود عربوں کا فنِّ موسیقی کچھ نہ تھا اور جتنی کچھ عمارت بھی انھوں نے اٹھائی تھی اس کا تمام تر مواد ایران کی ساسانی موسیقی کے کھنڈروں سے حاصل کیا گیا تھا:

نولئے باربد ماندست و دستاں!

چنانچہ کافی تصریحات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یونان کے فنِ موسیقی پر عربی میں کتابیں لکھی گئیں اور ریاضی کی ایک شاخ کی حیثیت سے اس کا عام طور پر مطالعہ کیا گیا۔ یونانیوں نے آسمان کے بارہ فرضی بُرجوں کی مناسبت سے راگنیوں کی بارہ بنیادی تقسیمیں کی تھیں اور ہر راگنی کو کسی ایک بُرج کی طرف منسوب کر دیا تھا۔ عربوں

نے بھی اسی بنیاد پر عمارت اُٹھائی۔ یونان اور روم کے آلات میں سے قانون اور ارغنون (آرگن) عام طور پر رائج ہو گئے تھے۔ ابو نصر فارابی نے قانون پر ایک مستقل رسالہ بھی لکھا ہے۔ اخوان الصفا کے مصنفوں کو بھی موسیقی سے اعتناء کرنا پڑا۔

سندھ کے نو آباد عرب ہندوستان کی موسیقی سے، جو ان اطراف میں رائج ہوگی، ضرور آشنا ہوئے ہوں گے لیکن تاریخ میں سندھ کے عربی عہد کے حالات اتنے کم ملتے ہیں کہ جزم کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ چھٹی صدی ہجری سے شمالی ہند اور دکن کے نئے اسلامی دوروں کا جو سلسلہ شروع ہوا ان سے ہم مسلمانوں کے ذوق اور اشتغال کے نتائج بآسانی نکال لے سکتے ہیں۔ اب ہندوستان کے علوم و فنون مسلمانوں کے لیے غیر ملکی نہیں رہے تھے بلکہ خود ان کے گھر کی دولت بن گئے تھے اس لیے ممکن نہ تھا کہ ہندوستانی موسیقی کے علم و ذوق سے وہ تغافل برتتے۔ چنانچہ ساتویں صدی میں امیر خسرو جیسے مجتہدِ فن کا پیدا ہونا اس حقیقتِ حال کا واضح ثبوت ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اب ہندوستانی موسیقی ہندوستانی مسلمانوں کی موسیقی بن چکی تھی اور فارسی موسیقی غیر ملکی موسیقی سمجھی جانے لگی تھی۔ ساز گری، ایمن اور خیال تو امیر خسرو کی ایسی مجتہدانہ اختراعات ہیں کہ جب تک ہندوستانیوں کی آواز میں رس اور تار کے زخموں میں نغمہ ہے دنیا اُن کا نام نہیں بھول سکتی۔ مثنوی قران السعدین میں خود کہتے ہیں:

زمزمۂ ساز گری، در عراق

کردہ بہ گلبانگ عراق اتفاق!

قول، ترانہ، سوہلہ تو گانے کی ایسی عام چیزیں بن گئی ہیں کہ ہر گویّے کی زبان پر ہیں حالانکہ یہ سب اسی عہد کی اختراعات ہیں، کلاسیکی موسیقی ان سے آشنا نہ تھی۔

غالباً مسلمان بادشاہوں سے بھی پہلے مسلمان صوفیوں نے اس کی سرپرستی شروع کر دی تھی۔ ملتان، اجودھن، گور اور دہلی کی خانقاہوں میں وقت کے بڑے بڑے باکمال حاضر ہوتے تھے اور برکت و قبولیت کے لیے اپنا اپنا جوہرِ کمال پیش کرتے

ہے جہاں تک سلاطینِ ہند کا تعلق ہے۔ خلجی اور تغلق کے درباروں میں ہندوستانی موسیقی کی مقبولیت اور قدرسانیوں کے واقعات تاریخ میں موجود ہیں لیکن جس شاہی خاندان نے ہندوستانی موسیقی سے بہ حیثیت ایک فن کے خاص اعتنا کیا وہ غالباً جونپور کا شرقی خاندان تھا چنانچہ اسی عہد میں خیال عام طور پر مقبول ہوا اور دھرپد کی جگہ اس سے اہلِ فن اعتنا کرنے لگے۔ اسی عہد کے لگ بھگ دکن کے بہمنی اور نظام شاہی خاندانوں کا اور پھر بیجاپوری بادشاہوں کا شوق و ذوق نمایاں ہوتا ہے چونکہ اُس زمانے میں دکن اور مالوہ کی سرزمین موسیقی کے علم و عمل کا تخت گاہ بن گئی تھی اس لیے یہ قدرتی بات تھی کہ مسلمان بادشاہوں کی سرپرستی اُسے حاصل ہو جاتی۔ ابراہیم عادل شاہ تو بقول ظہوری کے اس اقلیم کا جگت گورو تھا اور اُس کے شوقِ موسیقی نے بیجاپور کے گھر گھر میں وجد و سماع کا چراغ روشن کر دیا تھا ظہوری اس کی مدح میں کیا خوب کہہ گیا ہے؛

"مروت کردہ شب ہا بر تو سیر بام و در لازم
نمی باشد چراغے خانہ ہائے بے نوایاں را"

مالوا، بنگال اور گجرات کے بادشاہوں کے ذاتی اشتغال و ذوق کے واقعات تاریخ میں بکثرت ملتے ہیں۔ گور کے سلاطین ملکی زبان اور ملکی موسیقی، دونوں کے سرپرست تھے چنانچہ بنگالی زبان کی قدیم شاعری نے تمام تر انہی کی سرپرستی میں نشو و نما پائی۔ مالوا کے باز بہادر کو تو روپ متی کے عشق نے ہندی کا شاعر بھی بنا دیا تھا اور موسیقی کا ماہر بھی آج تک مالوہ کے گھروں سے اُس کے دوہوں کی نوائیں سُنی جا سکتی ہیں۔

اکبر کی قدر شناسیوں سے اس فن کو جو عروج ملا اُس کا حال عام طور پر معلوم ہے۔ ابوالفضل نے اُن تمام باکمالوں کا ذکر کیا ہے جو فتح پور اور آگرہ میں جمع ہو گئے تھے اور ان میں بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی۔ جہانگیر نے اپنی تو زک میں جا بجا ایسے اشارے کیے ہیں جن سے اُس کے ذاتی ذوق اور اشتغال کا ثبوت ملتا ہے۔ اُس کی حُسن پرست طبیعت کا لازمی تقاضا یہی تھا کہ فنونِ لطیفہ کا قدر شناس ہو، چنانچہ شاعری مصوری

اور موسیقی، تینوں کا دلدادہ اور اعلیٰ درجے کا کمال شناس تھا۔ اُس کے دربار میں جس درجے کے شاعر، مصوّر اور گویے جمع ہو گئے تھے پھر ہندوستان کی تاریخ میں جمع ہونے والے نہ تھے۔ اس کے دربار کے ایک مصوّر نے ڈان بتھ کے سفیر کو اپنا کمال دکھا کر حیران کر دیا تھا۔ اُس کے شاعرانہ ذوق کے لیے اُس کا یہ ایک شعر کفایت کرتا ہے :

ازمن متاب رُخ کہ نیم بے تو یک نفس
یک دل شکستن تو بصد خوں برابر ست

اسی عہد میں یہ بات ہوئی کہ موسیقی کا فن بھی فنونِ دانشمندی میں داخل ہو گیا اور اس کی تحصیل کے بغیر تحصیلِ علم اور تکمیلِ تہذیب کا معاملہ ناقص سمجھا جانے لگا۔ امراء و شرفاء کی اولاد کی تعلیم و تربیت کے لیے جس طرح تمام فنونِ مدارس کی تحصیل کا اہتمام کیا جاتا تھا اسی طرح موسیقی کی تحصیل کا بھی اہتمام کیا جاتا۔ ملک کے ہر حصے سے باکمالانِ فن کی مانگ آتی تھی اور دہلی، آگرہ، لاہور اور احمد آباد کے گویے بڑی بڑی تنخواہوں پر امراء اور شرفاء کے گھروں میں ملازم رکھے جاتے تھے جو نوجوان تکمیلِ علم کے لیے بڑے شہروں میں آتے وہ وہاں کے عالموں اور مدرسوں کے ساتھ وہاں کے باکمالانِ موسیقی کو بھی ڈھونڈتے اور پھر اُن کے حلقۂ تعلیم میں زانوئے تحصیل تہ کرتے دکن میں احمد نگر بیجاپور اور برہان پور کے اہلِ فن مشہور تھے۔ دوآبے میں دہلی اور آگرہ کے اور پنجاب میں لاہور، سیالکوٹ اور جھنگ کے۔

اُس عہد میں ایران اور توران سے جو افاضل و اشراف آتے۔ وہ ہندوستانی موسیقی کے فہم و مناسبت کی ضرورت فوراً محسوس کر لیتے تھے اور چند سال بھی گزرنے نہیں پاتے کہ اُس کے مقام شناس بن جاتے تھے۔ محمد قاسم فرشتہ صاحب تاریخ کا باپ مازندران سے آ کر احمد نگر میں مقیم ہوا تھا اور فرشتہ کی ولادت مازندران کی تھی لیکن اُسے ہندوستانی موسیقی سے اس قدر شغف ہُوا کہ اس موضوع پر ایک پوری کتاب تصنیف کر دی، یہ کتاب میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ علامہ الملک توفی جو جلوس شاہجہانی

کے ساتویں سال ہندوستان آیا اور فاضل خاں کے خطاب سے مخاطب ہُوا اور پھر اورنگ زیب کے عہد میں عہدۂ وزارت پر فائز ہُوا۔ ہندوستانی موسیقی کا ایسا ماہر سمجھا جاتا تھا کہ وقت کے اساتذہ اس سے استفاضہ کرتے تھے۔

اس عہد کے کتنے ہی مقدس علماء ہیں جن کے حالات پڑھیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ گو موسیقی کے اشتغال سے دامن بچائے رہے لیکن فن کے ماہر اور نکتہ شناس تھے۔ ملّا مبارک کے حالات میں خصوصیت کے ساتھ اس کی تصریح ملتی ہے کہ ہندوستانی موسیقی کا عالم و ماہر تھا۔ اکبر نے اسے تان سین کا گانا سنایا تو صرف اتنی داد ملی کہ "ہاں گا لیتا ہے"۔

ملّا عبدالقادر بدایونی جیسا متشرع اور متصلّب شخص بھی بین بجانے میں پوری مہارت رکھتا تھا اور فیضی نے ضروری سمجھا تھا کہ اکبر کی خدمت میں اس کی سفارش کرتے ہوئے اس مشاقی کا ذکر کرے۔ علامہ سعداللہ شاہجہانی، جن کی فضیلتِ علمی اور ثقاہتِ طبع کا عام معاصر اعتراف کرتے ہیں، موسیقی اور سنگیت کی ہر شاخ پر نظر رکھتے تھے اور ماہرانہ رائے دے سکتے تھے۔ اُن کے اُستاد ملّا عبدالسلام لاہوری تھے۔ ان کے حلقۂ درس کی عالمگیریوں نے سمرقند اور بخارا تک کو مسخّر کر لیا تھا اور جب شاہجہان نے شہزادوں کی تعلیم کے لیے تمام علماءِ مملکت پر نظر ڈالی تھی تو نظرِ انتخاب نے انہی کی سفارش کی لیکن اُن کے ذوقِ موسیقی کا یہ حال تھا کہ جس طرح ہدایہ اور بزودی کے مقامات حل کیا کرتے تھے اسی طرح موسیقی کی مشکلات بھی حل کر دیا کرتے تھے۔ شیخ معالی خاں، جو ملا طاہر پٹنی محدّث گجرات کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور قاضی القضاۃ شیخ عبدالوہاب گجراتی کے پوتے تھے اُن کے حالات میں صاحبِ مآثر الامراء نے لکھا ہے کہ موسیقی کے شیفتہ اور اس کی باریکیوں کے دقیقہ سنج تھے۔ ملّا شفیعا یزدی مخاطب بہ دانشمند خاں کہ سرآمد علماءِ عصر تھا اور شاہ جہان کے دربار میں اُس کا مباحثہ ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی سے معلوم و مشہور ہے ہندوستان آتے ہی ہندوستانی موسیقی میں ایسا باخبر ہو گیا کہ وقت کے باکمالانِ فن کو اس کے فضل و کمال کا اعتراف کرنا پڑا۔ حکیم برنیر فرانسادی صاحب سفرنامہ ہندایسی

دانشمند خاں کی سرکار میں ملازم تھا اور غالباً اسی کی صحبت کا یہ نتیجہ تھا کہ حکماءِ فرنگ کا اسے ہم مشرب لکھا گیا ہے۔

شیخ علاؤ الدین، جو اپنے عہد کے مشہور صوفی گزرے ہیں اور جن کی ایک غزل سماع کی مجلسوں میں بکثرت گائی جاتی ہے:

نہ دانم آں گلِ رعنا چہ رنگ و بو دارد | کہ مرغ ہر چمنے گفتگوئے او دارد
نشاطِ بادہ پرستاں بہ منتہیٰ نرسید | ہنوز ساقیِ ما بادہ در سبو دارد

ان کے حالات میں سب لکھتے ہیں کہ ہندوستانی موسیقی کے ماہر اور آلاتِ موسیقی کے غیر معمولی مشاق تھے۔

شیخ جمالی صاحب سیر الاولیا اور ان کے لڑکے شیخ گدائی، دونوں کا فنِ موسیقی میں توغل معلوم ہوتا ہے۔ دورِ آخر میں مرزا مظہر جانجاناں اور خواجہ میر درد فنِ موسیقی کے ایسے ماہر تھے کہ وقت کے بڑے بڑے کلاونت اپنی چیزیں بغرضِ اصلاح پیش کرتے اور ان کے سر کی ایک ہلکی سی جنبش کو بھی اپنے کمالِ فن کی سند تصور کرتے۔

شیخ عبدالواحد بلگرامی شیر شاہی عہد کے ایک عالی قدر بزرگ تھے سلوک و تصوف میں ان کی کتاب سنابل مشہور ہو چکی ہے۔ بدایونی ان کے حالات میں لکھتے ہیں کہ ہندی موسیقی میں نقش آرائیاں کرتے تھے اور وجد و حال کی مجلسیں ان سے گرم ہوتی تھیں۔

بیرم خاں موسیقیِ ہند کا بڑا قدر شناس تھا اور اس کے لڑکے عبدالرحیم خانخاناں کی قدر شناسیاں تو اس درجے تک پہنچ گئی تھیں کہ اکبر اور جہانگیر کی شاہانہ فیاضیاں بھی اُن کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ عبدالباقی نہاوندی نے مآثرِ رحیمی کے خاتمے میں جہاں اُن علماء و شعراء کا ذکر کیا ہے جو خانخاناں کی سرکار سے وابستہ تھے وہاں موسیقی کے باکمالوں کے نام بھی گنوائے ہیں۔ ان میں ایرانی اور ہندوستانی، ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ شاہنواز خاں صفوی کے حالات میں صاحبِ مآثر الامراء نے لکھا ہے کہ "شیفتۂ موسیقی بود و خوانندہ ہا و سازندہ ہا کہ پیشِ خود جمع کردہ بود نظیر نہ داشتند" قریب قریب

یہی الفاظ ہوں گے۔ حافظے سے لکھ رہا ہوں اور کتاب دیکھے ہوئے سالہا سال گزر گئے
زین خاں کوکہ کا علوم درسیہ میں شغف معلوم ہے۔ پنجاب کی صوبیداری کے زمانے
میں بھی اُس نے درس و تدریس علوم کا مشغلہ بالالتزام جاری رکھا تھا لیکن اس کے حالات
میں بھی سب لکھتے ہیں کہ "بہ کبت وراگ شغفے داشت سازہا بہ کمال حسن و خوبی می نواخت"
اس کا لڑکا مغل خاں بھی اس باب میں اپنے باپ کا جانشین تھا۔ خانِ کلاں میر محمد،
جو شمس الدین انگہ کا بھائی تھا۔ موسیقی ہند کے علم و مہارت میں ممتاز سمجھا جاتا تھا،
مرزا غازی خاں بن جانی بیگ حاکم سندھ و قندھار کی نسبت لکھتے ہیں، کہ
نغمہ پردازی، طنبور نوازی اور تمام سازوں کے بجانے میں بے نظیر تھا۔ ملّا مرشد
یزدجردی نے اُس کی مدح میں یہ رباعی کہی تھی:

گر نغمۂ سازت بہ سکوں می آید
رگہاے ست بگومیت کہ چوں می آید
ازبسکہ بہ گردِ زخمہ ات می گردد
پیچیدہ ز طنبور بروں می آید

خان زمان میر خلیل نے، جو یمین الدولہ آصف خاں کا داماد تھا، اس فن میں
ایسی مہارت بہم پہنچائی تھی کہ لوگ اپنے اختلافات اس کے آگے فیصلے کے لیے
پیش کرتے۔ سرس بائی، جو شہزادہ مراد بخش کی محبوبہ تھی، خیال گانے میں اپنا جواب
نہیں رکھتی تھی مگر خود شہزادے کی فن دانی کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ وہ اس کی شاگردی پر
ناز کرتی۔ اورنگ زیب نے جب مراد کو قید کیا تو سرس بائی بھی تیار ہو گئی کہ اس
کے ساتھ قید و بند کی سختیاں گوارا کرے چنانچہ مراد کے ساتھ قلعہ گوالیار میں آخر
تک محبوس رہی۔

مرزا عیسیٰ خاں ترخان، جس نے جانی بیگ کی وفات کے بعد سندھ میں بڑی
شورش برپا کی تھی، نغمہ سنجی اور ساز نوازی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔

اب اس وقت حافظے کی گرہیں کھلنے لگی ہیں تو بے شمار واقعات سامنے آرہے ہیں۔ شہزادہ خرّم کی ماں مان متی، جو راجہ اودے سنگھ کی بیٹی تھی جب جہانگیر کے محل میں آئی تو اُس کے گانے کا محل میں شہرہ ہُوا۔ جہانگیر چُونکہ خود ماہرِ فن تھا اس لیئے اُس نے امتحان لیا اور جب دیکھا کہ امتحان میں پوری اُتری تو بہت خوش ہُوا اور خوش آواز خواصوں کا ایک حلقہ اس کے سپرد کر دیا کہ اپنی تعلیم و تربیت سے انھیں تیار کرے۔ خود خرّم یعنی شاہ جہان کے ذوق و مناسبتِ فن کا یہ حال تھا کہ تان سین کا جانشین لال خاں اس کا نام لے کر کان پکڑتا تھا۔ دھرپد میں شاہ جہان کے رسوخِ ذوق کا مورخوں نے خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

نظام الملک آصف جاہ کے لڑکے ناصر جنگ شہید کو موسیقی کے شوق نے سنسکرت زبان کی تحصیل کا شوق دلایا کہ کلاسیکل موسیقی کی قدیم کتابوں کا براہِ راست مطالعہ کر سکے۔ اس کے حالات میں صاحبِ شہادت نامہ لکھتے ہیں کہ زبانِ سنسکرت سے واقف اور موسیقی اور سنگیت میں ماہر تھا۔

اُس عہد میں ایک ایک امیر کی فیاضیاں ترقیِ فن کے لیئے شاہانہ فیاضیوں سے کم نہیں ہوتی تھیں۔ شیخ سلیم چشتی کا پوتا اسلام خاں جب جہانگیر کے عہد میں بنگال کا صوبے دار ہُوا تو اس کی سرکار میں اسّی ہزار روپیہ ماہوار راگ اور رقص کے طائفوں پر خرچ کیا جاتا تھا۔ صاحبِ مآثر الامراء لکھتے ہیں کہ اس کے دستر خوان پر ایک ہزار لنگریاں[1] کمال تکلف و اہتمام سے دونوں وقت چُنی جاتی تھیں مگر خود اس کا یہ حال تھا کہ جوار کی روٹی اور ساٹھی کا خشکہ ساگ کے ساتھ کھاتا تھا اور کسی دوسرے کھانے میں ہاتھ نہ ڈالتا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ وہ عمر بھر جامۂ خاصہ کے نیچے گاڑھے کا کرتا

---

[1] لنگری، لکڑی کی روغن کی ہوئی سینی کو کہتے ہیں جو لکڑی کے طشت کی طرح بہت بڑی ہوتی تھی اور مستقم کو سفند بریاں اس میں رکھا جا سکتا تھا۔

پہنتا رہا اور پگڑی کے نیچے بھی گاڑھے کی طاقیہ[1] اوڑھتا۔

اورنگ زیب کے فقیہانہ تقشف سے اگرچہ فنونِ لطیفہ کی گرم بازاری سرد پڑ گئی مگر جو کچھ ہوا صرف دربارِ شاہی تک محدود تھا۔ پچھلی آب پاشیوں نے ملک کے ہر گوشے میں جو نہریں رواں کر دی تھیں وہ اتنی تنک مایہ نہ تھیں کہ شاہی سرپرستی کا رُخ پھرتے ہی خشک ہونا شروع ہو جاتیں۔ بلاشبہہ عالمگیری عہد میں شاہی سرکار کے کارخانے بند ہو گئے تھے لیکن ملک کے ہزاروں لاکھوں گھروں کے کارخانے کون بند کر سکتا تھا؟ میں نے اس مکتوب کی ابتدا میں فارسی کی کتاب راگ درپن کا ذکر کیا ہے یہ کتاب فقیر اللہ سیف خاں نے مرتب کی تھی جو اسی عالمگیری عہد کا ایک امیر اور ناصر علی سرہندی کا ممدوح تھا۔ شیر خاں لودھی صاحب مراۃ الخیال بھی اسی عہد میں تھا جس نے ایرانی موسیقی اور ہندوستانی موسیقی دونوں میں دستگاہ پیدا کی اور پھر دونوں پہ ایک مبسوط کتاب لکھی۔ تذکرہ مراۃ الخیال میں بھی ایک فصل موسیقی پر لکھی ہے۔ اور اپنے ذوقِ فن کا ذکر کیا ہے۔ موسیقی پر اس کی کتاب میری نظر سے گزر چکی ہے۔ اس کا ایک خوشخط نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے۔

اس سلسلے میں خود اورنگ زیب کی زندگی کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے؛

برہان پور کے حوالی میں ایک بستی زین آباد کے نام سے بس گئی تھی۔ اسی زین آباد کے رہنے والی ایک مغنیہ تھی جو زین آبادی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اُس کے نغمہ و حُسن کی تیر افگنیوں نے اورنگ زیب کو زمانۂ شہزادگی میں زخمی کیا۔ صاحب مآثر الامراء نے اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کیا خوب شعر لکھا ہے:

عجب گیرندہ دامے بود در عاشق رُبائی ہا
نگاہِ آشنائے یار پیش از آشنائی ہا!

---

[1] طاقیہ، ہلکی ٹوپی کو کہتے تھے جو گھر میں سر پر رکھ لیتے۔ آج کل بھی عرب میں اس ٹوپی کو طاقیہ ہی کہتے ہیں

اورنگ زیب کے اس معاشقے کی داستان بڑی ہی دلچسپ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اولوالعزمیوں کی طلب نے اسے لوہے اور پتھر کا بنا دیا تھا لیکن ایک زمانے میں گوشت پوست کا آدمی بھی رہ چکا تھا اور کہہ سکتا تھا کہ

گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی

ابھی تھوڑی دیر ہوئی۔ ہم یمین الدولہ کے داماد میر خلیل خان زمان کا تذکرہ کر رہے تھے۔ اس خان زمان کی بیوی اورنگ زیب کی خالہ ہوتی تھی۔ ایک دن اورنگ زیب برہان پور کے باغ آہو خانہ میں چہل قدمی کر رہا تھا اور خان زمان کی بیوی یعنی اُس کی خالہ بھی اپنی خواصوں کے ساتھ سیر کے لیے آئی ہوئی تھی۔ خواصوں میں ایک خواص زین آبادی تھی جو نغمہ سنجی میں سحر کار اور شیوۂ دلربائی و رعنائی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ سیر و تفریح کرتے ہوئے یہ پورا مجمع ایک درخت کے سائے میں سے گزرا جس کی شاخوں میں آم لٹک رہے تھے۔ جونہی مجمع درخت کے نیچے پہنچا، زین آبادی نے نہ تو شہزادے کی موجودگی کا کچھ پاس لحاظ کیا نہ اُس کی خالہ کا، بے باکانہ اُچھلی اور ایک شاخِ بلند سے ایک پھل توڑ لیا۔ خان زمان کی بیوی پر یہ شوخی گراں گزری اور اُس نے ملامت کی تو زین آبادی نے ایک غلط اندازِ نظر شہزادے پہ ڈالی اور پشواز سنبھالتے ہوئے آگے نکل گئی۔ یہ ایک غلط انداز نظر کچھ ایسی قیامت کی تھی کہ اُس نے شہزادے کا کام تمام کر دیا اور صبر و قرار نے خدا حافظ کہا:

بالا بلند عشوہ گرِ سرو نازِ من
کوتاہ کرد قصۂ زہدِ درازِ من

صاحب ماثر الامراء نے لکھا ہے کہ "بکمالِ ابرام و سماجت زین آبادی را از خالۂ محترمہ خود گرفتہ، باآں ہمہ زہدِ خشک و تقشفِ بحت، شیفتہ و دلدادۂ او شد۔

قدح شراب بدستِ خود پُر کردہ می داد۔ گویند روزے زین آبادی ہم قدح بادہ پُر کردہ بہ دست شہزادہ داد و تکلیفِ شرب نمود۔" یعنی بڑی منت والحاح کرکے اپنی خالہ سے زین آبادی کو حاصل کیا اور باوجود اُس زُہدِ خشک اور خالص تقشف کے جس کے لیے اُس عہد میں بھی مشہور ہو چکا تھا، اُس کے عشق و شیفتگی میں اس درجہ بے قابو ہو گیا کہ اپنے ہاتھ سے شراب کا پیالہ بھر بھر کر پیش کرتا اور عالمِ نشہ و سرور کی رعنائیاں دیکھتا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن زین آبادی نے اپنے ہاتھ سے جام لبریز کرکے اورنگ زیب کو دیا اور اصرار کیا کہ لبوں سے لگا لے۔ دیکھیے، عرفی کا ایک شعر کیا موقع سے یاد آگیا ہے اور کیا چسپاں ہوا ہے:

ساقی تو ئی و سادہ دلی بیں کہ شیخ شہر
باور نمی کند کہ ملک مے گسار شد

شہزادے نے ہر چند عجز و نیاز کے ساتھ التجائیں کیں کہ میرے عشق و دلباختگی کا امتحان اس جام کے پینے پر موقوف نہ رکھو:

مے حاجت نیست مستیم را
در چشمِ تو تا خمار باقیست

لیکن اُس عیار کو رحم نہ آیا:

ہنوز ایمان و دل بسیار غارت کردنی دارد
مسلمانی میاموز آں دو چشمِ نامسلماں را!

ناچار شہزادے نے ارادہ کیا کہ پیالہ مُنہ سے لگالے گویا ولقد ھمّت بہ وھمّ بھا کی پوری روداد پیش آئی:

عشقش خبر ز عالمِ مدہوشی آورد
اہلِ صلاح را بقدح نوشی آورد

لیکن جونہی اُس فسوں ساز نے دیکھا کہ شہزادہ بے بس ہو کر پینے کے لیے آمادہ

ہو گیا ہے۔ فوراً پیالہ اُس کے لبوں سے کھینچ لیا اور کہا: "غرض امتحانِ عشق بود نہ کہ تلخ کامیٔ شما"

ایں جورِ دیگر ست کہ آزارِ عاشقاں
چنداں نمی کنند کہ بہ آزار خُو کنند

رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ شاہجہان تک خبریں پہنچنے لگیں اور وقائع نویسوں کے فردوں میں بھی اُس کی تفصیلات آنے لگیں۔ داراشکوہ نے اس حکایت کو اپنی سعایت و غمازی کا دست مایہ بنایا۔ وہ باپ کو بار بار توجہ دلاتا "ببینید ایں مزوّرِ ریائی چہ صلاح و تقویٰ ساختہ است؟" فیضیؔ نے کیا خوب کہا ہے:

چہ دست مے بری اے تیغِ عشق اگر داد ست
بہ رزبانِ ملامت گر زلیخا را!

نہیں معلوم، اس قضیئے کا غنچہ کیونکر گل کرتا لیکن قضا و قدر نے خود ہی فیصلہ کر دیا یعنی عین عروجِ شباب میں زین آبادی کا انتقال ہو گیا۔ اورنگ آباد بڑے تالاب کے کنارے اس کا مقبرہ آج تک موجود ہے:

خود رفتہ ایم و کنجِ مزارے گرفتہ ایم
تا بارِ دوشِ کس نہ شود استخوانِ ما!

آپ نے عاقل خاں رازی کے حال میں یہ واقعہ پڑھا ہو گا کہ زمانۂ شہزادگی میں اورنگ زیب کو ایک پرستارِ خاص کی موت سے سخت صدمہ پہنچا تھا لیکن اُسی دن شکار کے اہتمام کا حکم دیا گیا۔ اس بات پر وابستگانِ دولت کو تعجب ہُوا کہ سوگواری کی حالت میں سیر و تفریح اور شکار کا کیا موقع تھا جب اورنگ زیب شکار کے لیے محل سے نکلا تو عاقل خاں نے کہ میر عسکر تھا، تنہائی کا موقع نکال کر عرض کیا، اس غم و اندوہ کی حالت میں شکار کے لیئے نکلنا کسی ایسی ہی مصلحت پر مبنی ہو گا جس تک ہم ظاہر بینوں کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔ اورنگ زیب نے

جواب میں یہ شعر پڑھا:

نالہ ہائے خانگی دل را تسلّی بخش نیست
در بیاباں می تواں فریاد خاطر خواہ کرد

اس پر عاقل خاں کی زبان سے بے ساختہ یہ شعر نکل گیا:

عشق چہ آساں نمود، آہ چہ دشوار بود
ہجر چہ دشوار بود، یار چہ آساں گرفت

اورنگ زیب پر رقّت کا عالم طاری ہو گیا۔ دریافت کیا کہ یہ شعر کس کا ہے؟ عاقل خاں نے کہا، اُس شخص کا ہے۔ جو نہیں چاہتا کہ اپنے آپ کو زمرۂ شعرا میں محسوب کرائے۔ اورنگ زیب سمجھ گیا کہ خود عاقل خاں کا ہے۔ بہت تعریف کی اور اُس دن سے اُس کی سرپرستی اپنے ذمّے لے لی۔ اس حکایت میں جس پرستارِ خاص کی موت کا ذکر آیا ہے اُس سے مقصود یہی زین آبادی ہے۔

صاحب ماثر الامرا نے خان زماں کے حال میں لکھا ہے کہ فنِ موسیقی میں پوری مہارت رکھتا تھا اور کاروبارِ منصب کے انہماک کے ساتھ راگ رنگ کی مشغولیتیں بھی برابر جاری رہتی تھیں۔ پری چہرگانِ خوش آواز اور مغنیاتِ عشوہ طراز اس کی سرکار میں ہمیشہ جمع رہتی تھیں۔ انھی میں زین آبادی بھی تھی جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کی مدخولہ تھی۔

خود اورنگ زیب بھی موسیقی کے فن سے بے خبر نہ تھا کیونکہ تمام شہزادوں کی طرح اُس نے بھی اس کی تحصیل کی ہو گی۔ البتہ آگے چل کر اس کی طبیعت کی افتاد نے دوسری راہ اختیار کی۔ اس لیے اس کے اشتغال و ذوق سے کنارہ کش ہو گیا اور سلطنت پر قبضہ پانے کے بعد تو سرے سے یہ کارخانہ ہی بند کر دیا۔ گویّوں نے موسیقی کا جنازہ نکالا تو اس نے کہا، اس طرح دفن کرنا کہ پھر قبر سے نہ اُٹھ سکے۔

لیکن اورنگ زیب کے سارے منصوبوں کی طرح سلطنت کا یہ پرہیزی مزاج بھی

زیادہ دنوں تک نہ چل سکا اور اُس کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو گیا جس طرح انگلستان میں پیوریٹین Puritan عہد کی خشک مزاجیاں اعادۂ حال کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھیں۔ اسی طرح یہاں بھی اورنگ زیب کی آنکھ بند ہوتے ہی سلطنت کا مزاج پھر لوٹ آیا۔ فرخ سیر اور محمد شاہ کے عہد کی تر دماغیاں در اصل اسی عالمگیری خشک مزاجیوں کا ردِ عمل تھا۔ سید عبدالجلیل محدث بلگرامی نے فرخ سیر کی شادی کی تبریک میں جو مثنوی لکھی ہے اُس سے اس عہد کی عشرت مزاجیوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کے قدماء فن نے موسیقی اور رقص کی ایک خاص قسم ایسی قرار دی ہے جس کی نسبت اُن کا خیال تھا کہ صحرائی جانوروں کو بے خود کر کے رام کرنے میں خصوصیت کے ساتھ مؤثر ہے۔ اکبر کے زمانے میں رقص اور گانے کی یہ قسم شکار قمرغہ کے سر و سامان میں داخل ہوئی اور اُس کے طائفے بابا لالِ غنی کی نگرانی میں تیار کرائے گئے۔ آنند رام مخلص نے مراۃ المصطلحات میں اس طریقِ شکار کی بعض دلچسپ تفصیلات لکھی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ جب شکارِ قمرغہ کا اہتمام کیا جاتا تھا تو یہ طائفے شکار گاہ میں بھیج دیئے جاتے اور رقص و سرود شروع کر دیتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد آہستہ آہستہ چاروں طرف سے ہرن سر نکالنے لگتے اور پھر رقص و سرود کی محویت انھیں بالکل طائفے کے قریب پہنچا دیتی۔ جہانگیر نے ایک مرتبہ شکارِ قمرغہ کا قصد کیا اور اسی رقص و سرود کا جال بچھایا۔ جب ہرنوں کے غول ہر طرف سے نکل کر سامنے اکھٹے ہوئے تو نورجہاں کی زبان پر بے اختیار امیر خسرو کا یہ شعر طاری ہو گیا:

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف

بہ اُمید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

یہ شعر سن کر جہانگیر کی غیرت مردمی نے گوارا نہ کیا کہ شکار کے لیے ہاتھ اٹھائے دل گرفتہ واپس آ گیا۔

یہ خیال کہ جانور گلسنے سے متاثر ہوتے ہیں، دُنیا کی تمام قوموں کی قدیمی روایتوں میں پایا جاتا ہے۔ توریت میں ہے کہ حضرت داؤد کی نغمہ سرائی پرندوں کو بے خود کر دیتی تھی۔ یونانی روایات میں بھی ایک سے زیادہ اشخاص کی نسبت ایسا ہی عقیدہ ظاہر کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے قدماءِ فن نے تو اسے ایک مسلّمہ حقیقت مان کر اپنی بے شمار تعلیمات کی بنیادیں اسی عقیدے پر استوار کی تھیں۔ سانپ، گھوڑے اور اُونٹ کا تاثر عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ حدی کی لَے اگر رُک جاتی ہے تو محمل کی تیز رفتاری بھی رُک جاتی ہے:

حُدی را تیز تر میخواں چو محمل را گراں بینی

البیرونی نے کتاب الہند میں راگ کے ذریعے شکار کرنے کے طریقوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ خود اپنا مشاہدہ نقل کرتا ہے کہ شکاری نے ہرن کو ہاتھ سے پکڑ لیا تھا اور ہرن میں بھاگنے کی قوت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ ہندوؤں کا یہ قول بھی نقل کرتا ہے کہ اگر ایک شخص اس کام میں پوری طرح ماہر ہو تو اسے ہاتھ بڑھا کر پکڑنے کی بھی ضرورت پیش نہ آئے۔ وہ صید کو جس طرف لے جانا چاہے، صرف اپنے راگ کے زور سے لے جائے۔ پھر لکھتا ہے، جانوروں کی اس محویّت و تسخیر کو عوام تعویذ اور گنڈے کا اثر سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ محض گلسنے کی تاثیر ہے۔ پھر ایک دوسرے مقام میں، جہاں جزیرہ سرندیپ کا ذکر کیا ہے، لکھتا ہے یہاں بندر بہت ہیں۔ ہندوؤں میں مشہور ہے کہ اگر کوئی مسافر اُن کے غول میں پھنس جائے اور رامائن کے وہ اشعار، جو ہنومان کی مدح میں لکھے گئے ہیں پڑھنے لگے تو بندر اُس کے مطیع ہو جائیں گے اور کچھ نقصان نہیں پہنچے گا۔ پھر کہتا ہے کہ اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس کی تہ میں بھی وہی گانے کی تاثیر کام کرتی ہو گی یعنی رامائن کے اشعار کے مطالب کا یہ اثر نہ ہو گا۔ اشعار کی لَے اور نغمہ سرائی کی تاثیر ہو گی۔ پہلی تصریح غالباً اس باب میں ہے جو "فی ذکر علوم لھم کاسرۃ الاجنحۃ علی افق الجہل" کے عنوان سے ہے اور دوسری تصریح اس کے

بعد کے باب میں ملے گی جو "فی معارف شتی من بلاء ھم وانہار ھم" کے عنوان سے لکھا ہے۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ زمانۂ حال کا علم الحیوان اس خیال کی واقعیت تسلیم نہیں کرتا اور تاثرات کے مشاہدات کو دوسری علتوں پر محمول کرتا ہے۔ سانپ کے بارے میں تو کہا جاتا ہے کہ اس میں سرے سے سماعت کا خاصہ ہی نہیں ہے۔

والہ داغستانی صاحب ریاض الشعراء، قزلباش خاں امید، میر معز فطرت موسوی، مؤتمن الدولہ اسحاق خاں شوستری، یہ سب تازہ ولایت ایرانی تھے لیکن ہندوستان کی صحبتوں سے آشنا ہوتے ہی اُنھوں نے محسوس کیا کہ موسیقیِ ہند سے واقفیت کیے بغیر اپنی دانش و شائستگی کی مسند نہیں سنبھال سکتے۔ اس لیے اس کی تحصیل ناگزیر ہے۔ قزلباش خاں امید کی مجالسِ طرب کا حال قاضی محمد خاں اختر نے اپنے مکاتیب میں لکھا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس فن میں کس درجہ دستگاہ اسے حاصل ہو گئی تھی۔ شیخ علی حزیں ایرانی موسیقی سے پوری طرح باخبر تھے لیکن ہندوستان میں اُنھوں نے ہندوستانی موسیقی کی بھی تحصیل کی۔ پٹنہ کے قیام کے زمانے میں اُن کا یہ دستور تھا کہ ہفتے کے دو دن موسیقی کی صحبت کے لیے مخصوص کر دیے تھے۔ شہر کے باکمال حاضر ہوتے اور فن کی باریکیوں کے نمونے پیش کرتے۔

اودھ کی نوابی کے دَور میں تفضل حسین خاں علامہ کے علم و فضل کی بڑی شہرت ہوئی۔ شوستری صاحب تحفۃ العالم کلکتہ میں ان سے ملا تھا۔ جب وہ اودھ کی سفارت کے منصب پر مامور تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ تمام علومِ عقلیہ کے ساتھ موسیقی میں بھی درجۂ اجتہاد رکھتے ہیں اور شوق و ذوق کا یہ حال ہے کہ جب تک ساز پر راگ چھیڑا نہیں جاتا اُن کی آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوتیں۔ ایک ماہرِ فن سازندہ صرف اس کام کے لیے ملازم ہے کہ شب کو خواب گاہ میں خواب آور گت چھیڑ دیا کرے۔

لکھنؤ کے علماء فرنگی محل میں سے بحر العلوم کی نسبت اُن کے بعض معاصروں نے

لکھا ہے کہ فنِ موسیقی میں اُن کا رُسوخ عام طور پر مُسلّم تھا۔

البتہ یہ ظاہر ہے کہ قوموں کے عروج و ترقی کے زمانے میں اشتغال تحسینِ فکر اور تہذیبِ طبع کا باعث ہوتا ہے۔ وہی دورِ تنزّل میں فکر کے لیے آفت اور طبیعت کے لیے ہلاکت بن جاتا ہے۔ ایک ہی چیز حُسنِ استعمال اور اعتدالِ عمل سے فضل و کمال کا زیور ہوتی ہے، اور سوءِ استعمال اور افراط و تفریطِ عمل سے بداخلاقی اور بدعملی کا دھبا بن جاتی ہے۔ موسیقی کا ایک شوق تو اکبر کو تھا کہ اپنی یلغاروں کے بعد جب کمر کھولتا تو مجلسِ سماع و نشاط سے اُن کی تھکن مٹاتا، اور پھر ایک شوق محمد شاہ رنگیلے کو تھا کہ جب تک محل کی عورتیں اسے دھکیل دھکیل کر پردے سے باہر نہ کر دیتیں، دیوان خانے میں قدم نہیں رکھتا۔ صفدر جنگ جب دیوان کی مہمات سے تھک جاتا تو موسیقی کے باکمالوں کو باریاب کرتا۔ اسی کی نسل میں واجد علی شاہ کا یہ حال تھا کہ جب طبلہ بجاتے بجاتے تھک جاتا تو تازہ دم ہونے کے لیے اپنے وزیر علی نقی کو باریابی کا موقع دیتا۔ موسیقی کا شوق دونوں کو تھا مگر دونوں کی حالتوں میں جو فرق تھا وہ محتاجِ بیان نہیں:

سارت مشرّقۃ وسرت مغرّبا

شتّان بین مشرّق و مغرّب!

اس بات کی عام طور پر شہرت ہو گئی ہے کہ اسلام کا دینی مزاج فنونِ لطیفہ کے خلاف ہے، اور موسیقی محرّماتِ شرعیہ میں داخل ہے، حالانکہ اس کی اصلیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ فقہا نے سدِّ وسائل کے خیال سے اس بارے میں تشدّد کیا اور یہ تشدّد بھی بابِ قضاء سے تھا، نہ کہ بابِ تشریع سے۔ قضا کا میدان نہایت وسیع ہے۔ ہر چیز، جو سوءِ استعمال سے کسی مفسد کا وسیلہ بن جائے، قضاءً روکی جا سکتی ہے لیکن اس سے تشریع کا حکم اصلی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا۔ قل من حرّم زینۃ اللّٰہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق؟ لیکن یہ بحث میں یہاں نہیں چھیڑتا۔

چاہتا ہوں۔ یہاں جس زاویۂ نگاہ سے معاملے پر نظر ڈالی جا رہی ہے وہ دوسرا ہے:

مومن آئینِ محبت میں کہ سب کچھ ہے روا
حسرتِ حرمتِ صہبا و مزامیر نہ کھینچ!

دیکھیے بات کیا کہنی چاہتا تھا اور کہاں سے کہاں جا پڑا؟ اب لکھنے کے بعد صفحوں پر نمبر لگائے تو معلوم ہوا کہ فلسکیپ کے چھبیس صفحے سیاہ ہو چکے ہیں۔ بہرحال اب قلم روکتا ہوں:

حرفِ نامنظور دل یک حرف ہم بیش ست و بس
معنیِ دل خواہ گر صد نسخہ باشد، ہم کم ست!

ابوالکلام

(محمد اقبال عباسی خوش نویس، لاہور)

رہن پریس لمیٹڈ، لاھور